ایک آوارہ کی خاطر.....

بشریٰ رحمٰن

ایک آوارہ کی خاطر . . . .

جو کجھ روزِ ازل تھیں ہوئی
لِکھی قلم نہ میٹے کوئی
دُکھاں سولاں دتی ڈھوئی
بُلّھا ! شوہ نوں آکھو کھوئی
جِس نوں رو رہی !

(بلھے شاہؒ)

بنّو بدنام ہو گئی۔

اور بدنام بھی اس بدباطن، بدمعاش، بدفعل خبیث زلفی کے ساتھ کہ خاندان میں جس کا نام لے کر لوگ لاحول پڑھنے لگتے تھے۔ کوئی ایسا بُرا فعل نہیں تھا جو اس کے ساتھ وابستہ نہ کیا گیا ہو ـــــ اور کوئی معیوب بات ایسی نہ تھی جو اس کے بارے میں سُنی نہ گئی ہو۔

کنواریاں تو اس کے سائے سے ہی دُور بھاگتی تھیں۔ مبادا ان کے اُجلے دامن پر چھینٹے پڑ جائیں اور بیاہیاں اُسے ایک بَد دعا سمجھتی تھیں۔ بڑی بوڑھیوں کے پاس اس کے لئے صرف پھٹکار رہ گئی تھی۔

غضب خدا کا ایسے آدمی کے ساتھ بنّو بدنام ہو گئی۔

سارا محلّہ تھو تھو کرتا، اور سو سو نام دھرتا۔ بھلا ایسے آوارہ آدمی کو گھر میں رکھنے سے مطلب۔؟ جبکہ گھر میں ایک نوجوان اور تنہا لڑکی ہر وقت موجود رہے۔ لوگ کہتے کہ ان دونوں بوڑھیوں کا دماغ سٹھیا گیا ہے۔ حالانکہ اس عمر میں عورتیں دانائی کا مظاہرہ کرتی ہیں مگر یہ دونوں مل کر کتنی فاش غلطی کر بیٹھی تھیں۔

محلّے کی عورتوں کو ان سب باتوں کا علم تھا، جنہیں امّاں بی اور پھوپھی امّاں کے فرشتے بھی نہ جانتے تھے۔ بنّو کب زلفی کے کمرے میں جاتی ہے کب آتی ہے رات

کو ان کی ملاقات کے اوقات کیا ہیں ـــــ ؟

زلفی ہر روز بنو کے لئے کیا تحفہ لے کر آتا ہے ـــ؟

اور دن بہ دن بنو کی شکل وصورت میں بھی فرق آتا جاتا ہے۔

خالہ امینہ نے تو یہاں تک کہہ دیا ـــ کہ ـــ میں نے خود اس کو فیملی پلاننگ کی گولیاں خریدتے دیکھا ہے۔

"ہائے میں مرگئی" زینب چچی نے سینے پر دو ہتڑ مارا۔

"کب ـــ کس دن ـــ ؟"

"اے کیا پوچھتی ہو بہن۔ ایک دن میں کیپٹل میڈیکل سٹور، میں گئی تھی وہاں جو دیکھا تو بی بنو۔ دوپٹے سے بے پرواہ سینہ اکڑائے کھڑی ہے اور اس کے ہاتھ میں انہی گولیوں کے پیکٹ تھے۔ خوب غور سے ان کو دیکھ رہی تھی، اور کاغذ پر لکھی ہوئی ہدایات پڑھ رہی تھی۔ مجھے جو دیکھا تو ایک دم بوکھلا گئی۔ پیکٹ اس کے ہاتھ سے گر گئے اور جلدی سے شوکیس چھوڑ کر میرے قریب آگئی اور بولی۔ خالہ کیا حال ہے؟ ـــــ کیسی ہیں ـــ ؟

"اے امینہ! پھر تو نے آگے ہو کر وہ پیکٹ اٹھا لینے تھے ـــ" زینب نے کہا۔

"ہاں میرا بھی یہی ارادہ تھا۔ مگر وہ چھنال اس طرح میرے آگے آ کر کھڑی ہو گئی جیسے کوئی راستہ بند کرتا ہے۔ اتنے میں دوکاندار نے پیکٹ وہاں سے اٹھا لئے۔"

"اے تم نے صاف صاف اسی سے پوچھا ہوتا۔"

"پوچھا تھا بھئی۔ میں کوئی کچا کام کرنے والی نہیں ہوں۔ بولی ـــ "اماں بی کے دانت میں درد ہے ـــ تو گولیاں لینے آئی تھی۔" یہ کہا اور سٹک سے بھاگ گئی۔ تو بہ مجھے تو اسی دن شک ہو گیا تھا کہ لڑکی کے لچھن اچھے نہیں ہیں، ہر کسی کی جوان بیٹی کے بارے میں افواہیں اڑانے کو تو میں گناہ سمجھتی ہوں۔ آج آپ لوگوں نے بات کی ـــــ تو میں نے بھی یہ راز کھول ہی دیا ـــ"

"توبہ ـــ اللہ تباہ کرے ان فیملی پلاننگ والوں کو" دادی فاطمہ نے تخت پر

بیٹھے بیٹھے آسمان کی طرف ہاتھ اٹھائے۔ "انہوں نے بچے کیا بند کرنے تھے بلکہ اور بدمعاشی کو شہ دی ہے۔ اب تو بچہ بچہ جان گیا ہے کہ گناہ کو کس طرح چھپایا جا سکتا ہے۔"

"لے دادی اماں ـــــ اس میں فیملی پلاننگ والوں کا بھلا کیا قصور ہے؟ خالہ سلیمہ، جو دور بیٹھی سلائیاں بن رہی تھیں۔ بولیں۔

"واہ ان کا قصور کیوں نہیں ہے۔ گھر گھر میں ڈھنڈورا پیٹتے پھرتے ہیں کہ یہ کرو تو بچہ نہیں ہوتا ـــ کچی عمر کے بچے بھی سنتے ہیں سب۔ پہلے زمانے میں لڑکی کو ایک ہی ڈر تو ہوتا تھا کہ اگر بچہ پڑ گیا تو رسوائی ہو گی۔ ان موئے لوگوں نے یہ راستہ بھی بند کر دیا ہے۔"

"بس رہنے بھی دیں دادی جان" فوزیہ سیڑھیاں اتر کر نیچے آگئی۔ "جن لوگوں نے ٹھیک رہنا ہو۔ وہ گندگی میں بھی صاف ستھرے رہتے ہیں۔ آج کل تو جاہل عورتیں وہ وہ گل کھلا رہی ہیں کہ اگر تعلیمیافتہ سنیں تو ان کے ہوش گم ہو جائیں۔"

"زمانے کو دیکھو بی بی۔ زمانے کو دیکھو" آسیہ خالی ہاتھ نچاتی... آجاتیں۔

"اپنی پیٹ کی جائی ماں کو عقل سکھاتی ہے۔ کون سی بات اب اس زمانے میں ڈھکی چھپی رہ گئی ہے۔ جو کسر تھی وہ اس موئے ٹی وی نے پوری کر دی ہے بے حیائی کے وہ منظر جو ہم نے شادی کی بیس سالہ زندگی میں نہ دیکھے تھے۔ گھر بیٹھے بٹھائے یہ دکھا رہے ہیں۔ شادی کے بعد کیا ہوتا ہے بچہ کیسے جنتے ہیں ـــ رنڈیاں کوٹھے سجا کر کیسے بیٹھتی ہیں؟ جوان لڑکی کو ورغلانے کے گر کیا ہوتے ہیں۔ سب بچے جوان بوڑھے ٹی وی پر روز دیکھتے ہیں۔ کس کس بات کو روئیں گی آپ۔ ؟"

"خدا کی قسم خالہ، میرا پانچسالہ بیٹا عاصم ایک دن مجھ سے پوچھ رہا تھا۔ امی طوائف کون ہوتی ہے" کوثر بھی ان کی محفل میں شریک ہو گئی۔

"لو اور سنو! خالہ نے سینے پر دو ہتڑ مارا۔" پھر تو نے کیا جواب دیا"

"پہلے تو میں سٹپٹا گئی کہ اس نے یہ سب سنا کہاں سے، پھر جو پوچھا تو

اس نے بتایا۔ رات ٹی وی میں جو ڈرامہ ہو رہا تھا اس میں ایک عورت کو سب طوائف کہہ رہے تھے۔ امّی کیا طوائف عورت نہیں ہوتی۔ پھر اس کو سب بُرا کیوں کہتے ہیں۔؟ ایسے عجیب و غریب سوال پوچھ رہا تھا کہ مجھے تو سمجھ ہی نہیں آئی، کیا جواب دوں۔؟ "آخر کچھ تو کہا ہوگا تو نے بچے کی تسلی کی خاطر ــــ؟"

"لو اور سنو ــــ میں نے کیا کہنا تھا۔ جب اس نے بہت ضد کی تو میں نے کس کے اُس کے منہ پر تھپڑ مارا۔ اور کہا رات کو تیرا باپ آئے گا اس سے پوچھ لینا ــــ"

سب عورتیں بے تحاشا ہنسنے لگیں۔

دادی فاطمہ کا گھر ان کا چوپال تھا۔ سب اِدھر اُدھر سے آکر اکٹھی ہو جاتیں اور دوپہر کے وقت یہاں محفل جما کرتی۔ آج کل زیادہ تر بنّو ہی سب کے لئے موضوع سخن بن گئی تھی۔ بات کو اِدھر اُدھر جاتے دیکھ کر ــــ چچی زینب پھر بنّو کی طرف پلٹ آئی اور بولی "اے بہن بس اس بنّو کی کیا بات کرتی ہو۔ اس کا تو مجھے بچپن سے ہی علم تھا کہ کوئی گل کھلائے گی۔ گھر گھر گھومنے اور مردوں کی گودی میں چڑھنے کی اسے بچپن سے عادت تھی۔"

"بھئی ہم نے آنکھوں سے تو نہیں دیکھا۔ شریفاں بتا رہی تھی کہ جب بھی ان کے گھر برتن دھونے جاتی ہوں ــــ بنّو ادھر زلفی کے کمرے میں ملتی ہے۔"

"بھئی جاوید کے ابّا کہہ رہے تھے کہ میں ایک رات آماں بی کے بیٹے کا پیغام دینے گیا تھا۔ آدھی رات کا وقت ہوگا ــــ چھت پر سے کوئی جھانک رہا تھا۔ نظر اٹھا کر دیکھا تو بنّو تھی۔ لو اور سنو، بنّو آدھی رات کے وقت زلفی کے کمرے میں کیا کرنے گئی تھی ــــ لعنت ہے ایسی اولاد پر ــــ"

"نہیں جی ــــ میں تو اس میں گھر والوں کا قصور سمجھتی ہوں ــــ لڑکی کو اتنی ڈھیل نہیں دینی چاہیئے کہ وہ حد سے گزر جائے ــــ جوانی تو پھر دیوانی ہوتی ہے ــــ"

"ارے تم نے آج کل بنّو کو دیکھا ــــ کیسا بھدّا جسم ہو رہا ہے اس کا۔ کنواری لڑکیوں والی تو اس میں کوئی بات ہی نہیں رہی ــــ"

"توبہ میں تو ان کے گھر کا پانی نہ پیوں ــــ حرام کھا رہے ہیں سب لوگ"ــــ

اب بنّو بیچاری کو کیا معلوم تھا کہ اتنی سی بات کا بتنگڑ بن جائے گا۔ آماں بی کی داڑھ میں سخت درد ہو رہا تھا۔ انہوں نے بنّو سے کہا۔ بیٹی بھاگ کر جا اور میرے لئے ایک اسپرین کی ٹکیا لے آ۔ میڈیکل سٹور قریب ہی تھا۔ بنّو نے سر پر چادر اوڑھی اور نکل گئی۔ چادر اوڑھنے کے ساتھ دوپٹے کی ضرورت بالکل نہیں رہتی۔ جس شوکیس کے پاس بنّو کھڑی اسپرین کی ٹکیوں کا پتہ گن رہی تھی اس کے اندر فیملی پلاننگ کی سب چیزیں بھی سجی تھیں۔ شاید اس غریب کے فرشتوں کو بھی علم نہ ہو کہ نیچے شوکیس میں کیا کچھ پڑا ہے۔ مگر زینب چچی کی نگاہ نے تو افسانہ بنا ہی لیا۔

اس رات بھی کوئی نو ہی بجے ہوں گے۔ زلفی عام طور پر رات کے گیارہ بارہ بجے آیا کرتا تھا، انہوں نے چھت پر اپنی تمام رضائیاں اور گدّے ڈالے تھے سکھانے کے لئے ایک گدّا اوپر ہی رہ گیا تھا اور آماں نے بنّو سے کہا تھا "جا میری لاڈلی بھاگ کر لے آ ــــ ابھی زلفی نہیں آیا ــــ جب وہ گدّا اتار کر لے جا رہی تھی تو دروازے پر بہت زور کی دستک ہوئی ــــ اس نے اوپر سے ہی سر نکال کر دیکھ لیا تاکہ آماں بی کو بتا سکے کہ نیچے کون آیا ہے۔ سردیوں کی راتیں یوں بھی جلدی اُتر آتی ہیں۔ نو بجے کو انہوں نے آدھی رات بنا لیا۔

اور یہ بنّو بی کی بدنصیبی کا آغاز تھا کہ رائی کا پربت گھر گھر بننے لگا ــــ بات ہونٹوں سے نکلی تو حویلی حویلی چل نکلی۔

بنّو کا اصلی نام ارجمند بانو تھا۔ مگر ماں پیار سے بانو بانو پکارا کرتی اور پھر بانو سے بگڑ کر بنّو بن گیا۔ سب سے چھوٹی اولاد ہونے کی وجہ سے وہ اماں کی لاڈلی بھی بہت تھی۔ پچھلے سال بنّو نے بی اے کا امتحان اچھے نمبروں میں پاس کر لیا تو اماں نے اُسے گھر بٹھا لیا۔ سر پہ باپ کا سایہ نہیں تھا۔ بڑے بچّوں کی شادیاں ہو چکی تھیں۔ اماں میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ بنّو کو ایم اے کرواتیں۔ ویسے ایم اے کرنے کا بنّو کو ہر لڑکی کی طرح بہت شوق تھا۔ اور کیسے کیسے خواب یونیورسٹی کے اس نے دیکھ رکھے تھے۔ اس نے پھوپھی اماں کے آگے منت سماجت بھی کی — مگر پھوپھی اماں تو خود بن بیاہی بوڑھی ہو گئی تھیں۔ وہ عورتوں کی روشن خیالی اور اعلیٰ تعلیم کی سخت مخالف تھیں اور انہیں لڑکیوں کا لڑکوں کے ساتھ پڑھنا تو ایک آنکھ نہ بھاتا تھا — یوں چاہے لڑکی میٹرک کر کے بیٹھ جاتے اور پھر محلّے کے لڑکوں کے ساتھ آنکھ مٹکا شروع کر دے۔ مگر وہ ان اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے والی لڑکیوں کے کردار کو مشکوک نظروں سے دیکھتی تھیں۔

بنّو اپنے تمام دلائل دبراہین سمیت ہار گئی تھی تو چپ چاپ گھر بیٹھ گئی تھی — صبیحہ آپا تو اس کے ہوش سے پہلے کی بیاہی ہوئی تھیں۔ وجیہہ بجیا بھی سسرال سدھاریں۔ پھر اس کا دل ریاض بھیّا کے ننھے منے بچوں سے بہلا کرتا تھا۔ وہ بھی اپنے بال بچوں کو لے کر دُبئی چلے گئے۔

اب گھر خالی ڈھنڈار پڑا تھا — اماں بی کو بنّو کا فکر تھا کہ کہیں اس کے بھی ہاتھ پیلے کر دیں۔ مگر کوئی ڈھنگ کا رشتہ ہی نہ ملتا تھا اور رشتہ بھی وہ ایسا چاہتیں جو انہیں تیاری کے لئے کم از کم ایک سال تو دے — یوں ایک سال سے وہ گھر بیٹھی تھی تو کیا خاک تیاری کر لی تھی۔ انہوں نے — ریاض بھیّا ہر ماہ صرف پانچسو روپے بھیجا کرتے۔ گو کھانے والے صرف تین افراد تھے مگر بچیاں ... سسرال والی تھیں۔ داماد گھر آتے تھے۔ گھر کی پوزیشن تو دہی رکھنا تھی۔ بچتا ہی کیا تھا کہ وہ بنّو کے لئے جہیز بنانا شروع کر دیتیں۔ پھر بھی اماں بی اور پھوپھی اماں چین سے کب بیٹھنے والی تھیں۔ کسی نہ کسی ادھیڑبن میں لگی رہتیں۔ کبھی کوئی غرارے آئیں۔ کبھی سوٹ کا کپڑا خرید لیا۔ کبھی دوپٹے کو جال لگانے بیٹھ گئیں۔ مگر مجال ہے جو وہ بنّو کو دخل اندازی کی اجازت دیں۔ جانے اس زمانے میں وہ اسے سترھویں صدی کی لڑکی کیوں سمجھ رہی تھیں۔ ادھر باورچی خانے کا کام بھی دونوں مل کر کیا کرتیں۔ کام ہی کتنا تھا۔ جھٹ ہو جاتا۔ پھر بچاری بنو کیا کرتی۔ لمبے لمبے دن اور کالی کالی راتوں میں اسے کام نہ سوجھتا۔ اس نے رسالے اور ناول پڑھنا شروع کر دیئے۔ محلّے میں لائبریری تھی۔ دس پیسے فی کتاب سے روز ایک کتاب مل جاتی تھی۔ ایک دن اماں بی نے اس کے سرہانے ایک رسالہ دیکھ لیا۔ جس میں فلم ایکٹرسوں کی ننگی ٹنگی تصویریں تھیں۔ رانیں۔ کولھے۔ پیٹ — ناف — جانے کیا کیا — اوئی اللہ — نگوڑی ماری تبھی صبح کو دیر سے اٹھتی ہے اور اللہ رسول کا نام بھول چکی ہے۔ انہوں نے سارے رسالے نکال کر چولہے میں ڈال دیئے اور کتابیں اُٹھا کر گلی میں پھینک دیں۔ بس اسی روز سے اس کے پڑھنے پہ بھی مارشل لاء لگ گیا — ہائے اللہ میں مر جاؤں —

بنّو کا دل چاہتا اس اتنے بڑے چوبارے کی دیواروں سے ٹکریں مار مار کر سر لہولہان کر لے۔ پورے گھر میں ہنسنے بولنے والا — یا دل کی بات سننے والا کوئی نہ تھا۔ پھر اماں نے غضب یہ کیا کہ اپنے ایک دُور دراز کے بھانجے کو اُدھر والا چوبارہ کرائے پر دے دیا۔ ایک تو انہیں ہمسائیگی مل گئی اور دوسرے رقم بھی کافی — کیونکہ

ذوالفقار میاں نے ایک سال کا کرایہ اُنہیں ایڈوانس دے دیا تھا۔

زلفی میاں اپنے خاندان کے ٹھکرائے ہوئے تھے ـــــ وہ رشتوں ناطوں سے باغی ہو چکے تھے۔ ماں، باپ تک ان سے نہیں ملتے تھے ـــــ ایک انشورنس کمپنی میں بہت اچھی تنخواہ پر ملازم تھے۔ مگر ساری تنخواہ رنگ رلیوں پر صرف کر دیتے تھے۔ ان کی تبدیلی جب راولپنڈی میں ہو گئی تو مکان ملنا مشکل ہو گیا۔ مکان کا بھی وہ ایک پورشن ہی لینا چاہتے تھے۔ بالآخر انہیں آماں بی سے رابطہ قائم کرنا پڑا۔ شہر کے اندر آماں کا خاصا بڑا مکان تھا ـــــ اور اوپر کا حصّہ جو انہوں نے بیٹے اور بہو کے لئے بنوایا تھا، آج کل خالی پڑا تھا۔

آماں بی اور پھوپھی اماں نے خفیہ کانفرنس کی کہ ایسے لونڈے کو گھر میں جگہ دی جائے یا نہیں جس کی ہوا خراب ہے۔ لیکن اتنی رقم جو یکمشت مل رہی تھی، زلفی نے بھی سوچ سمجھ کر پتہ پھینکا تھا۔ اس نے خود ہی مکان دیکھ کر کہہ دیا تھا۔

"خالہ بی! میرے لئے یہ مکان بہت اچھا ہے۔ میں زیادہ تر ٹورز میں رہتا ہوں۔ رات کو بھی دیر سے گھر آتا ہوں۔ آ کر سو جایا کروں گا۔ اگر آپ کو تکلیف نہ ہو تو صرف ایک وقت کا کھانا مجھے دے دیا کریں اور کرایہ وکھانا ملا کر میں آپ کو ایک ہزار روپیہ ہر مہینے دے دیا کروں گا ـــــ بلکہ ایک سال کا تو ایڈوانس دے دوں گا۔"

پھر اس نے بارہ ہزار کے نوٹ نکال کے آماں بی کے آگے رکھ دیئے۔ پورے بارہ ہزار ـــــ

اماں بی نے گنے تو دل دھک دھک کرنے لگا۔

جب سے خانصاحب فوت ہوئے تھے۔ انہوں نے اتنی رقم اکٹھی نہ دیکھی تھی اور اس رقم سے تو بنّو کے لئے ایک اچھا خاصا طلائی سیٹ بن سکتا تھا۔

آماں بی انکار نہ کر سکیں۔ رقم اٹھالی اور زلفی اپنا سامان لے آیا۔

اوپر والا حصّہ آباد ہو گیا اور آماں بی رقم کو بغل میں دبا کر سُنار کے پاس چل دیں ـــــ اخراجات کا کیا ہے ـــــ نکل ہی آتے ہیں۔ کہیں اتنی بڑی رقم کسی اور مَد میں نہ خرچ ہو جائے۔ انہوں نے یہ رقم اپنے پُرانے سنار کے حوالے کی اور

بنّو کے لئے ایک خوبصورت طلائی سیٹ اور چھ چوڑی کا آرڈر دے دیا۔ اس خیال سے کہ سیٹ بن جائے، جو کمی بیشی ہو گی وہ بعد میں پوری کر دیں گی۔

بنو نے سُن رکھا تھا کہ زلفی بھیّا شادی شدہ ہیں۔ مگر اتنے دن گزر گئے تھے۔ ان کا سارا سامان آ گیا تھا۔ وہ خود بھی رات گئے آ کر سو جاتے تھے۔ نہ بچوں کی آوازیں آئیں، نہ بیوی کی آہٹ۔

کافی دن تک تو وہ دل ہی دل میں اُن کے بیوی بچوں کا انتظار کرتی رہی۔ جب دو تین مہینے گزر گئے تو ایک دن آماں بی سے پوچھ بیٹھی۔

"اللہ، اماں بی یہ زلفی کے بیوی بچے کیوں نہیں آتے ـــــ؟"

بس جی! اتنا پوچھنا تھا کہ آماں نے بے بھاؤ کی سنانی شروع کر دیں۔ اسے بالکل سمجھ نہیں آئی کہ یہ ساری مرمت کس سلسلے میں ہو رہی ہے مگر آماں نے اسے تنبیہہ کر دی۔ کہ وہ آئندہ زلفی بھیّا کے معاملے میں دخل نہ دے اور نہ اُن کے بارے میں کوئی سوال پوچھے اور نہ کبھی ان کے کمرے میں قدم ہی رکھے ـــــ

یہ تو بلکہ تجسس کو ہوا دینے والی بات تھی ـــــ

یا اللہ یہ کیا مصیبتیں ہیں ـــــ اس سے تو اچھا ہے کہ جلد سے جلد شادی ہو جائے۔ یعنی سب بلاؤں کی ایک بلا نازل ہو جائے ـــــ ان بڈھی روحوں کی بے اثر نصیحتوں سے جان تو چھوٹے ـــــ اتنی نصیحتوں اور بندشوں سے تو اچھا ہے کہ ایک دن صاف صاف کہہ دیں کہ لڑکیو! تم پیدا ہونا بند کر دو۔ اگر پیدا ہو جاتی ہو تو جوان ہوتے ہی مر جاؤ۔

ـــــ ہاں ـــــ وہ دل ہی دل میں کڑھا کرتی ـــــ

پھر ایک دن اس کی ایک کزن اس کے گھر آ گئی جس سے اُسے زلفی بھیّا کے متعلق بہت سی معلومات حاصل ہو گئیں۔

یہ کہ ـــــ زلفی بھیا اپنی ایک کلاس فیلو سے عشق کرتے تھے مگر اُن کی امّی نے زبردستی ان کی شادی اپنی بھانجی سے کر دی۔ بھانجی خاصی تیز مزاج تھی اس لئے دونوں کی تُو تُو مَیں مَیں ہونے لگی۔ دو سال میں ایک دن بھی نجمہ زلفی کے ہاں خوش نہیں رہی اور

نہ ہی زلفی نے اسے خوش رکھنے کی کوشش کی۔ ان کی امّی کا خیال تھا۔ زلفی ان سے انتقام لینے کی خاطر ان کی بھانجی کو تکلیفیں دیتا ہے۔ بالآخر یہ گاڑی زیادہ دن نہ چل سکی ـــــ اور دونوں کی طلاق ہوگئی۔ تب سے والدین نے زلفی سے ناطہ توڑ لیا ہے۔ اس کے بعد انہوں نے اپنی محبوبہ سے شادی کر لی تھی ـــــ اس میں سے ایک بچی بھی ہوئی ـــــ مگر ـــــ بس یہی سننے میں آیا تھا کہ ان کی اپنی محبوبہ سے بھی نہیں بنی ـــــ وہ بھی ان کو چھوڑ کر چلی گئی ـــــ کیونکہ امیر ماں باپ کی بیٹی تھی یا شاید طلاق ہوگئی ـــــ وہ کچھ وثوق سے نہ بتا سکی۔

"اچھا یہ بات ہے ـــــ" بنّو نے آنکھیں پھیلا کر کہا۔

"میرا خیال ہے زلفی بھیا کے طور طریقے کچھ اچھے نہیں۔ یہ تب سے آوارگی کی زندگی بسر کر رہے ہیں، لوگ تو کہتے ہیں اپنی محبوبہ کا غم بھلانے کے لئے انہوں نے شراب شروع کر دی ہے ـــــ مگر ہیں بڑے فلرٹ ـــــ بس کچھ نہ پوچھو ـــــ یہ اس قابل نہیں کہ ان سے بات کی جائے ـــــ" "اچھا ـــــ؟"

"کہیں تم نہ ان کے منہ لگ جانا ـــــ"

"ہائے میں ـــــ کیوں ـــــ؟" بس کنواریوں کے تو ازلی دشمن ہیں۔" "سچ ـــــ؟"

"ہاں ـــــ خاندان میں کوئی ان سے ملنا پسند نہیں کرتا۔ پیسہ کافی ہے ان کے پاس ـــــ اچھی خاصی تنخواہ ہے ـــــ ایک موٹر ہے ـــــ مگر ساری تنخواہ بازاری عورتوں اور شراب پر خرچ کر دیتے ہیں ـــــ جانے خالہ جی نے انہیں یہاں کیسے رکھ لیا ہے ـــــ؟" وہ نفرت سے بولی۔

"وہ بھئی ان کو رہنے کو ٹھکانہ جو نہیں مل رہا تھا ـــــ؟" بنّو نے بات بنائی حالانکہ اُسے پتہ تھا ـــــ آماں بی کو پورے چھ ہزار روپے نے مجبور کر دیا تھا۔

"اچھا بھئی میں چلتی ہوں ـــــ" اتنی معلومات دے کر اس کی کزن تو چلتی بنی اور اسے اتنے عجیب و غریب، آوارہ منش ـــــ رنڈوا اور بدمعاش آدمی کو قریب سے دیکھنے کا شوق چرایا۔ جس طرح چڑیا گھر میں کوئی نیا جانور آتا ہے تو سب ہی پنجرے کے قریب

جا کر غور سے اسے دیکھنا چاہتے ہیں۔ مگر اس کا پنجرہ تو ایسا تھا کہ جس پر دو پہرے دار نیاں بیٹھی تھیں۔ عجیب بات ہے ابھی تک ۔ ۔ ۔ ۔ آماں بی اور پھوپھی آماں نے بنّو کو زلفی کا سامنا نہیں کرنے دیا تھا۔ ویسے بھی وہ صبح سات بجے بغیر چائے پیئے چلا جاتا ـــــ اور رات کو گیارہ یا بارہ بجے آتا ـــــ اگر گیارہ بجے آجاتا تو وہیں باورچی خانے میں رکھا کھانا کھا لیتا ورنہ اوپر سیڑھیاں چڑھ جاتا۔ باہر کے دروازے کی چابی آماں نے اس کو دے دی تھی۔ ادھر کی سیڑھیاں ڈیوڑھی میں اترتی تھیں اس لئے انہیں اس کے آنے جانے میں کوئی تکلیف نہیں ہوتی تھی۔ کبھی کبھی وہ اس کی ایک مہذب سی السلام علیکم سنا کرتی ـــــ اور بس ـــــ شرابیوں کی آواز ایسی تو نہیں ہوتی ـــــ وہ دل میں سوچتی اس نے تو ٹی دی میں ـــــ اور کبھی کبھار فلموں میں شرابی اور بدچلن لوگ دیکھے تھے، مکروہ چہروں والے ـــــ بھدّے نقش و نگار والے۔ لڑکھڑاتی چالوں والے ـــــ فحش زبان والے ـــــ آداب و لحاظ سے بے نیاز ـــــ پھکّڑ قسم کے ـــــ اسی لئے تو وہ زلفی بھیّا کو ذرا قریب سے دیکھنا چاہتی تھی۔ ویسے اتنے قریب سے بھی نہیں دیکھنا چاہتی تھی کہ وہ اسے پکڑ لیں یا اُن کے منہ سے شراب کی بُو آنے لگے۔

توبہ توبہ ـــــ ایسے آدمی کوئی بھروسے کے قابل ہوتے ہیں؟ ـــــ

مگر انہیں دیکھنے کا اشتیاق دن بہ دن بڑھتا جا رہا تھا۔ اتوار کے روز بھی تو یہ آدمی گھر پر نہیں ہوتا تھا ـــــ یا تو صبح صبح بن ٹھن کر چل دیتے ـــــ یا پھر کمرے کی کنڈی لگا کر اندر بیٹھے جانے کیا کرتے رہتے۔

ہائے ضرور شراب پیتے رہتے ہوں گے ـــــ وہ دل میں سوچتی۔ ذرا دیکھنا چاہیے کہ وہ کیسے شراب پیتے ہیں ـــــ اور شراب کیسی ہوتی ہے ـــــ؟

اس روز اتوار تھی ـــ زلفی بھائی صبح سے ہی گھر سے نکل گئے تھے ـــ اماں کو معلوم تھا کہ وہ رات سے پہلے نہ آئیں گے ـــ اس لئے وہ دوپہر کے کھانے سے فارغ ہو کر پڑوسن کے ہاں چلی گئیں ـــ پھوپھی اماں اندر ظہر کی نماز پڑھ رہی تھیں اور وہ باہر نل پر بیٹھی دوپہر کے جھوٹے برتن دھو رہی تھی ـــ جب ڈیوڑھی میں قدموں کی بھاری آہٹ ہوئی ـــ اس نے مڑ کر دیکھا ـــ

وہ گھڑی بھر کے لئے صحن میں آئے ـــ اِدھر اُدھر دیکھا کوئی نظر نہیں آیا تو دھپ دھپ اوپر سیڑھیاں چڑھ گئے۔

اچھا تو یہ تھے زلفی بھائی ـــ واہ کیا شاندار آدمی ہیں ـــ بنّو حیرت زدہ بیٹھی رہ گئی۔ بہت دیدہ زیب سوٹ پہن رکھا تھا ـــ قرینے سے بال بنے ہوئے تھے۔ چہرے سے نفاست اور شرافت برس رہی تھی ـــ نگاہوں میں بھی کوئی . . . بدمعاشی کے آثار نہیں تھے ـــ شاید کسی کو ڈھونڈھ رہے تھے اور بنّو تو انہیں نظر ہی نہیں آئی ـــ اتنے ڈھیر سارے برتن لے کر دھونے بیٹھی تھی ـــ ہاں سمجھ لیا ہوگا کہ کام کرنے والی مائی ہے۔ تبھی اس طرف توجہ نہیں دی ـــ کمینے کہیں کے ـــ اس نے دل ہی دل میں انہیں گالی دی۔ جیسے میں تو اس گھر میں رہتی ہی نہیں۔

سیڑھیوں پر سے پھر دھپ دھپ کی آواز آئی۔

وہ نیچے آ رہے تھے ـــ ہاتھ میں بریف کیس تھا۔ اب کے انہوں نے اِدھر اُدھر نہیں دیکھا۔ سیڑھیوں سے اُتر کر زور سے اتنا کہا "خالہ جان! میں ٹور پر جا رہا ہوں ـــ پرسوں آؤں گا ـــ" اور باہر چلے گئے ـــ

اُن کا خیال تھا۔ گھر میں کوئی نہ کوئی ضرور سن لے گا اور نہیں تو برتن دھونے والی مائی ہی ان کو بتا دے گی ـــ

کمینے ـــ اُلّو کے پٹھے ـــ بدمعاش ـــ اس نے دل ہی دل میں اور گالیاں دیں ـــ میں انہیں نظر ہی نہیں آئی۔

توبہ کپڑے بھی تو آج کس قدر میلے ہیں ـــ اس نے گھٹنوں پر سے اپنی شلوار دیکھی۔ پھر بھری بالٹی میں اپنا چہرہ دیکھا۔

بنّو بی ـــ تو کچھ ایسی حسین بھی نہیں ہے ـــ کہ ایک آدمی کی خواہ مخواہ تجھ پر نظر پڑ جائے ـــ کوئی تو چاند کا ٹکڑا تو نہیں ہے ـــ پری پیکر نہیں ہے۔ کالا دوپٹہ سر پر باندھے تو بالکل جمعدارنی لگ رہی ہے۔

"دھت تیرے کی ـــ" اس نے فرش پر مار کے برچ توڑ دی "تو میں کونسا اس فضول آدمی کی پرواہ کر رہی ہوں ـــ"

"اے کیا کہہ رہا تھا زلفی بنّو ـــ" اندر سے پھوپھی اماں نے آ کر اسے پکارا۔

اس بڑھیا کا دھیان باہر کی طرف ہی لگا ہوا تھا۔ نماز میں بھی اس نے باقاعدہ اُن کی آواز سنی ہے مگر تصدیق چاہتی ہیں۔ آیا میری اس سے آنکھ لڑی ہے یا نہیں ـــ بنّو منہ ہی منہ میں بڑبڑانے لگی۔

"اے بنّو! میں کیا پوچھ رہی ہوں ـــ"

"کیا پوچھ رہی ہیں آپ پھوپھی اماں ـــ"

"اے زلفی کیا کہہ رہا تھا؟"

"وہی جو آپ نے سُن لیا تھا ـــ"

"کچھ اور بھی کہا تھا اُس نے ـــ؟"

"کس سے کہتا وہ ——" اس نے پلٹ کر غصّے میں تلملاتے ہوئے کہا "دیواروں سے کچھ کہتا —— جب اُسے کوئی نظر ہی نہیں آرہا تھا" (اس اندھے کو تو میں بھی نظر نہیں آئی) اس نے دل میں کہا۔

"اچھا اچھا تو ٹور پر گیا ہے —— پرسوں آئے گا —— شریفاں آئے گی تو اس کا کمرہ صاف کرا دینا ——"

سب سُن لیا تھا بڑھیا نے۔ بس تصدیق چاہتی تھی کہ کہیں مجھ سے مڈبھیڑ تو نہیں ہوگئی —— جیسے میں ٹافی ہوں، چاکلیٹ ہوں، مجھے کھا ہی تو جائے گا۔ بڑی دیر تک بنو برتنوں پر اپنا غصہ نکالتی رہی۔ یوں اٹھا اٹھا کر پٹکتی رہی، جیسے اپنی جنک کا انتقام لے رہی ہو ——

رات کو سوتے وقت اسے پھر زلفی بھیّا کا خیال آگیا —— واہ ہے تو بڑا بانکا۔ ذرا بھی تو شرابی نہیں لگ رہا تھا —— نہ اس کی آنکھیں چڑھی ہوئی تھیں نہ ٹانگیں ڈگمگا رہی تھیں —— اور نہ زبان ہی لڑکھڑا رہی تھی —— کوئی نئی قسم کا شرابی لگتا تھا ——

اس دن کے علاوہ وہ بھی بنّو نے زلفی کو کئی بار چھُپ چھُپ کر دیکھا —— کبھی دفتر جاتے ہوئے —— کبھی دفتر سے آتے ہوئے —— کبھی اُونچی آواز میں بات نہیں کرتا تھا —— جو بھی کہنا ہوتا دھیمے لہجے میں کہتا —— بڑے مہذب طریقے سے سلام کرتا —— کسی سے کوئی واسطہ نہ رکھتا —— کسی کو بُرا بھلا نہ کہتا —— بس اس کا گھر میں ہونا نہ ہونا برابر تھا —— مگر بنّو کو تو جیسے کھد بھد لگ گئی تھی اس پر .... ریسرچ کرنے کی —— آخر اتنی بدنامیاں تھیں اس کے دامن میں —— اور اوپر سے کیسا شریف اور مسکین بنا پھرتا ہے —— اور سمجھتا تھا کہ ہمیں اس کے کرتوتوں کا علم نہیں ہے ——

علم کیوں نہیں ہے —— کسی دن ایسا بھانڈا پھوڑوں گی کہ یاد ہی کرے گا۔

وہ ابھی زلفی کا سامنا کرنے کی ترکیبیں ہی کر رہی تھی کہ ایک دن دُولہا بھائی لائل پور سے اچانک آگئے۔ بچیا کے ہاں لڑکا ہوا تھا —— ہسپتال میں تھیں اور کوئی دیکھ بھال کے لئے وہاں نہ تھا —— چونکہ بچہ آپریشن سے ہوا تھا اس لئے ڈاکٹر نے بہت احتیاط بتائی تھی —— سو دُولہا بھائی اماں کو لینے آگئے تھے —— کوئی اور موقع ہوتا تو اماں صاف انکار کر دیتیں۔ ایسے موقع پر انہیں تو بس اپنی بیٹی کی فکر تھی۔ پھوپھی اماں کو سینکڑوں ہدایات دے کر گھر اور بنّو کے بارے میں، وہ تو دوسری گاڑی سے رخصت ہوگئیں —— اور بنّو کو ذرا اطمینان کا سانس نصیب ہوا۔

گو پھوپھی اماں باتوں سے کرخت نظر آتی تھیں —— مگر دل کی نرم تھیں، پر اماں تو بال کی کھال اتارتی تھیں۔ ایسی سخت گیر تھیں کہ دم نہ مارنے دیتی تھیں —— پھوپھی اماں سے وہ نہیں ڈرتی تھی بلکہ بعض اوقات تو پیار محبت سے اپنی بات منوا بھی لیتی تھی۔ دوسرے پھوپھی اماں کو رات برائم کی گولی کھا کر سونے کی عادت تھی۔ اس طرح انہیں نیند ہی نہ آتی تھی ——

پہلی رات جب عشاء کی نماز کے بعد پھوپھی اماں برائم کی گولی کھا کر لیٹ گئیں —— تو تھوڑی دیر بنّو سے باتیں کرتی رہیں۔ بس بار بار یہی کہے جائیں —— "جب مجھے نیند آجائے —— تو بنو تم بھی سو جانا —— خبردار بتی نہ جلانا ——"

"ہاں سو جاؤں گی" وہ جل کر کہتی۔

کیا مصیبت ہے کہ انسان اپنی مرضی سے سو بھی نہیں سکتا۔ آنکھوں میں ایک بٹن لگاؤ۔ جب بڑھیا کہے سو جاؤ ـــــ تو سو جائیں ـــــ واہ ـــــ

پھوپھی اماں باتیں کرتی کرتی بیچاری ڈھیلی ہو گئیں ـــــ

ایسا اتفاق ہوا کہ بنو کو نیند ہی نہیں آ رہی تھی اور گھر میں کچھ پڑھنے کو بھی نہ تھا۔ جو ایک آدھ کتاب یا رسالہ تھا۔ کئی بار پڑھ چکی تھی۔

لیٹے لیٹے اسے خیال آیا کہ وہ اُٹھ کر زلفی بھیا کے کمرے میں جائے اور وہاں سے کوئی کتاب یا رسالہ لے آئے۔

"لیکن اگر وہ اوپر سے آ گئے ـــــ انہوں نے پی رکھی ہوئی ـــــ مجھے پکڑ لیا تو؟"

اس خیال سے وہ بستر میں ہی دُبک کر پڑی رہی۔

کئی بار ہمت کر کے اُٹھنا چاہا ـــــ مگر ہر بار ایک انجانے سے خوف نے اس کے قدم پکڑ لئے ـــــ ایسی حرکت کبھی کی نہیں تھی اس نے ـــــ سیڑھیوں کا ایک دروازہ برآمدے میں بھی کھلتا تھا جسے عام طور پر آپا بی اندر سے بند رکھتی تھیں۔ ممکن ہے اسے کھولنے سے آواز پیدا ہو اور پھوپھی اماں جاگ جائیں۔ گو وہ گولی کے زیر اثر تھیں اور ایک خاص وقفے سے پہلے نہ جاگ سکتی تھیں ـــــ لیکن ان کا کیا پتہ ـــــ؟ کیا خبر وہ جاگ ہی جائیں ـــــ اور جو سیڑھیوں میں ہی زلفی بھائی اس کو پکڑ لیں تو اسے کون بچائے گا ـــــ؟ جانے کب تک وہ جاگتی رہی ـــــ اور اپنی بزدلی پر خود ہی کڑھتی رہی ـــــ کاش وہ جاتی اور لپک کر رسالہ لے آتی ـــــ جاؤں کہ نہ۔ کہتے کہتے ایک گھنٹہ ہو گیا تھا اور اب بارہ بجنے کو تھے ـــــ

جب اس نے باہر ڈیوڑھی میں دروازہ کھلنے کی آہٹ سنی ـــــ تو اب آئے ہیں زلفی بھائی ـــــ اگر وہ ہمت کرتی تو رسالہ لے ہی آتی ـــــ

دھپ دھپ کرتا وہ سیڑھیاں چڑھ گیا اور پھر خاموشی چھا گئی۔

لیٹے لیٹے اس کا دل چاہا وہ اس کے پیچھے جائے اور دیکھے وہ اپنے کمرے میں کیا کر

رہا ہے۔ اس کے بیڈ روم کے دروازے میں ایک سوراخ تھا ـــــ یہ اسے علم تھا اور یہ سوراخ ریاض بھیا کے بیٹے ایاز نے اپنی آری سے کیا تھا ـــــ وہ پہلے بھی کئی بار اس سوراخ سے جھانک چکی تھی، اب جو اس کا دل چاہا ـــــ تو اس نے سوچا تجربے کے طور پر جا کر دیکھنا تو چاہیئے۔ اب تو انہوں نے اندر سے دروازہ بند بھی کر لیا ہو گا ـــــ انہیں کیا خبر ہو گی کہ کون آیا اور جھانک کر چلا گیا۔

وہ بستر سے باہر نکلی۔ پاؤں میں سلیپر بھی نہیں پہنے ـــــ آہستہ سے کنڈی کھولی اور پنجوں کے بل اوپر چڑھ گئی۔ چھت پر پہنچ کر اس کا دل دھڑکنے لگا ـــــ سوچا واپس چلی جاؤں ـــــ پھر رُک گئی ـــــ کہ ناکام جانے سے کیا مطلب؟

دھڑ دھڑاتے دل کے ساتھ وہ پنجوں کے بل ہی آگے بڑھ گئی۔ کمرے کی بتی جل رہی تھی ـــــ اس نے ایک آنکھ بند کی اور دوسری سوراخ پر رکھ دی ـــــ سامنے سفید بستر لگا تھا اور اس پر سفید کُرتا پاجامہ پہنے زلفی لیٹا ہوا ایک کتاب پڑھ رہا تھا ـــــ اس نے شاید صفحہ پلٹنے کے لئے بازو سر سے نکالا تو بنو تیر کی طرح پیچھے بھاگی ـــــ اسے ایسا لگا جیسے اس نے اسے دیکھ لیا ہو ـــــ اندھیرے میں وہ سیڑھیاں پھلانگتی نیچے پہنچ گئی ـــــ

سانس روکے روکے اس نے کنڈی بند کی ـــــ اور دھم سے بستر میں گھس گئی ـــــ تب جا کے کہیں اس کی جان میں جان آئی۔

دیکھو اس نے کتنی بُری حرکت کی تھی ـــــ بھلا کوئی یوں بھی مردوں کو جھانکتا پھرتا ہے ـــــ ہائے کوئی دیکھ لیتا یا سن لیتا ـــــ تو اس کا کیا حشر ہوتا؟ خود زلفی کو پتہ چل جاتا تو کیا کہتا کہ یہ شریف زادیوں کے لچھن ہیں ـــــ آدھی رات کو دوسروں کے مردوں کو جھانکتی پھرتی ہیں ـــــ؟ توبہ نا عوذ باللہ ـــــ اس نے سو سو بار توبہ کی ـــــ کہ خیریت سے نیچے آ گئی ہے ـــــ

سارا جسم خوف کے مارے پسینہ پسینہ ہو رہا تھا ـــــ پر مزہ کتنا آیا دیکھنے میں ـــــ وہ تو کچھ بھی نہیں کر رہا تھا ـــــ ایسے ہی شریف آدمیوں کی طرح لیٹا کتاب پڑھ رہا تھا ـــــ کیا خاک لطف آیا دیکھنے میں ـــــ؟

بس یونہی خیالوں سے کھیلتی کھیلتی وہ سو گئی ـــــ اور دن چڑھنے تک سوتی رہی۔

پھوپھی اماں کے دو ہتڑوں نے اُسے جگایا تو دھوپ کوٹھے سے نیچے اُتر آئی تھی ـــ اور صحن میں پھیلتی جا رہی تھی ـــ نل پر بیٹھ کر اس نے منہ دھویا ـــ اور ایسے ہی بیٹھی پانی کے چھینٹے اڑاتی رہی۔ اتنی سخت سردی میں نل سے نکلتا ہوا تازہ تازہ پانی کتنا اچھا لگ رہا تھا ـــ

پُرجوش، تیز تیز، گرم گرم، شور انگیز ـــ

پھوپھی اماں کے کوسنے سُن کر وہ اُٹھی اور ناشتے کے لئے باورچی خانے میں چلی گئی۔

ابھی وہ اُلٹا سیدھا انڈا بنا کر کھا رہی تھی کہ شریفاں آ گئی۔

"شریفاں پہلے اوپر جا کر زلفی میاں کا کمرہ جھاڑ آ ـــ" پھوپھی اماں کی آواز سُن کر اس نے جلد جلد چائے کی گرم گرم پیالی اندر ڈالی ـــ زبان جل گئی تالو اکڑ گیا ـــــ مگر باہر نکل آئی۔

"پھوپھی اماں میں شریفاں کے ساتھ مل کر صفائی کروا دوں ـــ؟"

"ہاں ہاں ـــ کیوں نہیں ـــ" پھوپھی اماں کو اس کی کاہلی بُری لگتی تھی۔

دھڑ دھڑ دھڑ ـــ وہ شریفاں سے دو قدم آگے سیڑھیاں چڑھ گئی۔

"خیر تو ہے بی بی ـــ؟"

"آج سے میں بھی تمہارے ساتھ کام کیا کروں گی۔" اس نے پھولی ہوئی سانس کے ساتھ کہا۔ اماں بی نے تو اس کا کوٹھے پر جانا بند کر رکھا تھا۔ آج چھت پر آ کر اس نے اطمینان کا سانس لیا۔

"لے تو جھاڑو لگا ـــ اور میں اوپر کی صفائی کرتی ہوں۔"

صفائی تو وہ یوں کر رہی تھی جیسے سی آئی ڈی کے محکمے سے آئی ہو اور خفیہ چھاپہ مار کر کچھ مشکوک چیزیں برآمد کرنا چاہتی ہو ـــ

بے شمار انگریزی کی کتابیں ـــ رسالے ـــ ڈھیر سارے رنگ برنگے کپڑے ـــ بوٹوں کے لاتعداد جوڑے ـــ ڈریسنگ ٹیبل پر بے شمار اور اسٹائلش سی کئی

قسم کی شیشیاں ـــ ایک ایک کا ڈھکن کھول کر اس نے دیکھا ـــ اور جو پسند آئی ـــ کپڑوں پر چھڑک لی۔

شریفاں اس کا تماشا دیکھتی رہی۔

"منہ پھاڑے کیا دیکھ رہی ہے ـــ جا غسل خانہ دھو کے آ ـــ"

جب تک وہ غسل خانہ مانجھ کر آئی۔ اس نے ڈریسنگ ٹیبل پر سب بوتلیں کریمیں اور کنگھیاں بہت خوبصورتی سے لگا دی تھیں۔ کپڑے ہینگروں پر پہنچ گئے تھے۔ سب اُلٹے سیدھے جوتے شو ریک میں جم گئے تھے۔ بستر ٹھیک کر کے خوبصورت بیڈ کور ڈال دیا گیا تھا۔

ذرا سی دیر میں سارا کام ہو گیا ـــ مگر دل ابھی تشنہ ہی تھا ـــ جس بات کی تلاش میں وہ آئی تھی اس کا سراغ نہیں ملا تھا ـــ ایک الماری مقفل تھی۔ سوٹ کیس بھی سارے مقفل تھے ـــ ہے چالاک، قیمتی چیزوں کو تالا لگا گیا ہے۔

کمرہ صاف ہو کر بہت اچھا لگ رہا تھا اور اس میں سے ایک عجیب سی پیاری پیاری خوشبو آ رہی تھی ـــ لفنگے آدمیوں کے کمرے سے اتنی دل لبھانے والی خوشبو کیسے آ سکتی ہے ـــ؟

اس نے سوچا ـــ اور پھر بیدلی کے ساتھ شریفاں کو لئے وہ نیچے اُتر آئی ـــ پھر نیچے آ کر شریفاں نے کتنی آوازیں دے ڈالیں کہ "بی بی جھاڑن لے کر آ دھصفائی کریں" بی بی ٹس سے مس نہ ہوئی۔ بولی۔ "کمبخت میں نے سارے گھر کی صفائی کا ٹھیکہ تو نہیں لیا تھا ـــ اب کچھ تو بھی کرے۔"

ہوں! تو شریفاں کا ماتھا ٹھنکا ـــ ہے کچھ دال میں کالا ـــ وہ گھر گھر بیس سال سے صفائی کرتی گھوم رہی تھی ـــ بھلا اس کی زمانہ بین نگاہ کو پہچاننے میں کہاں دیر لگتی تھی۔

ادھر بنّو رانی اس ایک ہفتے کے اندر اندر زلفی بھائی پر اپنی ریسرچ مکمل کر لینا چاہتی تھی۔ بی آماں کے آجانے کے بعد تو پھر کڑی نگرانی میں آجانا تھا۔ لیکن خدا کا کرنا یہ ہوا کہ بی اماں کا خط آگیا — کہ انہیں غالباً ایک مہینہ اور وجیہہ کے پاس ٹھہرنا پڑے گا — اس کی حالت ٹھیک نہیں اور چھوٹا بچہ بھی بہت کمزور ہے — اس کے بعد انہوں نے پھوپھی آماں اور بنّو کے لئے دہی کی دہی ہدایات پھر سے دوہرائی ہوئی تھیں۔

باقی کا خط بنّو نے غور سے کہاں پڑھا — وہ تو اتنی خوش ہوئی کہ دیکھو یہ بڑی بہنیں بھی کیسی کام کی چیز ہوتی ہیں — اگر عین موقعے پر بچہ نہ جنتی تو اماں سے کھلی چھٹی کیسے مل سکتی تھی —؟

پچھلے ایک ہفتے سے زلفی بھی محسوس کر رہا تھا کہ اس کے کمرے کی سجاوٹ میں جو سلیقہ ہوتا ہے وہ پڑھی لکھی خاتون کے مزاج اور نفاست کی چغلی کھاتا ہے۔ جمعدارنی تو اس طرح صفائی نہیں کر کے جاتی۔

ایک دن اس نے پھوپھی اماں سے پوچھ ہی لیا — "پھوپھی اماں! آج کل میرے کمرے کی صفائی کون کر رہا ہے؟"

پھوپھی ماں کا دل دھڑک کر حلق میں آگیا — کمبخت بنّو نے ضرور کوئی چیز اِدھر اُدھر کر دی ہوگی — مر جائے اللہ کرے — اگر میری آنکھیں نیچی کروائے تو —؟

"کیوں بیٹا! کچھ کھو گیا ہے کیا —؟"

"نہیں تو —" وہ ہنس پڑا — "صفائی بہت اچھی ہوتی ہے اس لئے کہہ رہا تھا۔"

پھوپھی ماں کی جان میں جان آئی — "ہاں بنّو سر پر کھڑی ہو کر شریفاں سے صفائی کرواتی ہے نا اس لئے — ورنہ اس بدبخت کو تو ہمیشہ جانے کی جلدی ہوتی ہے اور یہ بنّو کی عادت ہے کتابیں وتابیں اُڑا لیتی ہے، بیٹا ذرا خود ہی دھیان رکھا کرو۔"

"بنّو —؟" پہلے تو زلفی حیران ہوا — ہاں پھر اُسے یاد آگیا۔ خالہ اماں نے بتایا تھا کہ ان کی ایک چھوٹی بیٹی بھی ہے — "پھوپھی اماں آپ فکر نہ کریں۔ میرے پاس بچّوں کے پڑھنے کی کتابیں نہیں ہیں — ہاں کسی دن بازار گیا تو لے آؤں گا —"

ایک دن وہ نئے رسالے خریدنے بازار میں جا نکلا۔ وہاں اسے ایک ننھی بچّی کا خیال آگیا جو اتنی لگن سے اس کا کمرہ صاف کرواتی ہے تو اس نے بہت سی بچّوں کی کتابیں خرید لیں۔

لنکا کا بھوت، نیلم پری، سات سنہری پروں والی شہزادی، ہنستی روتی شہزادی، فرغانہ کا سوداگر، کھیل اور کھلونے، ہنسی ہنسی میں اور جانے کیا کیا — صبح دفتر جاتے وقت وہ ساری کتابیں پھوپھی آماں کے پاس باورچی خانے میں رکھ گیا۔ کیونکہ اس کا خیال تھا بچّی دیر تک سوتی رہتی ہے اور رات کو بھی جلد سو جاتی ہے۔ اس لئے کبھی اس کا سامنا نہیں ہوا — تو اب پھوپھی اماں خود دے دیں گی —

بنّو جب ناشتہ کے لئے آئی تو ڈھیر ساری خوبصورت کتابیں دیکھ کر لپکی — "پھوپھی اماں یہ کس کی ہیں — ؟ کس کی ہیں یہ —؟"

"بھئی وہ رکھ گیا ہے —" وہ کام کرتے ہوئے بغیر دیکھے بولیں —"

"کون رکھ گیا ہے — اور کس کے لئے —؟" اس نے کتابوں کے نام پڑھنے شروع کئے — "اے پھوپھی ماں — کبھی تو وقت پر بولا کیجئے —؟" وہ جھنجھلائی —

"اے وہی — کیا نام ہے اس کا — زلفی — زلفی رکھ گیا ہے —"

"کس کے لئے پھوپھی ماں ـــــ کس کے لئے ـــــ ؟"

"اے لو مجھ سے پوچھ رہی ہے کس کے لئے ـــــ مجھے کیا معلوم کس کے لئے ـــــ بس رکھ گیا ہے ـــــ"

اتنے میں اس نے سارے نام پڑھ لئے تھے ـــــ بولی "یہ تو سب بچوں کے پڑھنے کی کتابیں ہیں ـــ ؟"

"ہاں ـــــ ہاں ـــــ مجھے یاد آیا ـــــ ایک دن کہہ رہا تھا کہ میرے پاس بچوں کے پڑھنے کی کتابیں نہیں ہیں ـــــ کسی روز اس کو لا دوں گا ـــــ"

"کس کو پھوپھی ماں ـــــ"

"اے بنّو کو ـــــ تجھے تجھے ـــــ تو جو ہر وقت جا کر اس کی کتابیں اِدھر اُدھر کرتی ہے ـــــ تو اس نے لا دی ہوں گی ـــــ"

"اچھا تو یہ کتابیں میرے لئے آئی ہیں ـــــ" بنّو غصّے سے تلملا کر بولی۔ "اور پھوپھی اماں تم نے کہا ہوگا۔ میری بنّو تو ابھی دودھ پیتی بچّی ہے روٹی کو چوچی کہتی ہے۔ دودھ کو دو دو کہتی ہے ـــــ ہے نا ـــــ ؟"

"اے میں کیوں کہتی ایسی بات ـــــ ؟"

"پھر وہ اُلّو کا پٹھا میرے لئے یہ بچّوں کی کہانیاں کیوں اٹھا لایا ہے" بنّو نے کتابیں اٹھا کر دیوار پر دے ماریں۔

"بنّو ـــــ بنّو ـــــ ذرا اپنی زبان ٹھیک کر ـــــ اور خواہ مخواہ کسی کو گالی دینا بھی اچھا نہیں ـــــ ایک تو وہ تمہارے لئے کتابیں لایا ـــــ اُوپر سے تو نخرہ دکھا رہی ہے ـــــ اگر پسند نہیں تو کسی کو دے دے ـــــ اور اگر تو یہ پڑھ لے گی تو تیرا کیا جائے گا ـــــ دیکھ اس کو مت بتانا اس کا جی بُرا ہوگا ـــــ"

"ہوں ـــــ!" تو پھوپھی ماں نے اسے ایک خیال سُجھا دیا ـــــ اس نے اُٹھ کر کتابیں سمیٹیں اور اپنے کمرے میں رکھ آئی۔

خود مناسب موقعے کے انتظار میں رہی ـــــ

مناسب موقعہ تو وہی رات کا تھا ـــــ جب پھوپھی ماں ۔۔۔۔ ہوش و حواس سے بیگانہ ہو جاتی تھیں۔

اس رات وہ کافی دیر سے آیا۔

جب وہ اوپر چلا گیا تو اس نے ساری کتابیں اٹھائیں۔ دروازہ کھولا اور ننگے پاؤں پنجوں کے بل چلتی اوپر چڑھ گئی ـــــ اوپر آخری سیڑھی پر اس نے ذرا سا دم لیا۔ کمرے کی بتی جل رہی تھی اس نے سوچا پہلے جھانک کر دیکھے۔ زلفی بھائی کیا کر رہے ہیں۔ اسی سوراخ سے اس نے جھانکا۔

اُف اللہ ـــــ! اس کا کلیجہ دھک سے رہ گیا ـــــ زلفی بھائی شراب پی رہے تھے۔ ایک سنہری ڈھکن والی بوتل سامنے رکھی تھی۔ ایک چھوٹا سا گلاس پڑا تھا۔ وہ ایک رسالہ کھولے بیٹھے تھے۔ آنکھیں ان کی سُرخ ہو رہی تھیں۔

اس کے ماتھے پر پسینہ آگیا ـــــ اس نے پہلی مرتبہ چھپ کر کسی کو شراب پیتے ہوئے دیکھا تھا ـــــ اور اس کی اپنی ایسی کیفیت ہو رہی تھی جیسے پہلی بار کسی گناہ کی مرتکب ہو رہی ہو ـــــ اس کا نجس کہتا کہ کھڑی رہو ـــــ اور دیکھے جاؤ ـــــ یہ شراب کیسے بناتے ہیں ـــــ کتنی پیتے ہیں اور پینے کے بعد کیا کرتے ہیں۔ ان پر اس کا کیا اثر ہوتا ہے۔

کھڑے کھڑے جب اُسے یہ خیال آگیا کہ شراب پینے کے بعد مرد عورت کی طلب کرتا ہے ـــــ وہ ایسے پیچھے کو پلٹی جیسے وہ دروازہ کھول کر اسے پکڑنے کے لئے آرہے ہوں ـــــ مارے گھبراہٹ کے ایک ایک کی بجائے دو دو سیڑھیاں پھلانگتی نیچے آگئی ـــــ جسم پسینے سے شرابور تھا ـــــ اور دل پسلیوں میں بُری طرح دھڑک رہا تھا ـــــ اسی گھبراہٹ میں ایک کتاب بھی اوپر گر گئی تھی۔

اپنے بستر میں گھس کر اسے کچھ سکون محسوس ہوا۔

پھر اسے زلفی بھائی سے بڑی گھن آئی ـــــ سچ مچ لفنگا ہے یہ تو۔ بھلا ایسے مرد کے ساتھ کوئی عورت کیسے خوش رہ سکتی ہے ـــــ یہ تو نفرت کے

قابل ہے۔اس پر پھٹکار بھیجتی وہ اس رات سو گئی تھی۔

دوسری رات بھی وہ کتابیں اُٹھا کر گئی تھی۔اس وقت بھی وہ اسی انداز میں شراب پی رہے تھے ـــــ اور تیسری رات بھی وہ گئی تھی۔تب بھی وہ شراب پی رہے تھے ـــــ مگر اس کا ہاتھ دروازے پہ جا لگا تھا اور انہوں نے نشے میں چور آواز میں پوچھا تھا ـــــ "کون ہے؟"

"اوئی میرے اللہ ـــــ" وہ پھلانگتی پھلانگتی نیچے آ رہی تھی۔اگر وہ سیڑھیوں سے لڑھک جاتی تو ـــــ یہ کھیل اچھا نہیں ـــــ اس نے دل میں سوچا ـــــ مگر کتابیں بھی ان کے منہ پر ماری تھیں ـــــ بڑا احسان کیا ہے مجھ غریب پر۔

اس کے بعد زلفی میاں ٹور پر چلے گئے۔

ان کے کمرے کی صفائی میں کوئی فرق نہیں آیا۔البتہ بہت سی سینٹ کی شیشیاں خالی پڑی تھیں جنہیں روز شریفاں للچائی نظروں سے دیکھتی تھی اور کہتی تھی ـــــ "بی بی مجھے دے دو ـــــ میں اپنے گھر میں سجاوٹ کے لئے رکھ چھوڑوں گی ـــــ"

ایک دن اُس نے وہ شیشیاں اُٹھا کے شریفاں کو دے دیں ـــــ آخر خالی شیشیوں کا یہاں کیا کام تھا ـــــ شریفاں خوشی خوشی وہ شیشیاں جھولی میں چھپائے چل دی۔

زلفی بھائی واپس آ گئے تھے۔

اور اس روز وہ رات کو ذرا جلدی آ گئے تھے ـــــ پھوپھی اماں کے سوتے ہی بنّو اوپر چڑھ گئی ـــــ اس نے سوچا تھا آج اگر ان سے ملاقات نہ ہو سکی تو کتابیں دروازے پر پھینک کر آ جائے گی ـــــ اتفاق سے جونہی اُس نے برآمدے میں قدم رکھا، زلفی بھائی نے دروازہ کھولا ـــــ شاید وہ بن ٹھن کر کہیں باہر جا رہے تھے۔

"کون ہے بھئی ـــــ؟" انہوں نے خوف زدہ آواز میں کہا۔"کون ہو تم؟" اور انہوں نے برآمدے کی بتی جلا دی۔

"جی میں .... میں ـــــ" وہ پیچھے کو کھسکتی ہوئی بولی "بنّو ـــــ ہوں"

"بنّو ـــــ" انہوں نے جیسے کچھ یاد کیا ـــــ اور پھر نرمی سے بولے ـــــ "بنّو کیا بات ہے ـــــ؟"

"بات کیا ہونی تھی ـــــ" وہ ایک دم غصّے میں آ گئی۔"یہ جو آپ میرے لئے سوغات لائے تھے۔میں واپس کرنے آئی ہوں۔" اس نے ساری کتابیں ہاتھ پہ رکھ کے ان کے آگے کر دیں۔

"سوغات ـــــ کتابیں ـــــ" وہ اور حیران ہوئے۔

سارے شہر میں آپ کو یہی کتابیں میرے لئے ملی تھیں ـــــ تو آپ الف۔ب کا قاعدہ ہی لے آتے ـــــ تاکہ میں پڑھنا تو سیکھ جاتی ـــــ"

"اوہ ـــ میں کچھ سمجھا نہیں ـــ" انہوں نے کتابیں اس کے ہاتھ سے لے لیں۔
"کیا تمہیں پسند نہیں یہ کتابیں ـــ؟"
"میں پوچھتی ہوں، آپ نے میرے ساتھ یہ مذاق کیوں کیا ـــ کیا میں آپ کو بچہ نظر آتی ہوں ـــ؟"
زلفی زور سے ہنس پڑا ـــ "بھئی غلطی ہو گئی ـــ اب تم مجھے بتا دو، تمہیں کس قسم کی کتابیں پسند ہیں ـــ وہی لا دوں گا ـــ" وہ اس بچی کو اور خفا نہیں کرنا چاہتا تھا۔
"میں کیوں بتاؤں ـــ مجھے کیا پڑی ہے ـــ؟ میں کتابوں کی بھوکی نہیں ہوں۔"
اس کے انداز پہ زلفی کو پھر ہنسی آ گئی۔ "دیکھو اچھے بچوں کی طرح بنا دو اور ضد نہ کرو ـــ"
"جناب آپ میرے ساتھ اس قسم کے مذاق نہ کریں۔"
"کس قسم کے مذاق ـــ؟"
"یہ جو بچی بچی لگا رکھی ہے ـــ"
"تو کیا کہوں ـــ؟"
"کیا میں آپ کو بچی لگ رہی ہوں ـــ؟"
دور اندھیرے میں کھڑی وہ ایک بچی ہی لگ رہی تھی۔ قد بھی اس کا چھوٹا سا تھا۔ اوپر شال لپیٹی ہوئی تھی ـــ اب زلفی کیا کہتا ـــ بولا۔ "یہاں سردی ہے ـــ اندر آ جاؤ اور اطمینان سے بات کرو ـــ"
"نہیں میں اندر نہیں آؤں گی ـــ"
"کیوں ـــ؟"
"مجھے آپ سے ڈر لگتا ہے ـــ"
"کیوں ـــ؟"
"کیونکہ آپ شراب پیتے ہیں ـــ؟"

زلفی ایکدم چونک گیا ـــ "تمہیں کس نے کہا ہے ـــ؟"
"کہنا کس نے تھا جناب ـــ میں خود جانتی ہوں ـــ میں نے آپ کو کئی بار شراب پیتے ہوئے دیکھا ہے ـــ"
زلفی کے چہرے پر حیرت کے ساتھ ساتھ ناگواری کے اثرات ابھر آئے ـــ "اچھا تو اس کا مطلب ہے تم چھپ چھپ کر مجھے دیکھتی ہو ـــ؟"
"ہاں دیکھتی ہوں ـــ پھر ـــ"
"یہ بہت بری بات ہے ـــ"
"اور شراب پینا تو اچھی بات ہے ـــ"
"چھپ چھپ کے کسی کو دیکھنا شراب پینے سے بھی برا ہے ـــ"
"ہاں ـــ عورتوں کو طلاق دینا تو جیسے بہت اچھا کام ہے۔"
زلفی سٹ پٹا گیا ـــ اس چھوٹی سی بچی کو اتنی باتیں کس نے سکھائی ہیں ـــ کس نے بتائی ہیں ـــ اور یہ اتنے غصے میں کیوں بھری کھڑی ہے۔ وہ ذرا اور ناگواری محسوس کرنے لگا۔
"بچوں کو بڑوں کے معاملے میں دخل نہیں دینا چاہیئے ـــ"
"ہاں مجھے شازیہ آپا نے سب بتا دیئے تھے آپ کے کرتوت۔"
"شازیہ ـــ کون شازیہ ہے ـــ؟" ہاں اُسے یاد آیا کہ شازیہ اس کی پھوپھی کی بیٹی تھی ـــ "اچھا ـــ میں کسی سے نہیں ڈرتا ـــ جاؤ ان سے کہہ دو ـــ" وہ غصے سے بولا۔ "اور تم اس وقت یہاں کیا لینے آئی ہو ـــ بھاگ جاؤ ـــ ورنہ پھوپھی اماں سے کہہ دوں گا ـــ"
"میں بھی نہیں ڈرتی کسی سے ـــ اور نہ کوئی میری اس طرح ..... توہین کیا کرے ـــ ایک سال ہوا بی اے پاس کر کے بیٹھی ہوں ـــ سب انگریزی اردو کے ناول پڑھ لیتی ہوں ـــ بڑے آئے جی مجھے بچوں کی کتابیں دینے والے ـــ"
یہ کہہ کر وہ الٹے قدموں بھاگی اور پھر اپنے کمرے میں ہی آ کر دم لیا ـــ تھوڑی

دیر بعد اسے سیڑھیوں پر قدموں کی آہٹ محسوس ہوئی۔ زلفی شاید جا رہا تھا۔

اب رات کے دس بجے کہیں جا رہا ہے — اس وقت کیا کام ہے بھئی۔

اس نے دِل میں سوچا — کچھ نہیں بس آوارہ گردی کرنے — بدمعاشی کرنے — کتنا کمینہ آدمی ہے — دل چاہ رہا تھا منہ پر تھپڑ ماروں — اپنے کرتوتوں پر شرمندہ ہونے کی بجائے حرامزادہ کہہ رہا تھا — میں کسی سے نہیں ڈرتا! واہ ایک چوری اور دوسرے سینہ زوری — ہر عورت کو اس نے کمزور سمجھ لیا ہے — طبیعت نہ دُرست کر دی تو میرا نام نہیں — اچھا ہے جو خاندان کے لوگ اِس سے بات کرنا پسند نہیں کرتے — اور نہ اُسے منہ لگاتے ہیں۔

کمینہ — میں نے کہا، بی اے پاس ہوں اس پر ذرا بھی اثر نہ ہوا — اپنے سوا کسی کو کچھ سمجھتا نہیں — کسی پر غور نہیں کرتا — اور مجھے کیا پڑی ہے۔ خواہ مخواہ اس کے کمرے کی صفائیاں کرتی پھروں۔ اس سے الجھتی پھروں — پوتڑوں کے جگڑے کبھی سنورے ہیں۔

الجھتی، جھنجھلاتی وہ سو گئی —

پھر واقعی — دو تین دن وہ اس کے کمرے کی صفائی کرنے بھی نہیں گئی — اور اس کے بارے میں سوچا بھی نہیں — اس نے تو جیسے پرواہ ہی نہ کی — کہ وہ چھت کے نیچے جلتی کڑھتی بیٹھی ہے — جب دو دن میں زیادہ بور ہو گئی تو پھر ایک رات — جب وہ اپنے کمرے میں تھا — یہ پنجوں کے بل چلتی اوپر پہنچ گئی — ذرا دیکھیں تو حضرت اس وقت کیا کر رہے ہیں — ؟

آج دروازہ ذرا سا کھلا تھا — اس لئے سوراخ میں سے پُورا نظر نہیں آ رہا تھا — شاید آج وہ شراب نہیں پی رہا تھا — وہ کھڑی سوچتی رہی کہ دروازہ کھٹکھٹائے یا نہیں — کہ اچانک دروازہ کھُل گیا۔

ایک لمحے کے لئے اس کی جان نکل گئی — بدمعاش آدمیوں کو پھانسنے کے بہت طریقے آتے ہیں — یہ بھی میری گھات میں رہتا ہے۔

اس نے حیرت سے بنّو کو دیکھا — اور پھر سرد مہری سے بولا — "تم آج پھر آ گئی ہو ؟"

"نہیں میں" وہ بہت زیادہ شرمندہ ہو گئی اور بولی — "کوئی رسالہ مانگنے آئی ہوں"۔

تب اسے یاد آیا کہ وہ تو اس دن کتابیں اس کے منہ پر مار کر گئی تھی اور اس نے ابھی تک اسے دوسری کتابیں نہیں لا کر دیں۔ بولا "کس قسم کا رسالہ تمہیں چاہیئے — ؟"

"کوئی سا دے دیں ـــ بور ہو رہی تھی، سوچا، وقت گزر جائے گا۔"

"اب تمہیں میں نیوز ویک ـــ ٹائمز ـــ ریڈرز ڈائجسٹ یا لندن آبزرور تو دے نہیں سکتا۔ کیا خاک پڑھو گی تم اس میں سے ـــ"

"اللہ کوئی فلمی رسالہ دے دیجئے خواہ انگریزی کا ہو ـــ"

"اچھا تو اب تمہیں میں ... کالج کا نوجوان لگتا ہوں ـــ کہ فلمی رسالے بغل میں دبائے پھروں گا ـــ"

"اب بنیئے نہیں زلفی بھائی، جس قسم کی آپ کی عادتیں ہیں اس سے تو اندازہ ہو نہیں سکتا کہ آپ کوئی اچھا کام بھی کرتے ہوں گے ـــ فلمیں دیکھ لیتے ہیں اور رسالوں کے معاملے میں پارسائی دکھا رہے ہیں۔"

"دیکھو بنو! تم یہاں سے بھاگ جاؤ ـــ ورنہ مجھ سے پٹ جاؤ گی۔"

"واہ ـــ!" وہ اور اکڑ کر کھڑی ہو گئی ـــ "یہ جھوٹی اکڑ کسی اور کو دکھائیں میں رعب ڈالنے والوں کو کچا چبا جاتی ہوں ـــ"

زلفی ہنس پڑا ـــ بچی سے کیا الجھنا ـــ؟

"آؤ ـــ اندر آ کر بیٹھو اور بتاؤ کیا چاہتی ہو ـــ ہے"

"میں کیوں چاہوں کچھ ـــ؟ جیسے حضور کو غلط فہمی ہوئی جا رہی ہے۔" زلفی اور زیادہ ہنسنے لگا ـــ

"آؤ میری بات تو سنو ـــ غصہ دراصل کس بات کا ہے تمہیں، مجھے یہ سچ سچ بتا دو ـــ" اس نے ہاتھ بڑھا کر بنو کا بازو پکڑا ـــ اور کمرے میں لے آیا ـــ بازو پکڑتے ہی اُسے محسوس ہوا کہ لڑکی جوان ہے ـــ اور تبھی بازو چھڑانے میں بنو کی شال نیچے گر گئی۔

تب اسے محسوس ہوا، بنو ٹھیک کہتی ہے ـــ اس نے بی۔ اے کر رکھا ہے اور سمجھ دار لڑکی ہے ـــ یوں قد اس کا چھوٹا تھا مگر جسم کافی بھرا بھرا اور گول مٹول تھا ـــ اس نے غور سے بنو کے چہرے کی طرف دیکھا۔

عام سا چہرہ ـــ

عام سی لڑکی ـــ

جیسے اس طبقے کی لڑکی ہوتی ہے۔

گدلا گدلا رنگ ـــ گول سا چہرہ ـــ بھرے بھرے موٹے ہونٹ گول مول سی ناک ـــ جس میں چاندی کی کیل پڑی تھی ـــ البتہ آنکھیں اس کی کافی خوبصورت تھیں ـــ موٹی موٹی ـــ روشن اور پُرکشش آنکھیں ـــ

بس اس لڑکی میں کوئی خاص بات نہ تھی ـــ اپنی سادگی اور بھولپن کی وجہ سے ابھی بچی دکھائی دیتی تھی ـــ زلفی کو اپنی غلطی کا احساس ہوا کہ اس نے اسے بہت چھوٹی بچی سمجھ لیا تھا ـــ لڑکی اٹھارہ انیس برس کی تھی ـــ مگر اس کے لئے تو چھوٹی بچی ہی تھی ـــ اور اسے کون میرے خلاف بھڑکاتا رہتا ہے۔

وہ سوچنے لگا ـــ پھر بولا "اچھا بنو۔ تم جاؤ ـــ میں وعدہ کرتا ہوں کل تمہیں ڈھیر سارے فلمی رسالے اور کتابیں لا دوں گا ـــ"

"میں آپ کے رسالوں کی بھوکی نہیں ہوں ـــ"

اس نے پیار سے اس کے کندھے تھپتھپائے ـــ "شاباش جاؤ اب جا کر سو جاؤ ـــ"

"آپ مجھے بار بار ہاتھ کیوں لگا رہے ہیں؟" اس بات پر زلفی پھر بُری طرح ہنسنے لگا ـــ "مجھے معلوم ہے ـــ آپ بہت بدمعاش آدمی ہیں۔

"ہوں ـــ تو کیا بدمعاشی دیکھی ہے تم نے مجھ میں ـــ" اس نے مصنوعی غصے سے کہا۔

"میں کب کہتی ہوں ـــ سارے خاندان کی لڑکیاں کہتی ہیں ـــ"

"اچھا تو سارے خاندان کی لڑکیاں کہتی ہیں ـــ" اب اسے سچ مچ غصہ آنے لگا تھا ـــ "ان سے کہو وہ میرے بارے میں اتنا کیوں سوچتی ہیں اور اگر سوچتی ہیں تو سوچتی رہیں ـــ کیا بدمعاشی کی ہے میں نے اُن کے ساتھ۔ بولو ـــ بتاؤ ـــ کس کا

سرِعام ہاتھ پکڑا ہے ــــ" جیسے وہ گرج رہا تھا ــــ

"اللہ ــــ آپ تو یونہی مجھ پر برس رہے ہیں ــــ میں نے کب کہا یہ ــــ" وہ منمناتی ــــ "وہ تو سب کہتے ہیں . . ."

"ہاں ہاں میں بھی یہی کہہ رہا ہوں کہ اُن سے پوچھنا تھا کس کس کی عزّت لوٹی ہے میں نے ــــ؟ کس کی بہن کو اغوا کیا ہے ــــ کس کی بیٹی سے ــــ"

"توبہ ــــ بس بھی کیجئے زلفی بھائی آپ تو سچ مچ ــــ"

"کیا سچ مچ . . ." وہ غرّایا ــــ "ہاں میں سچ مچ بدمعاش ہوں ــــ غنڈہ ــــ لفنگا ہوں لوفر ہوں ــــ کمینہ بھی ہوں ــــ ساتوں شرعی عیب ہیں مجھ میں، جاؤ ساری دُنیا سے کہہ دو . . . ڈنکے کی چوٹ کہہ دو ــــ پھر تم یہاں میرے پاس کیا لینے آئی ہو؟ رات کے وقت میرے کمرے میں کیوں کھڑی ہو ــــ میرے تو سائے سے خاندان والے اپنی لڑکیوں کو بچاتے ہیں ــــ تمہیں بھی یہاں نہیں آنا چاہیے ــــ جاؤ ــــ بھاگو ــــ" وہ اور زور سے گرجا ــــ "آجاتی ہے یہاں ناصح بن کر ــــ جیسے مجھے اس کی نصیحتوں کی تو ضرورت ہے ــــ"

بنّو بی اتنی ڈانٹ کھا کر چھم چھم رونے لگی ــــ

"تسوے بہا کر مت دکھاؤ ــــ جاؤ ــــ جاؤ ــــ ورنہ . . ."

لیکن نہ جانے کیا ہوا بنّو کے قدم زمین کے ساتھ جم گئے۔ شاید اسے یقین نہیں تھا کہ وہ اس کی اتنی توہین کرے گا۔ یا واقعیٔ خوف زدہ ہو گئی تھی۔ پھر اس نے اس کی بھی پرواہ نہیں کی ــــ سامنے کی مقفّل الماری کھولی ــــ وہسکی کی نئی بوتل نکال لایا ــــ اس کا ڈھکن اڑایا ــــ تھرموس میں سے برف نکالی اور گڑگڑ گڑگڑ وہسکی گلاس میں انڈیلنے لگا ــــ

جب اس نے گلاس منہ سے لگایا ــــ تو ایک قہر آلود نگاہ اس حقیر سی لڑکی پر ڈالی ــــ بوتل دیکھ کر اس کے حواس اپنی جگہ پر واپس آگئے تھے ــــ ایسے سرپٹ بھاگی جیسے کوئی بھوت دیکھ لیا ہو ــــ رات کے وقت اگر اسے کوئی کسی شرابی کے کمرے میں دیکھ لے ــــ وہ بھی اس حالت میں کہ روتی کھڑی ہے ــــ سر پہ دوپٹہ نہیں ــــ پاؤں میں چپل نہیں ــــ تو کیا ہو ــــ رسوائیوں کے داغ داغ پہاڑ اس پر آگریں۔ ــــ

آنکھوں میں اِتنے موٹے موٹے آنسو تھے کہ سیڑھیاں بھی نظر نہیں آرہی تھیں ــــ گرتی پڑتی ــــ ٹکّیں ڈولتی ــــ آخر نیچے آگئی ــــ زور سے کنڈی لگائی۔ کہیں وہ آوارہ دھکّا لگا کے کھول نہ لے ــــ پھوپھی امّاں کے خراٹے سُنائی دے رہے تھے ــــ جلدی سے بستر میں گھس گئی ــــ اور خوب زور زور سے رونے لگی ــــ لوگ ٹھیک ہی تو کہتے ہیں۔

آج میں نے اس کا اصل رُوپ دیکھ لیا ــــ سچ مچ کا بدمعاش ہے ــــ کچھ لحاظ نہیں کسی شریف لڑکی کا ــــ بولنے کی تمیز نہیں ــــ بُلانے کا سلیقہ نہیں جنگلی ــــ بدچلن ــــ پھر میرے سامنے ہی شراب کی بوتل نکال لایا ــــ ہاتھ اگر اس کو چڑھ جاتی تو ــــ وہ لپک کر مجھے پکڑ لیتا تو ــــ میری چیخ و پکار کون سنتا ــــ پھوپھی ماں تو ہوش و حواس بیچ کر سوئی ہیں۔ آج اللہ نے میری عزت بچالی۔

ذلیل ــــ کتا ــــ بدچلن ــــ کمینہ ــــ

مگر کمینی تو تُو ہے بنّو بی ــــ جو ہر بار اس کے منہ لگتی ہے ــــ خاندان بھر میں کوئی ہے جو اس کو منہ لگائے ــــ لڑکیاں اس کا نام سنتے ہی تھو تھو کرنے لگتی ہیں ــــ لڑکے اس سے دوستی کرنا معیوب جانتے ہیں۔ ماں باپ نے اسے گھر سے نکال دیا ہے ــــ اس نے کب اس معاشرے کے بنائے ہوئے اصولوں کا احترام کیا ہے۔ کتنی حقارت سے ہر بات ٹھکرا دیتا ہے ــــ اور تجھ پر امّاں بی کے پہرے ہیں ــــ پھوپھی ماں نصیحتوں سے میرے کان بھرا کرتی ہیں ــــ تو پھر بھی اس لفنگے کے کمرے میں جا نکلتی ہے ــــ تیری لعنت ملامت سے وہ کبھی نہیں سدھر سکتا ــــ تو بھی اس کے منہ پر تھوک اور بے پرواہ بن جا۔

صبح جب شریفاں نے اسے بتایا کہ صاحب الماری کھلی چھوڑ گئے ہیں ـــ تو اسے اپنی قسمت توڑ کر اوپر جانا پڑا۔

واقعی وہ الماری جو ہمیشہ مقفل رہتی تھی ـــ آج کھلی پڑی تھی، بلکہ چابیاں بھی اس میں لٹک رہی تھیں ـــ پہلے تو اس کا دل چاہا ـــ ہاتھ نہ لگائے اس ناپاک الماری کو ـــ رات اس نے اس میں سے بوتل نکالی تھی اور اسے معلوم ہو گیا تھا، اس الماری میں کیا ہوتا ہے۔

مگر پھر تجسّس نے آگ بھڑکائی تو چل کر آگے آ گئی ـــ دیکھا تو اوپر والا خانہ بھری ہوئی بوتلوں سے اٹا تھا اور نیچے سب خالی بوتلیں پڑی تھیں ـــ بیشمار اور بے حد خوبصورت بوتلیں۔ کوئی گول صراحی دار گردن والی ـــ کوئی چپٹی ـــ کوئی تین کونی ـــ کوئی سات کونی ـــ واہ ـــ کیسی شاندار بوتلیں ہیں۔ اس پر سنہری سنہری لیبل اور سنہری ڈھکن لگے ہوئے تھے ـــ مگر کچھ بوتلوں کے منہ تو بالکل ہی چھوٹے تھے، کسی کام نہ آ سکتی تھیں ـــ وہ بوتلوں کو جھاڑن کے ساتھ پکڑ پکڑ کر دیکھ رہی تھی ـــ جیسے کہ وہ انتہائی ناپاک شے ہوں ـــ اُن میں سے جو بُو آ رہی تھی، وہ بھی اسے سخت بُری لگ رہی تھی ـــ بالآخر شریفاں سے کہا ـــ

"تجھے پتہ ہے یہ کس چیز کی بوتلیں ہیں ـــ؟"

"ہاں بی بی ـــ مجھے پتہ ہے یہ دارُو کی بوتلیں ہیں ـــ"

"کیسے پتہ چلا تجھے ـــ؟"

"بی بی وہ کالو کباڑیا ہے نا؟ میں نے اس کی دوکان پر دیکھی تھیں اور وہ کہہ رہا تھا یہ بوتلیں میں دو روپے فی بوتل کے حساب سے لیتا ہوں ـــ" شریفاں کے منہ میں پانی آ گیا۔

"کیا خیال ہے شریفاں ـــ یہ بوتلیں یہیں پڑی رہیں ـــ" اس نے ایک انتقامی جذبے کے تحت کہا۔

"میری مانو بی بی ـــ تو مجھے دے دو ـــ اے یہ تو پھینک پھانک دے گا، میرے چار پیسے بن جائیں گے ـــ تم کہاں اِدھر اُدھر چھپاتی پھرو گی"

"ہاں یہ ٹھیک ہے ـــ تم یہ سب بوتلیں لے جاؤ ـــ"

"ہائے میں واری، میں صدقے ـــ" شریفاں جلدی جلدی بوتلیں سمیٹنے لگی۔

"مگر ایک بات سُن ـــ"

"جی بی بی ـــ"

"اپنا دوپٹہ بچھا لے اور اس میں باندھ کر لے جانا ـــ خبردار جو بی اماں کو یا پھوپھی ماں کو کانوں کان خبر ہوئی ـــ"

لے بی بی ـــ میں کوئی پاگل ہوں ـــ بی اماں کیا میں تو محلّے میں کسی کو خبر نہ ہونے دوں گی ـــ"

بیس تیس بوتلیں ـــ جنہیں شریفاں نے بڑی تیزی سے اٹھایا اور اپنا موٹا دوپٹہ بچھا کر اس میں باندھ لیا ـــ پھر گٹھڑی کو ایک طرف رکھ دیا۔

بنّو نے دوبارہ الماری مقفل کر دی، اس کے ساتھ اور چابیاں بھی تھیں ـــ غالباً وہ سوٹ کیسوں کی تھیں ـــ پہلے اس کا دل چاہا، وہ سب سوٹ کیس کھول کر دیکھے ـــ ان کے اندر اس نے کیا کیا رکھ چھوڑا ہے ـــ لیکن پھر شریفاں کی موجودگی میں اسے ایسا کرنا اچھا نہ لگا ـــ پھر یہ تو ایک قسم کی چوری تھی ـــ اس لئے اس نے چابیاں ہاتھ میں پکڑ لیں

اور بولی۔

"شریفاں تم صفائی کر کے آجانا —— یہ چابیاں میں پھوپھی ماں کو دے دوں گی ——"

واقعی نیچے جا کر اس نے چابیاں پھوپھی ماں کو دے دیں اور بولی —— "آج زلفی بھائی یہ چابیاں الماری میں لٹکتی چھوڑ گئے تھے —— میں تالا لگا آئی ہوں —— جب آئیں تو ان کو یہ چابیاں دے دیں ——"

اس نے آج سے اس کے معاملے میں دخل نہ دینے کا عہد کر لیا تھا۔ پھوپھی ماں نے چابیاں اس کے ہاتھ سے لے لیں —— مگر اسے بڑی مشکوک نظروں سے دیکھا "الماری تو ٹھیک سے بند کر دی نا ——؟"

"ہاں پھوپھی ماں ——"

"کوئی چیز اپنی جگہ سے ہٹائی تو نہیں ——؟"

"پھوپھی ماں —— کیا میں چور ہوں —— اُلّو کی پٹھی ہوں" وہ پلٹ کر بولی —— طریقے طریقے سے مجھ سے پوچھ رہی ہیں —— جیسے میں نے کچھ اٹھا لیا ہو ——"

"اے تو تو ہے ازل سے لاپرواہ —— اس کی کوئی چیز اِدھر اُدھر نہ رکھ دی ہو ——"

"اس کے پاس ہے ہی کیا چیز —— اِدھر اُدھر کرنے والی —— بوتلوں کے سوا" آخری الفاظ اس نے بہت آہستہ سے کہے۔

"اس کا مطلب ہے —— تو اس کی تلاشی لے کر آئی ہے ——"

"اللہ پھوپھی اماں —— شریفاں سے پوچھ لیجئے —— وہ تو ابھی تک اوپر ہے —— میں نے کیا کچھ اِدھر اُدھر کیا ہے —— اور کس شے پر ہاتھ پھیرا ہے"

"اے بی بی! میں آرہی ہوں ——" اوپر سے شریفاں نے آواز دی —— بوتلوں کا بوجھ اس سے نہ اٹھایا جا رہا تھا —— نہ چھپایا جا رہا تھا —— پھر بھی وہیں سے ہانپتے ہوئے بولی —— "پھوپھی ماں —— بنّو بی نے تو بڑے احتیاط سے الماری بند کر کے چابیاں آپ کو دے دی ہیں ——" تب پھوپھی ماں کی تسلی ہوئی ——

رات کو زلفی جلدی آگیا تھا —— پھوپھی ماں ابھی باورچی خانے میں تھیں —— اُس نے کھانا کھایا —— پھوپھی ماں نے اُسے چابیاں دیں، تو اُسے یاد آیا کہ وہ تو آج الماری کھلی چھوڑ گیا تھا —— اس خیال کے آتے ہی وہ سٹپٹا کر اُوپر بھاگا ——

آج وہ بنّو کے لئے بے شمار انگریزی و اُردو رسالے اور ناول لایا تھا —— رات اس نے اس پر زیادتی کی تھی —— اسے ایک نووارد اور اجنبی لڑکی سے اس طرح گفتگو نہیں کرنی چاہیئے تھی ——

پھر وہ کافی دیر تک بنّو کا انتظار کرتا رہا —— وہ نہیں آئی —— اس کا خیال ٹھیک تھا —— کہ وہ نہیں آئے گی —— رات اس کی طبیعت اچانک خراب ہو گئی —— اور وہ دفتر نہیں جا سکا —— صبح کافی دیر تک جب وہ نیچے نہیں اترا تو پھوپھی ماں نے بنّو سے کہا —— "اے بنّو! ادھر آ —— ذرا دوپٹہ ٹھیک سے اوڑھ —— اس طرح ہاں سارا جسم ڈھک لے —— اور اوپر جا کے پتہ کر، خیریت ہے —— آج زلفی دفتر کیوں نہیں گیا"

"میں نہیں جاتی پھوپھی ماں —— ایسے بدمعاش کے مَیں منہ نہیں لگتی"

"اے بے حیا! بدذات! اتنی بڑی بات تجھ سے کس نے کہہ دی۔ وہ سن لے گا —— تو کیا کہے گا ——؟"

"کہنا رہے جو اس کا دل چاہتا ہے —— میں بھی کوئی ایسی گری پڑی نہیں ہوں"

اے بیٹی! یہ تو انسانی فرض ہوتے ہیں ـــــ کہیں ایسا نہ ہو وہ بچارا بیمار ہو اور سارا دن تڑپتا رہے ـــــ جا میری جان ـــــ میں گھٹنوں کے درد کی وجہ سے اوپر نہیں جا سکتی ـــــ اگر چلی گئی تو اتر نہ سکوں گی ـــــ کبھی کبھی کہنا مان لیا کر ـــــ ضد کا بھی کوئی وقت ہوتا ہے ـــــ"

حقیقت میں اس وقت وہ اوپر نہ جانا چاہتی تھی، اور نہ زلفی کا سامنا کرنا چاہتی تھی ـــــ مگر پھوپھی ماں کی مجبوری کو مدِّنظر رکھتے ہوئے وہ دھڑ دھڑ اوپر چڑھ گئی ـــــ دروازے کے باہر ہی کھڑی ہو گی ـــــ اور زور سے بولی۔

"زلفی بھائی ـــــ میں خود نہیں آئی ـــــ پھوپھی ماں نے زبردستی مجھے بھیجا ہے ـــــ وہ پوچھ رہی ہیں آپ آج دفتر کیوں نہیں گئے ـــــ؟" اس نے اس قدر چلّا چلّا کر یہ الفاظ کہے کہ نیچے بیٹھی ہوئی پھوپھی ماں بھی سن سن کر لاحول پڑھ رہی تھیں۔

"وہ بھئی میری طبیعت خراب ہے ـــــ آج میں نہیں جاؤں گا ـــــ"

"آپ کو ایک پیالی چائے کی دے جاؤں ـــــ؟"

"اگر تکلیف نہ ہو تو ـــــ" اس نے جواب دیا۔

ایک پل میں دھڑ دھڑ کرتی بنو نیچے آ رہی ـــــ "ان کی طبیعت خراب ہے ـــــ ایک پیالی چائے کی مانگی ہے ـــــ"

"لے میری بیٹی ـــــ میں بنا دیتی ہوں ـــــ جلدی سے دے آ ـــــ"

"واہ ـــــ اب مجھے آپ نے نوکرانی ہی سمجھ لیا ہے ـــــ"

"دیکھ اب نخرے نہ دکھا ـــــ تجھے پتہ ہے، تیرے سوا اس وقت گھر میں کون ہے ـــــ" پھوپھی ماں نے چائے ٹرے میں لگائی۔ مکھن توس اور دو اُبلے ہوئے انڈے بھی رکھ دیئے۔ "ذرا احتیاط سے لے کر جانا ـــــ کوئی شے گر نہ جائے ـــــ اور دیکھ سیڑھیوں سے اس طرح نہیں اُترتے جیسے کوئی کنستر لڑھکتا آ رہا ہو ـــــ"

بنو نے ٹرے اٹھایا اور اوپر کو چلی ـــــ پاؤں کی ٹھوکر سے دروازہ کھولا ـــــ زلفی اُٹھ کر بیٹھا ہوا تھا ـــــ پھولے ہوئے منہ کے ساتھ اس نے تپائی اس کے آگے

رکھی اور اس پر چائے رکھ کر جانے لگی۔

"بنو ـــــ" زلفی نے پکارا ـــــ "میں تیرے لئے رسالے لایا تھا ـــــ وہ پڑے ہیں، لے جاؤ ـــــ"

"میں نہیں لیتی رسالے ـــــ آپ میرے کیا لگتے ہیں ـــــ جو میرے لئے رسالے لائے ہیں ـــــ"

"لگتا تو میں کسی کا کچھ نہیں ـــــ کیونکہ میں ایک بدمعاش آدمی ہوں۔ بدمعاش آدمی تو کسی کا رشتہ دار نہیں ہوتا نا ـــــ؟"

"نہیں ـــــ" اس نے بھی ڈھٹائی سے جواب دیا۔

"تو بس ایسے ہی لے لو ـــــ اب میں لے آیا ہوں ـــــ"

"میں خیرات نہیں لیتی ـــــ"

"تم چوری کرتی ہو ـــــ؟"

"چوری ـــــ؟" وہ بھپر کر غصّے سے مڑی۔

"ہاں چوری ـــــ؟"

"کیا چوری کیا ہے میں نے آپ کا؟"

"مجھے یہ بتاؤ تم نے اس الماری میں سے بوتلیں کہاں غائب کی ہیں؟"

"مجھے نہیں ضرورت ان خالی، واہیات اور ناپاک بوتلوں کی ـــــ"

"پھر تم نے میری اجازت کے بغیر انہیں یہاں سے کیوں ہٹایا؟"

"وہ تو ایسے ہی شربتیاں مانگ رہی تھی۔ کہہ رہی تھی دو روپے کی ایک بکے گی۔ اور میں اُٹھا لے آؤں گی۔"

"تو تم نے وہ بوتلیں شربتیاں کو دے دیں؟"

"تو کیا میں خود رکھ لیتی۔ آپ کی نشانی بنا کر۔" وہ دانت چبا کر بولی "دیکھو بنو! تم نے بہت اچھا نہیں کیا۔ اگر اماں جی یا پھوپھی اماں کو پتہ چل گیا تو وہ کیا کہیں گی؟"

"اب کسی کو پتہ نہیں چل سکتا یہاں سے تو وہ چھپا کر لے گئی ہے اور اب تک بیچ

بھی چکی ہوگی۔"

"پھر بھی میں تمہیں نصیحت کرتا ہوں کہ آئندہ تم اس قسم کی حرکت نہ کرنا۔"

"ایک تو آپ کے کمرے کی صفائی کریں۔ اوپر سے دھمکیاں بھی سُنیں۔"

"اس کے لئے تو میں شکر گزار ہوں۔ مگر خالی بوتل ہی کیوں نہ ہو کسی کی شے اجازت سے اٹھاتے ہیں۔"

"آپ بھی چابیاں یوں کھلی چھوڑ کر نہ جایا کریں۔ ورنہ ہمیں کیا ضرورت تھی خالی بوتلیں اٹھانے کی۔ میں نے سوچا اب کہاں ردّی والا ڈھونڈتے پھریں گے، اس لئے اُسے دے دیں۔"

"ایک بار پہلے بھی تم نے میری سینٹ کی خالی شیشیاں اٹھا لی تھیں ——" "جناب وہ بھی شریفاں ہی لے گئی تھی۔ مجھے آپ کی خالی بوتلوں سے بالکل دلچسپی نہیں ہے، جو آپ کی طرح بالکل کھوکھلی ہیں۔"

زلفی ہنسنے لگا۔ "اچھا اب غصّہ تھوک دو اور رسالے اُٹھا لو۔"

"جی نہیں۔ کل کو آپ کہہ دیں گے کہ تم میرے کمرے سے رسالے اٹھا کر لے گئی تھیں۔"

زلفی پھر ہنسنے لگا۔ "تم تو خاصی لڑاکی ہو۔ مگر مجھے یہ سمجھ اب تک نہیں آئی کہ تمہیں مجھ پر غصّہ کیوں آیا رہتا ہے۔"

"آپ ہیں ہی اس قابل۔"

"کچھ اور ——"

"آپ نے دو بیویوں کو طلاق دے دی ہے اور شراب پیتے ہیں۔ آپ کا کیا خیال ہے کہ عورت ذات اتنی حقیر ہوتی ہے کہ اُسے یوں پاؤں تلے مسل دیا جائے۔"

"بہتر ہے تم اس معاملے میں دخل نہ دو۔"

"اور اب آپ ضرور تیسری جگہ شادی کرنے کا سوچ رہے ہوں گے۔"

زلفی پھر ہنسنے لگا۔

"لیکن اس بار آپ شادی کر کے تو دیکھیں۔"

"تو کیا کرو گی تم؟"

"اس بار آپ کو طلاق دلواؤں گی۔"

"بات تو وہی ہو جائے گی۔"

"اگر میں ہوتی نا آپ کی بیوی۔" اس نے دانت پیستے ہوئے کہا۔ "تو اچھی طرح آپ کے چودہ طبق روشن کر کے پھر آپ کی چھٹی کرا دیتی۔"

"تم نے کبھی آئینے میں اپنی شکل دیکھی ہے؟" زلفی نے ایک اور وار کیا۔

"جی دیکھی ہے۔ مگر میں آپ کو پسند ہی کب کرتی ہوں۔ میں تو ایسے ہی محاورۃً کہہ رہی تھی۔ میں تو آپ کو درست کرنا چاہتی ہوں۔"

"اچھا اب اچھے بچوں کی طرح مان جاؤ اور رسالے اٹھا لو۔ اپنی عمر سے بڑی باتیں کر کے نہ دکھاؤ۔"

بنّو نے رسالوں کی طرف دیکھا۔ آہا خوش رنگ، خوبصورت، پیارے پیارے چھوٹے بڑے رسالے اور نئی نئی جلدوں والے ناول۔ اس کا دل للچا گیا۔ شاید وہ اس مہینے کے سارے رسالے اٹھا لائے تھے اور سب نئے ناول۔ وہ تو سال بھر پیسے جمع کرتی رہے تب بھی اتنے رسالے نہیں خرید سکتی تھی۔ رسالے لینا بھی چاہتی تھی اور اپنی بات بھی رکھنا چاہتی تھی۔ بولی۔ "میں اس شرط پر لے جاؤں گی کہ پڑھ کر آپ کو واپس کر دوں گی۔"

"ارے مجھے کیوں؟ پڑھ کر شریفاں کو دے دینا۔ ردّی میں بیچ دے گی۔ مجھے تو ان رسالوں سے دلچسپی ہی نہیں ہے۔"

بنّو تھوڑی دیر کھڑی سوچتی رہی۔ پھر بولی۔ "اب آپ کہتے ہیں تو لے لیتی ہوں۔ آپ کہیں گے بڑوں کا کہنا نہیں مانتی۔ ویسے میں پڑھ کر ضرور واپس کر دوں گی۔ کسی کی چیز رکھنے کا مجھے بالکل شوق نہیں ہے۔ خیر۔ اب آپ اتنے بُرے بھی نہیں کہ یہ رسالے آپ کے منہ پر دے ماروں۔"

زلفی کو بہت ہنسی آئی۔ مگر وہ ہنسا نہیں۔ کہ یہ بلا پھر بگڑ جائے گی۔

اُس نے رسالے اٹھائے اور نیچے کو چلی۔

اتنی دیر ـــ پھوپھی ماں تو غصّے سے کھول رہی تھیں ـــ اتنی دیر میں جانے کیا کیا ہو جاتا ہے۔ کبھی جی چاہتا بے اختیار اوپر چلی جائیں اور کبھی سوچتیں ـــ یوں اوپر جانا ٹھیک نہیں۔

سیڑھیوں پر اس کی دھپ دھپ سُنی تو ان کی جان میں جان آئی۔ "اتنی دیر لگادی حرام خور تو نے"۔ وہ غصّے میں کانپتی ہوئی بولیں "ایسے آدمی کے کمرے میں اتنی دیر لگاتے ہیں"

"اور ایسے آدمی کے کمرے میں ایک کنواری بچی کو زبردستی بھیجتے ہیں"۔ اسی انداز میں بنّو نے جواب دیا۔

"کیا کیا۔ کیا"۔ پھوپھی جان کے پیروں تلے سے زمین نکل گئی۔ وہ اس کا لال لال چہرہ دیکھنے لگیں۔

بنّو زور زور سے ہنسنے لگی۔ "ابھی جب میں نے یہ بات کہی تھی تو آپ نے کیسے مجھ پر غصہ جھاڑا تھا۔ بس ذرا انہوں نے کہا تھا میرا کمرہ ٹھیک کردے تو میں نے ٹھیک کر دیا۔ اور یہ کیا ہے تیرے ہاتھ میں۔ ـــ؟"

پھوپھی ماں یہ پُرانے رسالے ہیں"۔ اس نے جلدی سے بات بنائی۔ "زلفی بھیّا نے کہا ہے ردّی والے کو دے دینا"۔ پھر وہ اپنے کمرے کی طرف بھاگ گئی تاکہ ان سب کتابوں کو کسی مناسب جگہ چھپا دے۔

ادھر آہستہ آہستہ چائے پیتا ہوا زلفی سوچ رہا تھا کہ یہ نچلے متوسط طبقے کی لڑکیاں بھی عجیب مصیبت ہوتی ہیں۔ اُن کی اپنی الگ اقدار بنائی ہوتی ہیں۔ ہمیشہ کانچ کے گھروں میں رہتی ہیں۔ چار دیواری کے اندر ہی اپنے کو افلاطون سمجھتی ہیں۔ سب کی سب COMPLEXES کی ماری ہوئی ہوتی ہیں۔ بیمار ذہن، بیمار جسم رکھنے والی۔ شراب کے بارے میں انہوں نے جو کچھ بزرگوں سے سن رکھا ہو۔ یا کتابوں میں پڑھ رکھا ہو اسی پر ہی ایک کہانی بنالیتی ہیں۔ ذہن کے لئے اچھی خاصی مصیبت ہوتی ہیں یہ ـــ بہت گھن آتی تھی اسے اس قسم کے ماحول میں پلنے والی لڑکیوں سے۔

ایک ایسے ہی ماحول میں پلی ہوئی بچّہ بھی تھی۔ اس کی خالہ زاد اور پہلی بیوی۔ کس قدر غرور تھا اسے اپنے حسن و جمال پر۔ مگر ذہن تھا کہ چار دیواری سے باہر نہیں گیا تھا۔ زندگی اجیرن کر دی تھی اس نے حد بندی لائنیں کھینچ کھینچ کر ـــ مگر پھر اُس نے ایک اُونچے طبقے کی لڑکی کو بھی اپنایا تھا ـــ اُف خدایا۔ اس کا سر چکرانے لگا۔ اس کو احساس برتری نے عورت نہیں رہنے دیا تھا ـــ کیا عجیب مصیبت ہے یہ عورت ـــ پڑھ کر بھی جاہل رہتی ہے اور ہمیشہ لکیر کی فقیر بنی رہتی ہے۔ اور اگر زیادہ ڈھیل دے دو، تو مرد کے کندھے پر سوار ہو جاتی ہے۔ اس نے اپنا سر جھٹک دیا۔ اس فضول صنف کے بارے میں اس نے سوچنا ہی چھوڑ دیا تھا اور دُنیا میں کوئی عورت اب اُسے نہ لبھا سکتی تھی۔ پھر اس نے راستہ ہی ایسا اختیار کر لیا تھا کہ کوئی بھی شریف گھرانے کی لڑکی اس کی شریک حیات بننے کو تیار نہ تھی۔

آماں بی کے واپس آنے کی خبر سنی تو بنّو بہت بوکھلائی۔ کیسے مزے میں زندگی گزر رہی تھی۔ گوزلفی سے اس کے کچھ خوشگوار تعلقات نہیں تھے مگر اس لڑائی جھگڑے اور تنا کا جھانکی میں کتنا لطف آرہا تھا۔ کم سے کم اتنا سکون تو تھا کہ وہ اسے جی بھر کر تنگ کرتی ہے کہ وہ عاجز آجاتا ہے اور ان مظلوم عورتوں کا بدلہ لے رہی ہے جسے اس نے پامال کر کے چھوڑ دیا تھا۔ رات کو درز میں سے جھانکنے کا بھی بہت لطف آتا

تھا۔ کئی بار اس نے اُسے شراب پیتے ہوئے دیکھا تھا اور صبح کو اس کی نقلیں اتارا کرتی تھی۔

امّاں بی آ رہی تھیں۔ اور پھر زنداں کے احکامات سخت ہو جانے تھے۔ رات کو جب پھوپھی ماں سو گئیں۔ تو اس نے سوچا وہ پڑھے ہوئے رسالے بھی لوٹا آئے۔ اور ایک بار انہیں جی بھر کے تنگ کر آئے۔

دروازہ اندر سے بند تھا۔ سوراخ میں سے جھانکا تو وہ شراب پی رہا تھا۔ ایسے میں وہ اسے بلایا نہیں کرتی تھی، واپس لوٹ جاتی تھی۔ مگر آج ـــــ آج ہی تو رات تھی۔ اُس نے دروازے پر ہلکی سی دستک دی اور دروازہ کھل گیا۔ لال لال آنکھیں اور بکھرے ہوئے بال دیکھ کر ڈر گئی۔

"کیا بات ہے؟"

"یہ رسالے لوٹانے آئی ہوں۔"

"میں نے جو کہا تھا کہ پھینک دینا۔"

"یہاں بھی تو پھینک سکتی ہوں۔" اس نے کمرے کے فرش پر پھینک دیئے۔

وہ واپس جا کر اپنے پلنگ پر بیٹھ گیا۔

آج پھر اسے کوئی شغل نہیں ملا تو لڑنے آ گئی ہے۔ زلفی بدمزہ ہونے لگا۔ اور وہ جلد از جلد یہاں سے اس کو بھیجنا چاہتا تھا۔

"اب جاؤ"

"نہیں جاتی۔"

"اچھا بیٹھی رہو۔"

"بیٹھ جاؤں گی۔" وہ دہلیز پر بیٹھ گئی۔ وہ اس کے سامنے بیٹھا شراب پیتا رہا۔

"پتہ ہے آپ شراب پیتے ہوئے بہت برے لگتے ہیں۔ ایسے... ایسے... جیسے۔" وہ مثال دینے کے لئے الفاظ تلاش کرنے لگی۔

"تم سے کس نے کہا ہے مجھے شراب پیتے ہوئے دیکھو۔ جاؤ جا کر نماز پڑھو اس وقت

"میں تو بیٹھوں گی اور ضرور دیکھوں گی۔"

"پھر آ جاؤ یہاں میرے پاس بیٹھ کر پیو۔"

"تاکہ آپ مجھے پکڑ لیں۔"

زلفی زور زور سے ہنسنے لگا۔ حتیٰ کہ اسے اچھو لگ گیا۔

"ہاں میں جانتی ہوں۔ یہ مرد کس طرح عورتوں کو ورغلاتے ہیں۔"

"کس طرح ورغلاتے ہیں؟"

"جس طرح آپ مجھے ورغلا رہے ہیں۔"

"تم عورت ہو۔ اوہو مجھے تو پتہ ہی نہیں تھا۔"

"آپ اپنے ہوش میں نہیں ہیں۔"

"اسی لئے تو تمہیں اچھی طرح دیکھ رہا ہوں اور یہ بھی دیکھ رہا ہوں کہ چھٹانک بھر کی لونڈیا مجھے سبق سکھانے آ گئی ہے۔ تم بھی پی کے دیکھو۔ کیسی ہے یہ۔" پھر وہ شرارت سے بولا۔

"اللہ میری توبہ۔ میں تو پھڑک کر مر جاؤں جو اس کو ہاتھ لگاؤں۔ اچھا یہ بتائیں۔ شراب پی کے بدمعاشی کرنے کو کیوں دل چاہتا ہے؟"

"کیوں کیا تمہیں تجربہ ہے؟"

"تجربہ تو نہیں بھئی فلموں میں دیکھتے ہیں۔ کتابوں میں پڑھتے ہیں۔"

"ہاں سستی فلموں اور سستی کتابوں میں یہ سب کچھ لکھا ہوتا ہے۔ میرا دل تو شراب پینے کے بعد رونے کو چاہتا ہے۔"

"کیوں بھلا؟"

"پتہ نہیں کیوں۔" وہ اُداسی سے بولا۔ "شاید فریب کے وہ سب پردے چاک ہو جاتے ہیں جو شعوری طور پر ہم زندگی پہ ڈالے رہتے ہیں۔"

"اچھا تو آپ آپ یہ بتانا چاہتے ہیں کہ آپ کو بھی کوئی دکھ ہے۔ جو کئی لوگوں کے دکھوں کا سبب بن چکے ہیں۔"

"تم کیا جانو۔؟" اس نے ایک اور گلاس بھرا اور منہ کے ساتھ لگا لیا "جاؤ جا کر فلمی رسالے پڑھو اور خود کو فلمی ہیروئن تصور کر کے خواب دیکھتی ہوئی سو جاؤ۔"

"اللہ اب ایسی نادان بھی نہیں ہوں میں۔"

"خدا کے لئے میری جان چھوڑ دو اور یہاں سے چلی جاؤ۔ میں تنہا رہنا چاہتا ہوں۔ بالکل تنہا۔"

"اور میں کونسا زندگی بھر کا ساتھ مانگ رہی ہوں۔ ذرا کی ذرا بیٹھی ہوں پھر چلی جاؤں گی۔ کیا خبر کل کے بعد آپ میری شبیہہ بھی نہ دیکھیں۔"

"کتنی اچھی بات ہوگی۔" اُس نے کہا۔

"کیوں۔ کیا میں اتنی بُری ہوں۔" وہ اداسی سے بولی۔

"کچے ذہن کی بچی ہو۔ فضول باتیں زیادہ کرتی ہو۔ تمہاری بک بک بھی میں اس لئے برداشت کر لیتا ہوں کہ خالہ اماں نے مجھے یہاں جگہ دی ہے۔ ورنہ تمہاری عمر کی لڑکیوں کی مجال نہیں جو میرے ساتھ تکرار کریں اور نہ میں عورت ذات کو کچھ سمجھتا ہوں۔"

"جی ہاں۔ اور دنیا کی ساری عورتیں تو شاید آپ کے فراق میں مری جا رہی ہیں۔ آپ بھی کوئی ایسے دل کو لبھانے والے نہیں ہیں کہ کوئی آپ کو اپنا آئیڈیل سمجھ لے۔ ایک لفنگے اور آوارہ آدمی کو کوئی لڑکی پسند نہیں کرتی۔"

"پھر اس کے کمرے میں کیوں آ کر بیٹھ جاتی ہے؟"

"یونہی میں نے سوچا ذرا آپ کو راہ راست پر لانے کی کوشش کروں گی۔"

"اوہو! تو آپ مجھے راہ راست پر لانے کی کوشش فرما رہی ہیں۔" زلفی زور زور سے ہنسنے لگا۔ "بھئی واہ۔ قاضی جی کیوں دُبلے شہر کے اندیشے میں۔ اگر میں راہ راست پر آ بھی جاؤں تو تمہیں کیا حاصل ہوگا۔"

"خوشی ہوتی ہے نا کوئی نیک کام کر کے۔"

"بچی تم ابھی ہینڈ کُلیا کے متعلق سوچا کرو۔ اتنے بڑے بڑے کاموں کا مت سوچو۔ جو تم سے کئے نہ جا سکیں۔"

"اللہ زلفی بھائی۔ اگر آپ شریف آدمی بن جائیں تو بہت اچھے لگیں گے۔"

"میں اچھا لگ کے کیا کروں گا۔"

"ممکن ہے آپ کو کوئی اچھی سی سکھ پہنچانے والی بیوی بھی مل جائے۔"

"بیوی کی طرف سے سکھ میرے نصیب میں نہیں ہے۔" یہ کہہ کر وہ اور بھی اُداس ہو گیا۔ اس نے میز پر پڑا گلاس خالی کیا اور پھر اس خالی گلاس کو خالی خالی نظروں سے دیکھنے لگا۔ ایسی کیفیت ہو گئی اس کی کہ بنو کو اُس سے ڈر لگنے لگا۔

"زلفی بھائی۔ اے زلفی بھائی۔" اس نے دو تین بار پکارا۔ مگر اس نے بنو کی طرف نہیں دیکھا۔

بیٹھے بیٹھے اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ پھر وہ آنسو اس نے خود ہی پی لئے۔ اور بڑی گمبھیر آواز میں بولا۔ "اپنی ذات میں ہر شخص تنہا ہے۔ رُوح کی یہ تنہائی کبھی دُور نہ ہوگی۔ کبھی نہیں ـــــ کبھی بھی نہیں۔ شراب تو اک بہانہ ہے زخموں کو چھیڑنے کا۔ باقی دنیا داری کی باتیں ہیں۔ کون سمجھے گا؟" جیسے وہ اپنے آپ سے ہی بولا۔

"کیا کہہ رہے ہو زلفی بھائی! میں تو کچھ سمجھی نہیں۔"

"اور میں تمہیں کب سمجھا رہا ہوں۔" اس نے عاجز آ کر نگاہ اٹھائی۔ "خدا کے لئے تم چلی جاؤ۔ آخر تمہارا یہاں آنے کا کیا مقصد ہے۔ دُنیا میں تنگ کرنے کے لئے تمہیں کوئی نہیں ملتا۔"

"اچھا مجھے یہ بتائیں آپ راتوں کو اُٹھ کر کہاں جاتے ہیں اور دیر سے کیوں لوٹتے ہیں؟"

"یہ میرے ذاتی معاملات ہیں۔"

"میں جانتی ہوں آپ کہاں جاتے ہیں۔"

وہ خاموش بیٹھا رہا۔

"آپ ضرور طوائف کے کوٹھے پر جاتے ہوں گے۔"

"پھر وہی لایعنی بک بک شروع ہو گئی۔"

"سچ سے آپ بہت گھبراتے ہیں۔ مجھے پتہ ہے اپنی شریف بیویوں کو ٹھکرا کر مرد ہمیشہ کوٹھے سجا دیتے ہیں۔ پتہ نہیں ان غلیظ مکروہ عورتوں میں انہیں کیا ملتا ہے۔ حالانکہ انہیں اچھی طرح پتہ ہوتا ہے کہ یہ ہر رات نئے مرد کی دلہن بنتی ہیں اور جو ناز و انداز اور عشوے و غمزے اسے دکھا رہی ہے۔ اس سے پہلے کئیوں کو دکھا چکی ہے اور اس کے بعد کئیوں کو دکھائے گی۔ اس کے باوجود اس کے سحر میں اسیر ہو جاتا ہے۔ اور اُس کی ایک ایک ادا کی قیمت ادا کرتا ہے۔ بکی ہوئی۔ مسلی ہوئی۔ پامال کی ہوئی۔ ذلیل سے ذلیل تر مرد کے ہاتھوں روندی ہوئی عورت کی پوری پوری قیمت چکاتا ہے اور اس کا شکوہ بھی نظر آتا ہے۔ اور اپنی بیوی سے ——

"بکواس بند کرو بنو!" وہ زور سے چیخا۔

"اور اپنی شریف النفس بیوی سے ذرا سا بھی قصور ہو جائے تو اسے معاف نہیں کرتا۔ کوئی اس کی طرف بُری نگاہ سے دیکھ لے تو اُسے طلاق دے دیتا ہے۔ ذرا سا ننگا پیٹ نظر آجائے تو مار مار کے کھال اُدھیڑ دیتا ہے۔ وہ بن ٹھن کر نکلے تو محض یاروں کو دکھانے کے لئے نکلتی ہے۔ ذرا محفل میں ہنسی نکل جائے تو بدکرداری کی علامت ہوئی۔ یہ ہے آوارہ مردوں کا دوغلا پن . . . کمینوں کو سر پر بٹھاتے ہیں اور شریف عورت کو جوتے کی نوک پر!"

"ہاں اگر شریف عورت ہو تو" وہ بھاری اُداس آواز میں بولا۔

"سبھی عورتیں شریف ہوتی ہیں۔ آپ اُن کو بُرا راستہ اختیار کرنے پر مجبور کرتے ہیں۔ اگر کوئی شریف عورت بدسلیقہ ہے۔ پھوہڑ ہے۔ بدزبان ہے تو آپ اس عیب کی قیمت پر اس کی شرافت نہیں قبول کرتے۔ بلکہ اس کی پوری پوری سزا دینے کے لئے کبھی کسی جسم فروش کی گود میں جا چھپتے ہیں۔ اور بہانہ کرتے ہیں کہ میری عورت زبان دراز ہے اس لئے میں اس سے خوش نہیں ہوں۔ کیا وہ عورتیں جو ذرا کی ذرا آپ کو تسکین دیتی ہیں بڑی باہنر اور بے عیب ہوتی ہیں۔ کیا ان کے مزاج میں کرختگی نہیں ہوتی۔ وہ پھوہڑ بدسلیقہ نہیں ہوتیں۔ اُن میں بھی یہ سب خامیاں ہوتی ہیں۔ مگر ذرا کی ذرا وہ بن ٹھن کر خوش اخلاقی کا مجسمہ بن کے آپ کی آغوش میں آبیٹھتی ہیں۔ بھئی اُن کو پتہ ہوتا

ہے کہ اس ایک لمحے میں جو بھی نکالنا ہو اس کی جیب سے نکال لیں۔ اور وہ یہ بھی جانتی ہیں کہ یہ مرد اپنی وفاشعار بیویوں سے اُکتا کر یہاں آتے ہیں۔ اُن کو اس طرح خوش کرنا چاہیئے کہ بیویوں کو بھولے ہی رہیں۔ اسی لئے وہ اپنی زندگی کا سارا زور مرد کو پھانسنے ہی میں لگا دیتی ہیں اور مرد ایسا اُلّو کا پٹھا ہے۔ سمجھ بیٹھتا ہے، آہا کتنی شاندار عورت ہے؟ ہاں جس عورت کو مرد پھانسنے کے گُر آتے ہیں۔ وہ آپ کو شاندار لگتی ہے اور جو صرف ایک مرد کے نام پر اپنا حسن اور جوانی لگا دیتی ہے۔ اس کا ذرا سا عیب، ذرا سی چوک اس کو زندگی بھر کے لئے آپ کی نظروں سے گرا دیتی ہے۔ ذرا ان حرافہ عورتوں کو بیویاں بنا کے رکھو۔ تو آپ مردوں کو پتہ چل جائے کہ وہ بھی صرف دُور سے سہانی لگتی ہیں۔ قریب رکھنے سے اُن سے ایسی بو اُٹھتی ہے جس میں سانس بھی نہیں لیا جا سکتا۔

"بنو . . . بنو . . ." یکایک زلفی کے ہاتھ سے جام چھلکنے لگا۔ بنو کو پلنگ کے موڈھے میں دیکھ کر اس نے نیا جام بھرا تھا اور یہ سوچ کر کہ لڑکی بکواس کرتی جائے گی، وہ دھیرے دھیرے پینے لگا تھا پھر نہ جانے کیوں بنو کی باتیں اسے تکلیف دینے لگیں۔ "بنو . . ." اس نے گھونٹ نگلا اور تہدیدی نظروں سے اسے گھورنے لگا۔

"اے جی! میں آپ کے گھورنے سے نہیں ڈرتی اور سچ بھی ضرور کہوں گی۔ مجھے بگڑے ہوئے بے راہ رو مرد بہت بُرے لگتے ہیں۔ دل چاہتا ہے جوتے مار مار کر ان کا چہرہ بگاڑ دوں۔ ایک اچھی خاصی عورت کو بگاڑ دیتے ہیں۔ اور ایک مسخ کی ہوئی عورت کو سنوارنے میں اپنا دھن اور وقت لگاتے ہیں۔ جتنی محبت اور چاہت سے آپ اس بازاری عورت کے قریب جاتے ہیں۔ کبھی اپنی عورت کے قریب جا کر تو دیکھیں۔ کتنی خوش طبع اور شکر گزار نظر آئے گی۔ اس کے لئے تو آپ کے پاس صرف پھٹکار ہے۔ وقت نہیں ہے وہ ہمیشہ لڑاکا، فضول اور بے ہودہ نظر آتی۔ اس کو پہننے اوڑھنے کا ڈھنگ نہیں آتا۔ وہ بچوں میں گھری رہتی ہے۔ بھئی اس کو بچے کیوں دیتے ہو تم لوگ ——؟"

زلفی اچانک زور زور سے ہنسنے لگا۔

"ہاں ہاں۔ سنبھال کے رکھا کرو نا اپنی بیویوں کو اپنے نفس کا نشانہ بھی نہ بنایا

"واہ۔!" بنّو فرش پر سے کھڑی ہو گئی۔ "میرے ساتھ بدتمیزی سے پیش آ کر تو دیکھیں۔ میں آپ کی بیوی نہیں ہوں کہ خواہ مخواہ آپ کا رعب مان لوں گی۔ اینٹ کا جواب پتھر سے دوں گی۔"

"اچھا جاؤ اب جا کر آرام کرو۔ تمہیں شاید کوئی اور نہیں ملتا گھر میں۔ جب دیکھو میرے سر پر چڑھی ہے۔ خدایا یہ کس جرم کی سزا ہے۔" اُس نے بے بسی سے کہا۔

"سزا۔ سزا تو ابھی آپ کو ملے گی دیکھتا جا ہی۔"

"بنّو۔" وہ زور سے چیخا۔ "خدا کے لئے چلی جاؤ یہاں سے۔ دُنیا میں کسی اور آدمی کو اس فضول منطق کے لئے ڈھونڈ لو۔ میرے کمرے سے فوراً چلی جاؤ۔" وہ کھڑا ہو گیا۔ ورنہ میں تمہیں ابھی پکڑ کر پھوپھی اماں کے پاس لے جاؤں گا۔"

"پکڑ کر تو دیکھو۔ ہاتھ لگا کر تو دیکھو۔" وہ ڈر کے مارے پیچھے بھی ہٹتی جاتی تھی۔ اور اسے تنبیہہ بھی کرتی جاتی تھی۔ وہ بھی غرّا کر اُس کے قریب آ رہا تھا۔

"اگر تمہارا خیال ہے کہ تم مجھے امپریس کر لو گی تو غلط ہے۔ میں اس طبقے کی بیہودہ اور نیم خواندہ لڑکیوں پر لعنت بھیجتا ہوں۔ جو خواہ مخواہ انٹیلیکچوئل بننے کی کوشش فرماتی ہیں اور زیادہ بیوقوف نظر آتی ہیں۔"

"میں بھی۔" وہ تقریباً روتے ہوئے بولی۔ "آپ جیسے مرد پر تھوکتی بھی نہیں۔"

توبہ کس قدر توہین آمیز لہجہ تھا اُس جنگلی کا۔ بنّو کو اپنی بے حد توہین محسوس ہوئی۔ تبھی تو اُس نے اتنی بڑی بات کہہ دی۔

"جاؤ۔ جاؤ۔" قریب آ کر اُس نے زور سے بنّو کو دھکا دیا۔ بنّو کا سر سیڑھیوں کی دیوار سے ٹکرایا۔ وہ سنبھلی اور سرپٹ نیچے کو بھاگی۔ "خبردار پھر کبھی ادھر کا رُخ کیا۔" اسے بہت چڑھ ہو رہی تھی۔ وہ لڑکھڑا رہا تھا۔ وہ تو سکون حاصل کرنے کے لئے تنہا بیٹھ کر پیا کرتا تھا۔ آج اتنی پی لی مگر سکون نہیں ملا۔ چھٹانک بھر کی چھوکری نے تلخی کو اور بھی بڑھا دیا۔ توبہ۔ یہ گھٹے گھٹے ماحول میں پلنے والی —— محرومیوں کی ماری ہوئی لڑکیاں بھی عجیب مصیبت ہوتی ہیں۔ اس نے اپنا سر تھام لیا۔ سیڑھیوں میں

۔ اور بچّوں کا مطالبہ بھی نہ کیا کرو۔ پھر وہ بھی ہمیشہ جوان رہے گی۔ اس کے علاوہ اسے ناز و انداز سکھانے کے لئے مختلف مردوں سے بھی ملاتے رہا کرو۔ گھاگ ہو جائے گی وہ ۔۔ ؛

"بنّو۔ اب تم زبان بند کرو اور چلی جاؤ۔" زلفی نے گمبھیر آواز میں کہا۔

"میں تو کہوں گی اور سب کچھ کہوں گی اور اگر بچاری بیوی میں سے ایک دو سال بچّہ نہ ہو تو مرد اُسے طعنہ دیتا ہے۔ گھر سے نکل جانے کی دھمکیاں دیتا ہے۔ دوسری شادی پر آمادہ نظر آتا ہے۔ وہ ان کے لئے بچے بھی جنے۔ گھر کی دیکھ بھال بھی کرے۔ جوتیاں بھی کھائے۔ اور پھر بھی جوان رہے۔ کیا خوب۔ ؟ صرف آوارہ عورتیں ہی ہمیشہ جوان اور خوبصورت رہتی ہیں۔ انہیں اپنے چہرے اور جسم کی کمائی جو کھانی ہوتی ہے ؟"

زلفی پھر ہنسنے لگا۔ "اچھا یہ تو بتاؤ بنو! یہ اتنی ڈھیر ساری باتیں تمہیں کس نے بتائی ہیں ؟"

"کیا میرا ذہن نہیں ہے ؟ میں پڑھی لکھی ہوں۔ سب سمجھتی ہوں۔"

"اس چار دیواری سے باہر نکل کر تو تم نے دیکھا نہیں۔ ایسے ہی بڑھ بڑھ کر باتیں بنا رہی ہو۔"

"اُس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ میں تعلیمیافتہ ہوں۔ کتابیں پڑھتی ہوں۔ ذہن رسا رکھتی ہوں۔ اس دُنیا میں رہتی ہوں۔ کان اور آنکھیں کھلی رکھتی ہوں۔ بتایئے تو میں نے کوئی بات جھوٹ کہی ہے ؟"

"اچھا اب تم چلی جاؤ۔ تم نے مجھے بہت بور کیا ہے۔"

"ظاہر ہے اگر میں کوئی چھنال ہوتی۔ آوارہ لڑکی ہوتی۔ بن ٹھن کر آپ کو پیار اور سے لبھا رہی ہوتی تو مجھے آپ زمین پر بٹھانے کی بجائے اپنی گود میں بٹھاتے۔"

اس بات پر پھر زلفی کو زور سے ہنسی آ گئی۔

"آپ اس طرح میرا مذاق نہ اڑایا کریں زلفی بھائی۔" وہ غصّے سے بولی۔

"میں ایک بے وقوف بچّی سمجھ کر تمہیں معاف کر دیتا ہوں ورنہ ایک چانٹے میں (تمہاری) طبیعت درست ہو سکتی ہے۔"

جھانک کر دیکھا تو وہ کمبخت جا چکی تھی۔

بنّو جلدی جلدی نیچے اتر گئی ـــ رضائی میں گھس کر خُوب روئی ـــ خوب روئی ـــ کتّا ـــ کمینہ ـــ اُلّو کا پٹھا ـــ حرام زادہ ـــ گالی پہ گالی دیئے گئی وہ ـــ اندھا کہیں کا ـــ ایک دن جو مہربانی سے بولا ہو ـــ میری جُوتی کو اس کی پرواہ نہیں ـــ لفنگا کہیں کا ـــ ایسے ہی مَیں ہمدردی میں ماری گئی ـــ ایسے لوگوں کے ساتھ ہمدردی کرنی ہی نہیں چاہیئے۔

جانے وہ کب تک سسکتی ـــ دل سے عہد کرتی سو گئی۔

دوسرے دن زلفی ایک ہفتے کے ٹور پر چلا گیا تھا ـــ اور کچھ دنوں بعد اماں بی آگئیں۔ اماں بی کے آنے سے گھر میں چہل پہل شروع ہو گئی تھی۔ سارے محلّے سے اُن کا ملنا ملانا تھا۔ کوئی نواسے کی مبارکباد دینے چلا آرہا تھا۔ کوئی حال پوچھنے آرہا تھا۔

لیکن اماں بی کو اچانک محسوس ہُوا کہ لوگوں کے رویّے میں ایک عجیب سا فرق آگیا ہے۔ ہر کوئی جو انہیں ملتا ہے انہیں عجیب سی نظروں سے دیکھتا ہے یعنی کچھ کہنا بھی چاہتا ہے ـــ اور کچھ کہتا بھی نہیں۔

پھر اماں بی نے سوچا ممکن ہے میرا خیال ہی ہو۔ ایک مہینے میں کچھ میرا ہی خیال بدل گیا ہوگا۔ یہ تو ایک روز وہ مریم کے ہاں پُرسے کو گئیں۔ کیونکہ اُن کے پیچھے ہی اس کی ساس فوت ہو گئی تھی تو وہاں محلّے کی اور بھی عورتیں جمع تھیں۔

خالہ امینہ اُٹھ کر آگئی۔ اِدھر اُدھر کی باتوں کے بعد بولی۔ "اے کہیں بنّو کی بھی بات کی یا نہیں؟"

"نہیں بہن۔ ابھی تو پاس بھی کچھ نہیں کہ دے کر جلدی سے رخصت کر دوں۔"

"لڑکا ڈھونڈ لیا گیا ـــ؟" انہوں نے سرد لہجے میں کہا۔

"نہیں تو بہن۔ کوئی اچھا رشتہ ابھی نظر ہی نہیں آیا۔"

"لے۔ لڑکا ڈھونڈنے کی کیا ضرورت ہے ـــ؟" خالہ رضیہ، خالہ امینہ کو آنکھ

مار کے ذرا آگے آگئی۔

"کیا مطلب ـــ" اماں بی نے کہا ـــ "وہ ـــ ایک لڑکا تمہارے گھر میں بھی تو رہتا ہے۔"

اماں بی کو ایک دم غصہ آگیا۔ مگر انہوں نے اپنا غصہ پیا اور بڑی نرمی سے بولیں۔

"اے وہ کوئی لڑکا تو نہیں۔ اچھی عمر کا آدمی ہے۔ میرا دور پار کا عزیز ہے۔ کچھ جوڑ بھی ہو لڑکی کا۔ لوگ کیسے بنا سوچے سمجھے بات کہہ جاتے ہیں۔"

چچی زینب بولی۔ "بھئی ہمیں کیا معلوم۔ سُنا تھا تم نے بنّو کی سگائی اس سے کر دی ہے۔"

"ایسی بے پَر کی کس نے اڑائی ـــ ہے" انہوں نے ساری محفل کو ناگواری سے دیکھا۔

"بھئی تمہارے گھر سے ہی کوئی بات نکلی ہوگی نا ہے" چچی زینب بھلا کہاں چُپ رہنے والی تھی۔

"لو اور سُنو! میں تو ایک مہینے بعد لائلپور سے آئی ہوں۔"

"تمہیں کیا معلوم ایک مہینے میں کیا کچھ ہو سکتا ہے۔" دادی فاطمہ نے آنکھیں جھپکاتے ہوئے کہا۔

"ہوں" اماں بی کی زیرک نظر تاڑ گئی کہ محلّے والوں نے کسی رائی کا پہاڑ بنا لیا ہے لیکن اس وقت بڑی خوش اخلاقی سے بولیں۔ "ایسی کوئی بات نہیں ہے بہن! جب بھی بیٹی کی سگائی کروں گی۔ آپ سب کو ضرور بلاؤں گی۔ ہمسائیگی سے بڑھ کر کون سا ناطہ ہوتا ہے۔"

"لے ہم بھی یہی کہہ رہے تھے کہ ہمیں بتائے بغیر کیسے کر سکتی ہے ہ" خالہ رضیہ نے کہا۔ "بھئی بُرا نہ ماننا ہم نے تو یہ بھی سنا ہے کہ یہ تمہارا کرایہ دار یا بھانجا کچھ اچھا آدمی نہیں ہے۔ دو بیویوں کو طلاق دے چکا ہے۔ شراب پیتا ہے۔ رات کو دیر سے آتا ہے۔ دیکھنا کہیں بیٹی کی قسمت نہ پھوڑ دینا۔ بھئی ہم بھی بیٹیوں والے ہیں۔ اچھا ہی

مشورہ دیں گی۔"

"شکریہ بہن" بی اماں نے لٹکے ہوئے منہ سے کہا۔ "ہمارا تو ایسا کوئی ارادہ ہی نہیں اور نہ ایسا قیامت تک ہو سکتا ہے۔" بی اماں نے چادر اوڑھی اور باہر نکل آئیں۔

بڑی سیانی تھیں۔ سارا راستہ ہی سوچتی آئیں کہ ضرور گھر میں کوئی بات معمول کے خلاف ہوئی ہے۔ گھر میں ذرا سی بے احتیاطی۔ محلّے میں افسانوں کو جنم دیتی ہے۔ یوں اماں بی نے خود بھی کبھی کسی کو معاف نہیں کیا تھا۔ جلدی دوسرے کا عیب پکڑ لیتی تھیں، اس لئے محلے والوں کو بدلہ لینے کا موقعہ مل گیا تھا۔ اماں بی خوب جانتی تھیں۔ اور سوچ رہی تھیں۔ جانے یہ کس جُرم کی سزا ہے۔ اور کس طرح ملے گی ہ مگر ان کے فرشتوں کو بھی علم نہ تھا کہ شریفاں جس دن شراب کی بوتلیں جھولی میں بھر کر لے گئی تھی۔ وہ سیدھی زینب چچی کے ہاں گئی۔

"اے یہ کیا گٹھڑ اُٹھائے پھرتی ہے شریفاں" اس نے حسب معمول قریب آکر گٹھڑ کو ٹھوکر ماری۔

"بی بی خالی بوتلیں ہیں"

"اتنی خالی بوتلیں تجھے اس زمانے میں کس نے دیں ہ"

"اے بی بی بس لے آئی ہوں" وہ کھسیائے ہوئے انداز میں ہنسی۔

"لا کھول گٹھڑ۔ دو چار مجھے دے دے۔ اور پیسے لے لے۔ مجھے ضرورت ہے۔"

"بی بی یہ آپ کے کام کی بوتلیں نہیں۔"

"ہاں تو کیسی بوتلیں ہیں ہ" یہ کہتے ہی خود زینب چچی نے اس کا گٹھڑ کھول دیا۔

"اے یہ اتنی شراب کی بوتلیں کہاں سے لائی ہے ہ محلے میں کون ہے اتنا بڑا شرابی!"

"بی بی مجھے تو بنّو بی نے دی ہیں۔ ہ"

"ہیں بنّو نے ـــ ہ" اب تو اچھی طرح کریدنا اس کا فرض بن گیا تھا ـــ "بنّو نے کہاں سے لیں ہ"

"وہ جو ـــ اُن کا رشتہ دار وہاں رہتا ہے نا اس کی الماری سے۔"

"بنّو وہاں اس کے کمرے میں جاتی ہے؟"

"جاتی ہے ـــــ وہ تو وہیں رہتی ہے۔ میرے ساتھ ہی مل کر صفائی کراتی ہے۔"

"اور اُس نے خود تمہیں یہ بوتلیں دیں؟"

"ہاں کہہ رہی تھی خالی ہیں۔ تم لے جاؤ۔ بیچ کر کوئی چیز لے لینا۔"

"تو بنّو کو معلوم ہے وہ شراب پیتا ہے؟"

"اے بی بی وہ سب جانتی ہے بچی تو نہیں۔"

"کیا بنّو بھی اس کے ساتھ پینے لگی ہے؟"

"اللہ ہی جانے ـــــ؟"

"آخر اس نے بنّو کو اختیار دیا ہوگا تو وہ اس کے کمرے کی چیزیں اُٹھاتی ہے۔"

"اے جی۔ اس نے تو مجھے عطر کی خالی شیشیاں بھی دی تھیں۔ یہ بڑی بڑی ولایتی شیشیاں ـــــ"

"سچ مچ ـــــ اور کچھ بتا ـــــ"

"کیا بتاؤں بی بی۔ وہ تو اتنے پیار سے اس کی ایک ایک چیز جھاڑ کر رکھتی ہے۔ جیسے ـــــ بس کیا بتاؤں۔ کتابیں رکھے تو بنّو ـــــ کپڑے سجائے تو بنّو ـــــ جوتے پالش کرے تو بنّو ـــــ ایک پُرانے جوتوں کا جوڑا ابھی میرے خصم کے لئے دیا۔"

"ہوں تو یہ بات ہے۔ اور وہ بڑھیا واپس آئی کہ نہیں۔"

"ابھی تو نہیں آئی۔"

"ہاں بیٹی کو موقع دے کر چلی گئی۔ جب اچھی طرح پھنسا لے گی تو پھر آئے گی۔"

بس یہاں سے بات نے سفر کرنا شروع کیا۔ اور محلّے کے ہر گھر میں خود بخود پہنچتی گئی۔ ہاں اتنا ضرور ہُوا کہ کئی گھروں نے شریفاں سے تصدیق چاہی اور شراب کی بوتلوں کی بات اُس نے ہر ایک کو صاف صاف بتا دی۔ حتیٰ کہ کالو کباڑیئے کو بھی۔ جو اس کے پاس ولایتی شراب کی اتنی بوتلیں دیکھ کر حیران رہ گیا تھا۔

پھر تو ان کے گھرانے پر نظر رکھی جانے لگی۔ بنّو کے طور طریق سب کو بدلے ہوئے

لگے۔ حتیٰ کہ اس کا گول مول سا بھرا بھرا جسم بھی پہلے سے پھیلا پھیلا لگا۔

اماں بی غصّے سے کھولتی گھر پہنچیں۔ اور آتے ہی پھوپھی اماں کو پکارا۔ "اے مہر و بی ـــــ ادھر تو آنا ذرا۔" آج بھاوج کے تیور اور تھے نند ڈر گئی۔

"سچ سچ بتانا۔ میرے پیچھے کیا بات معمول کے خلاف ہوئی تھی؟"

معمول کے خلاف ـــــ کچھ بھی تو نہیں ـــــ"

"یاد کرو مہر و بی ـــــ یاد کرو ـــــ بنّو نے کچھ ایسی ویسی حرکت تو نہیں کی۔"

"بنّو تو میری آنکھوں کے سامنے رہی ـــــ بلکہ میں نے کسی سہیلی کے ہاں بھی اسے نہیں جانے دیا ـــــ" وہ کچھ یاد کرتے ہوئے بولی۔

"اور زلفی نے تو کچھ ایسی حرکت نہیں کی ـــــ؟"

"نہیں تو ـــــ" ہاں پھوپھی اماں کو یاد آیا۔

انہوں نے بڑی سادگی سے بتا دیا ـــــ کہ ایک تو بنّو شریفاں کے ساتھ اس کے کمرے کی صفائی کروا دیتی تھی ـــــ اور دوسرے ـــــ وہ جس دن بیمار تھا، اور بنّو چائے دینے گئی تھی۔

"اس کے علاوہ تو کچھ نہیں ہُوا ـــــ؟"

"تمہیں معلوم ہے یہ شریفاں بڑی حرّافہ ہے ـــــ جا کر دیکھو سارا محلّہ کیا کہہ رہا ہے؟"

اور جب اماں بی نے محلّے والیوں کے چھوٹے چھوٹے کچوکے بیان کئے تو پھوپھی اماں کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔

"کیا کیا جائے ـــــ" دونوں سر جوڑ کر بیٹھ گئیں۔ زلفی کو نکال نہ سکتی تھیں۔ سال کا کرایہ ایڈوانس لیا تھا ـــــ وہ بھی سُنار کو دے دیا تھا ـــــ اور ابھی دو مہینے باقی تھے۔

ابھی وہ اسی ادھیڑبن میں تھیں کہ کیا کریں ـــــ کہ افواہیں محلّے میں، جنگل کی آگ کی طرح پھیلتی گئیں ـــــ روز کوئی نہ کوئی نئی بات اماں کے کانوں تک پہنچتی۔ کچھ بیچ میں خیر خواہ بھی تھے ـــــ جو اماں کو آ کر بتا دیتے تھے۔ اب تو جب اماں

باہر نکلتیں تو ایسے لگتا جیسے ہر مرد اور عورت ان کو طنزیہ نظروں سے دیکھ رہا ہے۔ ان کا مذاق اڑا رہے ہیں۔

آماں کے اندر ہر وقت لاوا پکتا رہتا ـــ کبھی اس وقت کو کوستیں جب انہوں نے زلفی کو گھر کرانے پر دیا تھا ـــ اپنی کوری بچی کے دامن پہ داغ لگا لیا۔ اور کبھی دل چاہتا بنو کا منہ گھونٹ دیں ـــ سرکشی اس کی فطرت میں تھی ـــ جس کمبخت کی شادی کرنے کی خاطر آماں بی نے یہ زہر پیا تھا اسی کی راہ میں زلفی بہت بڑی رکاوٹ بن کر کھڑا ہو گیا تھا ـــ بہت دن سوچنے کے بعد ـــ آماں بی اور پھوپھی آماں پھر سر جوڑ کر بیٹھ گئیں ـــ اور انہوں نے یہی مناسب جانا کہ یہ محلہ چھوڑ دیں ـــ ورنہ بنو کی بارات یہاں سے کبھی نہ اٹھ سکتی تھی ـــ اول تو کوئی ڈھنگ کا رشتہ ہی نہیں آ رہا تھا ـــ اور اگر کوئی رشتہ مناسب مل جاتے ـــ مگر افواہیں سن کر لوٹ جائے، تو اور بھی برا ہوگا ـــ اس کا مطلب ہے بنو ساری زندگی کنواری بیٹھی رہے گی۔

آماں بی اور پھوپھی آماں نے خفیہ میٹنگ کرنے کے بعد ـــ یہی فیصلہ کیا کہ وہ یہ محلہ چھوڑ جائیں۔

"نچلا حصہ بھی کرائے پر دے دو بھابی ـــ" پھوپھی آماں نے مشورہ دیا تھا "اس طرح کچھ اور پیسے بھی جمع ہو جائیں گے اور ہم کسی اور محلے میں منتقل ہو جاتے ہیں۔ اور کوشش کرے جلد بنو کی شادی کر دیتے ہیں۔"

"ہاں ٹھیک ہے ـــ" اماں بی نے کہا "تم اپنی اس اسٹیشن والی سہیلی کے پاس جاؤ اور اس سے کہو، اس طرف ہمیں کوئی سستا سا مکان ڈھونڈھ دے، دیکھو ڈیڑھ دو سو سے زیادہ کرایہ نہ ہو ـــ ورنہ ہمارے ہاتھ میں کوئی پیسہ نہ بچے گا۔"

"ٹھیک ہے ـــ" پھوپھی آماں نے برقعہ سر پر لیا اور باہر نکل گئیں۔

دوسرا کام آماں بی نے یہ کیا کہ ایک دور کے محلے کی نائن کو سو روپے ایڈوانس دے کر کہا۔ دو چار مہینوں میں بنو کے لئے مناسب رشتہ ڈھونڈھ دے۔ تو اس کو منہ مانگی رقم دیں گی۔

پھوپھی آماں روز برقعہ پہن کر اسٹیشن کی طرف نکل جاتیں۔ وہاں سے اپنی سہیلی

کو ساتھ لیکر مکان ڈھونڈا کرتیں۔ آماں نے تو یہاں تک کہہ دیا تھا کہ اگر کوئی اچھا سا کوارٹر ہی مل جائے تو ہم یہ جگہ چھوڑ دیں گے۔ اور خود گھر پر سارا دن بنو کا پہرہ دیتیں ـــ زلفی کا وہی معمول تھا۔ کبھی دورے پر چلا جاتا۔ کبھی یہاں ہوتا ـــ جس دن سے بنو زلفی کی ڈانٹ کھا کر آئی تھی پھر اس نے خود ہی اس کا راستہ چھوڑ دیا تھا۔ ایسے بے ہودہ آدمی کے منہ لگنے کا کیا فائدہ ـــ؟ پھر آماں بی کی نظر بھی تو عقابی تھی۔

لیکن آماں بی جس طرح اسے آج کل دیکھتی تھیں۔ اس کی جان ہی تو نکل جاتی۔ بات بات میں یونہی غصہ دکھائے جاتیں۔ ذرا سی غلطی پر لعنت ملامت شروع کر دیتیں۔

آماں بی اندر ہی اندر اس پر پیچ و تاب کھاتی رہتی تھیں۔ ان کا بس نہیں چلتا تھا کہ اسے کچا چبا جائیں۔ وہ شراب کی بوتلوں والی بات بھی انہوں نے شریفاں سے پوچھ لی تھی ـــ اور وہ یہ بھی جانتی تھیں کہ بنو کا کوئی قصور نہیں ہے ـــ آج کل وہ اس پر کڑی نگاہ رکھتی تھیں ـــ کچھ بھی تو گھر میں نہیں ہو رہا تھا۔ پھر بھی انہیں بنو پر اس کے لاابالی پن پر غصہ آیا رہتا۔ اس نامراد کو کیا پتہ کیا اٹھتی جوانی میں اگر بدنامی کا ایک چھینٹا بھی بدنصیب لڑکی کے دامن پر پڑ جائے تو اس کی ساری زندگی جہنم بن جاتی ہے۔ لڑکی ذات تو کانچ ہوتی ہے کانچ ـــ ذرا سی ٹھوکر سے ٹوٹ جاتی ہے ـــ کتنی احتیاط سے اس بدبخت کو رکھا ـــ مگر پھر بھی اس نے اپنی بیوقوفی سے ہمارے لئے مسئلے کھڑے کر دیئے۔

اس اتنے بڑے جہان میں دو بوڑھی عورتیں ادھر اُدھر پاگلوں کی طرح بھاگتی پھرتی تھیں ـــ بات ایسی تھی کہ خون کے رشتوں کو بھی بتا نہ سکتی تھیں ـــ پھر آماں کا خیال تھا ـــ ان باتوں پر پردہ ڈال دینا چاہیئے۔ جلد از جلد اس کا حل ڈھونڈنا چاہیئے ـــ لٹھ لے کر لوگوں کے پیچھے نہیں پڑ جانا چاہیئے۔ اس کا حل یہی تھا کہ وہ اس محلے سے دور کہیں جا کر بنو کی شادی کر دیں۔ بے سکون کر دیا تھا اس بنو نے انہیں ـــ!

اس روز بنّو ابھی نہا کر اور اپنا گلابی جوڑا پہن کر اندر سے نکلی تھی۔ آج اس کی سہیلی کے ہاں میلاد شریف تھا اور پھوپھی اماں نے وعدہ کیا تھا کہ وہ اسے چھوڑ آئیں گی۔ صندوق میں سے نکال کر اس نے اپنی ڈھیر ساری کالی کالی کانچ کی چوڑیاں پہنی تھیں ـــ ناک کی کیل کو دھو کر صاف کیا تھا ـــ بڑے قرینے سے بال بنائے تھے ـــ موٹی موٹی آنکھوں میں کاجل کے ڈورے ڈالے تھے ـــ ذرا سا بن سنور کر ابھی وہ باہر نکلی ہی تھی۔

کہ باہر کے دروازے سے اچانک زلفی آ گیا۔

یہ اس کے جانے کا وقت نہیں تھا، مگر کبھی کبھی جب اسے اچانک ٹور پر جانا ہوتا تو سامان لینے آ جایا کرتا تھا۔

ہنستی ہوئی بنّو دروازے کی طرف جا رہی تھی کہ زلفی سے ٹکرا گئی ـــ کمبخت ہنسی اور بھی زور سے نکل گئی۔

زلفی نے لمحہ بھر کو نظر اٹھا کر اس کی طرف دیکھا ـــ یوں سج دھج کے ساتھ تو اس نے اسے کبھی دیکھا نہ تھا ـــ حیرت سے دیکھتا ہوا اوپر چلا گیا ـــ

باورچی خانے سے نکلتی ہوئی اماں کو جانے اس ٹکراؤ اور اس ایک نظر میں کیا نظر آیا ـــ کہ پکتی ہوئی باہر آئیں ـــ اور بنّو کو چٹیا سے پکڑ کر گھسیٹتی ہوئی صحن میں لے گئیں ـــ اور پھر دھڑا دھڑ اسے مارنا شروع کر دیا۔

بنّو پہلے تو بوکھلا گئی ـــ پھر روتے ہوئے بولی ـــ "اماں میرا قصور تو بتاؤ ـــ اماں میرا قصور تو بتاؤ ـــ"

مگر اماں میں جانے اتنی طاقت کہاں سے آ گئی تھی۔ زور زور سے اسے کوستی۔ تھپڑ مارتی اور دو ہتڑ مارتی جاتیں اور کہتی جاتیں ـــ "ابھی پتہ چل جائے گا۔ تیرے قصور کا ـــ کمینی حرافہ ـــ آج میں تجھے زندہ نہیں چھوڑوں گی ـــ جا کے سن سارا زمانہ کیا کچھ کہہ رہا ہے ـــ کیا گل کھلائے ہیں تو نے ـــ اگر مر جاتی تو مجھے اتنا دکھ نہ ہوتا ـــ نامراد ـــ بدبخت ـــ"

"کیا گل کھلائے ہیں میں نے ـــ" بنّو چیخنے لگی ـــ "ایسے ہی اماں تم دوسروں کا غصہ مجھ پر نکال رہی ہو ـــ تمہیں تو عادت ہے ـــ"

"ہاں ـــ مجھے عادت ہے ـــ" کپڑے دھونے کا ڈنڈا ساتھ ہی پڑا تھا ـــ اماں نے غصے سے وہ اٹھا لیا ـــ

پہلا ڈنڈا پڑتے ہی بنّو بلبلا اٹھی ـــ "اماں ـــ اماں ـــ اوئی مر گئی ـــ" چیخ و پکار کی آواز سن کر زلفی نے سامنے کمرے کی کھڑکی کھولی اور نیچے جھانکا ـــ اسے سمجھ نہیں آ رہی تھی ـــ یہ سارا ڈرامہ کس سلسلے میں ہو رہا ہے ـــ

"پھر جائے گی اس آوارہ، بدمعاش کے کمرے میں ـــ بتا ـــ جا کے سن تو سارا محلہ کیا کہہ رہا ہے ـــ خاندان کو تو نے کالک لگا دی ـــ کمینی کوئی اچھا آدمی تو ڈھونڈا ہوتا ـــ گھر کھانے کو نہیں ہے اور بٹیا عشق لڑانے چلی ہے"

اماں جی کو جب غصہ آتا تو اسی طرح آتا تھا ـــ اور جب وہ .... مغضوب الغضب ہوتیں تو کسی کی بات نہیں سنتی تھیں ـــ خواہ وہ غلطی پر ہوں یا راستی پر ـــ

اب بنّو کو سمجھ آئی کہ اسے کیوں مار پڑ رہی ہے ـــ مگر وہ جانتی تھی کہ وہ بے قصور ہے اور پھر تھی تو اماں کی ہی بیٹی ـــ اتنی مار بلا وجہ کھانے پر اسے بھی طیش آ گیا تھا ـــ بولی ـــ "سب مر جائیں یہ محلے والے ـــ زلفی بھیا۔ اماں بی ـــ سب مر جائیں تاکہ مجھے باتیں بنانے والا کوئی نہ ہو ـــ"

"اور تو کیوں نہ مر جائے کمبخت ـــــ سو بلاؤں کی ایک بلا ـــــ"

"تم مار دو مجھے آماں ـــــ اپنے ہاتھوں سے مار دو ـــــ اگر تم سمجھتی ہو کہ محلے والے سچے ہیں اور میں جھوٹی ہوں تو پھر ٹھیک ہے ـــــ میں نے جو کچھ کیا بہت اچھا کیا"

آماں کا ہاتھ اور تیزی سے چلنے لگا۔

"اب زبان بھی چلاتی ہے ـــــ آج میں تیرا قیمہ کر دوں گی۔"

"کر دو قیمہ ـــــ کر دو ـــــ" بنّو اور زور سے رونے لگی۔

"بول ـــــ بول ـــــ پھر ایسی حرکت کرے گی ـــــ"

"ضرور کروں گی ـــــ ضرور کروں گی ـــــ" بنّو مار کھائے گئی اور بولے گئی۔

"ہاں میں زلفی بھائی سے عشق کرتی ہوں ـــــ اُن سے چھپ چھپ کر ملتی ہوں ـــــ ان سے شادی کروں گی ـــــ اُن کی بیوی بنوں گی۔"

"حرامزادی ـــــ" آماں نے نئے سرے سے مارنا شروع کر دیا۔ "وہ لفنگا بدمعاش تجھے بھی طلاق دے کر گھر بٹھا جائے گا ـــــ تیرے جیسی ناعاقبت اندیش لڑکیوں کا یہی حشر ہوتا ہے ـــــ"

ہوتا رہے ـــــ ہوتا رہے ـــــ مجھے منظور ہے ـــــ مجھے منظور ہے۔"

"اچھا تو یہ بات ہے ـــــ" آماں نے ڈنڈے سے اس کی ساری چوڑیاں توڑ دیں ـــــ ایسا زناٹے دار تھپّڑ مارا کہ ناک کی کیل اُڑ کر دور جا پڑی۔ ناک میں سے خون بہنے لگا ـــــ کلائیاں الگ زخمی ہو گئیں ـــــ اپنی زخمی کلائیوں کو دیکھ کر بنّو اور بھی دردناک آواز میں رونے لگی۔

"ضرور کروں گی ـــــ ضرور کروں گی ـــــ وہی کروں گی ـــــ جو میرا دل چاہے گا۔"

"اس سے پہلے میں تجھے زندہ نہیں چھوڑوں گی ـــــ"

اوپر کھڑکی میں کھڑے زلفی کی سمجھ میں ساری بات آ گئی تھی۔ آماں اتنی بیدردی سے غریب لڑکی کو مار رہی تھیں کہ کئی بار بے اختیار اس کا دل چاہا ـــــ دوڑ کر جائے اور اسے چھڑا لائے ـــــ مگر وہاں جانے کا مطلب تو یہ تھا کہ آماں جو کچھ کہہ رہی

ہیں اس کی تصدیق ہو جائے گی ـــــ بیچارا بے بس بنا کھڑا رہا ـــــ اور عورتوں کی جہالت کا ماتم کر رہا تھا۔

پھوپھی آماں گھر مل جانے کی خوش خبری لئے جونہی دروازہ کھول کر اندر داخل ہوئیں چیخ و پکار سے سہم سی گئیں ـــــ آماں بی کے ہاتھ میں ڈنڈا تھا ـــــ اور لہولہان بنّو ـــــ نیم بیہوشی کی حالت میں سسک رہی تھی ـــــ ان کی نظر اِدھر اُدھر جا پڑی ـــــ زلفی انہیں دیکھ کر ہٹ گیا ـــــ مگر آس پاس کے گھروں کی کھڑکیوں اور دالانوں میں طنزیہ آنکھیں انہیں صاف نظر آ گئیں ـــــ انہوں نے برقعہ زمین پر دے مارا اور آگے بڑھ کر بھاوج کا ہاتھ پکڑ لیا۔

"واہ بھابی آپ بھی کمال کرتی ہیں ـــــ کوئی لڑکی کو یوں مارتا ہے ارے گرد تو دیکھو۔ اپنے آپ کو خود تم نے تماشا بنا رکھا ہے۔ ایک بات دبانے کی بجائے تم نے اسے اچھی ہوا دی ہے ـــــ بڑی مشکل سے انہوں نے بنّو کو گھسیٹا ـــــ اور اندر لے گئیں ـــــ کھسیائی ہوئی آماں بی بھی پسینہ پونچھتی ہوئی ان کے پیچھے چل دیں۔

بنّو اتنی نڈھال ہو چکی تھی کہ اس سے رویا بھی نہیں جا رہا تھا۔

"واہ واہ ـــــ بھابی بڑی عقلمندی کر رہی تھیں آپ ـــــ" پھوپھی آماں نے بڑے تاسف سے آماں بی کو دیکھا ـــــ "لڑکی کی جان نکل جاتی تو کیا ہوتا۔"

"پھوپھی ماں مجھے مر جانے دیں ـــــ" بنّو سسکیوں میں بولی۔ "میں مر جاؤں گی ـــــ زندہ نہیں رہوں گی ـــــ ایسا ظلم کبھی دنیا میں ہوا ہے ـــــ"

اب جو آماں بی نے سسکتی ہوئی لہولہان بنّو کو دیکھا تو انہیں اپنی زیادتی کا احساس ہوا ـــــ معصوم سی جان اور اتنی مار ـــــ جانے وہ غصّے میں پاگل کیوں ہو گئی تھیں ـــــ بنّو تو ان کے دل کا ٹکڑا تھی ـــــ سب سے لاڈلی بچّی تھی۔ یہ انہوں نے کیا کر ڈالا ـــــ اُن کے دل سے ماں کے چشمے... پھوٹنے لگے ـــــ یہ لال لال خون اُن کے سینے میں برچھیوں کی مانند چبھنے لگا ـــــ لیکن تھیں اپنی بات کی پکّی ـــــ اگر وہ اسے فوراً سینے سے لگا لیتیں تو خجالت ہوتی ـــــ

باہر نکل گئیں ـــــ اور پھوپھی ماں کو اشارے سے بلا گئیں ـــــ وہ بھی اُن کے پیچھے نکل گئیں۔

"مہرو ـــــ میرا تو کلیجہ نکلا جاتا ہے ـــــ جانے غصّے میں کتنا مار بیٹھی ہوں۔ ذرا اس کا منہ ہاتھ دُھلوا کر کپڑے بدلوا دو ـــــ چائے بھیجتی ہوں۔ میری بچی کو پلا دو۔"

چائے بناتے ہوئے اماں بی جھر جھر نیر بہاتی رہیں۔ ہائے یہ مامتا بھی کیسی ظالم شے ہے ـــــ ان کا دل چاہتا، چولہے کی بھڑکتی ہوئی آگ میں اپنے ہاتھ ڈال کر جلا دیں ـــــ وہ ہاتھ جو اپنی معصوم اور بیگناہ بچی پر اُٹھے۔

تیز تیز سیڑھیاں اترتا ہوا زلفی ایکدم ان کے پاس آ کر رکا۔ اور بولا۔ "خالہ اماں ـــــ میں ٹور پہ جا رہا ہوں ـــــ"

خالہ اماں نے کوئی جواب نہیں دیا ـــــ سر جھکائے آنسو بہاتی رہیں۔ ساری مصیبت کی جڑ یہی نگوڑا مارا تھا۔

انہوں نے نہیں سُنا اس نے کب آنے کو کہا۔

زلفی ایک ہفتے بعد جب ٹور سے واپس آیا تو گھر کے اندر والے دروازے میں بہت بڑا تالا پڑا ہوا تھا ـــــ اس نے سوچا گھر والے کہیں گئے ہوں گے، آ جائیں گے

لیکن کچھ ہی روز بعد اس کی حیرت کی انتہا نہ رہی، جب ایک تھانیدار صاحب وردی میں ملبوس کرخت سے چہرے کے ساتھ گھر میں داخل ہو رہے تھے ـــــ دو ایک روز تو وہ انہیں خاموشی سے دیکھتا رہا۔ تیسرے روز آخر پوچھ ہی بیٹھا۔

"جناب! وہ خالہ اماں کدھر ہیں جو یہاں رہتی تھیں؟"

انہوں نے پہلے تو زلفی کو بڑی مشکوک نظروں سے سر سے پاؤں تک دیکھا ـــــ پھر بولے ـــــ "ہم نہیں جانتے ـــــ ہم تو ان کے نئے کرایہ دار ہیں اور ایک سال کا ایڈوانس کرایہ دے چکے ہیں ـــــ"

پھر انہوں نے اس طرح زلفی کی طرف دیکھا کہ اُسے بتانا ہی پڑا ـــــ "میں ان کا بھانجا ہوں ـــــ دورے پر تھا" جب وہ چلی گئیں، اس لئے اب ان کا پتہ پوچھ رہا ہوں۔"

تھانیدار صاحب کی ہر نظر جیسے کہہ رہی تھی۔ "اچھے بھانجے ہو کہ خالہ بتائے بغیر ہی یہاں سے چلی گئی۔ کہیں تم ہی تو ان کے جانے کا سبب نہیں ہو ـــــ"

پھر کس کس سے اس نے خالہ اماں کا پتہ نہ پوچھا۔ محلّے میں کوئی بھی نہ جانتا تھا، نہ جانے خالہ اماں کہاں غائب ہو گئی تھیں ـــــ ان کے یوں غائب ہونے کی وجہ وہ خوب جانتا تھا ـــ اسی لئے تو اپنے ضمیر کا مجرم بنا پھرتا تھا۔

دو مہینے گزر گئے ـــ

سال ختم ہو گیا تھا، اور وہ آئندہ سال کا کرایہ بھی انہیں بھجوانا چاہتا تھا ـــ خالہ اماں نے تو پلٹ کر خبر نہ لی تھی ـــ ایک دن اچانک ڈاکیے پر اس کی نظر پڑ گئی۔

اس کو ایک طرف لے جا کر اس نے خالہ اماں کا پتہ پوچھا ـــ وہ صاف ٹال گیا تو زلفی نے کہا "بھئی ہر مہینے دبئی سے ان کا بیٹا منی آرڈر بھیجا کرتا ہے ـــ آخر وہ تم کس پتے پر بھیجتے ہو ـــ؟"

"مجھے نہیں معلوم جناب ـــ" ڈاکیہ بولا "پوسٹ ماسٹر صاحب کو ہی ان کا پتہ ہے ـــ وہی بھیجتے ہیں ـــ"

"دیکھو میاں ـــ میں کوئی چور اچکا نہیں ہوں ـــ ان کا ایک سال سے کرائے دار ہوں ـــ جب وہ گئے ہیں تو میں یہاں نہیں تھا ـــ اب سال ختم ہو گیا ہے ـــ اگلے سال کا کرایہ بھیجنا ہے ـــ تم مجھے پتہ بتا دو ـــ میں کونسا خود جاؤں گا ـــ منی آرڈر کر دوں گا ـــ" یہ کہنے کے ساتھ ہی زلفی نے دس کا نوٹ نکال کر ڈاکیئے کی جیب میں ڈال دیا۔ پس دپیش کرتا ہوا ڈاکیہ آمادہ ہو گیا۔

"جناب صحیح تو مجھے یاد نہیں ـــ بس اندازے سے بتاتا ہوں۔ آپ خود ڈھونڈ لیجئے گا ـــ"

ٹھیک ہے ـــ"

ڈاکیئے کے بتائے ہوئے پتے پر ڈھونڈتا ہوا زلفی نئے محلّے میں پہنچ گیا۔ اسٹیشن کے اس پار ویران سی کالونی میں بڑی مان نے گھر لے لیا تھا۔ گھروں پر نمبر بھی نہیں لکھے ہوئے تھے ـــ یونہی اندازے سے گنتا اور دیکھتا ہوا وہ ایک گھر کے آگے

ٹھہر گیا ـــ

"شاید یہی ہو ـــ"

اسی وقت کوئی اندر سے باہر نکلا ـــ یہ خالہ اماں تھیں ـــ اسے دیکھ کر ٹھٹھک گئیں ـــ اگر گھر سے باہر نکل رہی ہوتیں تو کبھی تسلیم نہ کرتیں کہ یہ اُن کا گھر ہے۔

انہوں نے بڑی ناگوار سی شکل بنائی ـــ اس کے سلام کا جواب دینے کی بجائے بولیں۔ "تم یہاں کیا لینے آئے ہو ـــ اور گھر کا پتہ تمہیں کس نے بتایا ہے"

"یہ تو غیر ضروری سوال ہے خالہ اماں ـــ ڈھونڈنے والے پا ہی لیتے ہیں ـــ اصل میں مجھے اگلے سال کا کرایہ دینا تھا ـــ اس لئے آیا ہوں"

"ہم نے ابھی سوچا نہیں اگلے سال کے لئے تمہیں گھر دے سکیں گے یا نہیں!"

"آپ مجھ سے بہت خفا معلوم ہوتی ہیں خالہ اماں ـــ"

خالہ اماں دروازے سے باہر نکل گئیں ـــ "مہربانی کر کے ہمارے گھر کا پتہ محلّے میں کسی نہ بتانا ـــ اور تمہیں بھی بغیر اجازت آنے کی ضرورت نہیں"

خالہ اماں ایک طرف کو مڑ گئیں اور وہ چاہتے ہوئے بھی گھر کے اندر نہ جا سکا۔!

دوسرے دن صبح کے وقت وہ کرائے کے پیسے لے کر ان کے گھر پہنچ گیا ـــ خالہ اماں سامنے چارپائی پر بیٹھی دال چن رہی تھیں۔

"خالہ اماں میں آ جاؤں ـــ؟" جب اس نے کہا تو خالہ اماں چونک گئیں۔

"تم آج پھر آ گئے ہو ـــ؟"

"میں کرائے کے پیسے لے کر آیا تھا ـــ" قریب آ کر اس نے سو سو کے بہت سے نوٹ اماں کے پاؤں کے قریب رکھ دیئے اور خود چارپائی کی پائنتی کی طرف بیٹھ گیا۔

اماں نے نظر اٹھا کر ان زہر مہرہ رنگ کے ماٹھ سانپوں کی طرف دیکھا ـــ اور جیسے اُن کے کلیجے میں ایک ہوک سی اُٹھی۔

یہ بارہ ہزار روپے ـــ

یہ بارہ ہزار روپے ہی تو سارے فساد کی جڑ ہیں ـــــ

انہی بارہ ہزار روپے کے لئے میں نے اپنی بیٹی کا دامن گدلا کیا ـــ اس کے پنڈے کو اذیت دی۔

بارہ ہزار پر میں نے اپنی بچی کو وار دیا۔

یہ بارہ ہزار روپے کس قدر ظالم ہیں ـــــ مگر کس قدر ضروری ہیں ـــــ یہ جانتے ہوئے بھی کہ یہ ناگ ہیں ـــــ ڈس لیں گے ـــ ان کو چھونا پڑتا ہے ـــــ ان کی کسی کو ضرورت نہیں ہے ـــــ مگر یہی سب سے بڑی ضرورت ہیں ـــــ

اماں ابھی سوچ ہی رہی تھیں کہ سامنے سے پھوپھی اماں نکل آئیں۔ "ارے زلفی۔ کب آئے، کیسے ہو؟"

"اچھا ہوں پھوپھی ماں ـــــ میں کرایہ دینے آیا تھا ـــــ"

"بہت کمزور لگ رہے ہو ـــ رنگ بھی وہ نہیں رہا ـــ داڑھی بھی بڑھا رکھی ہے ـــــ خیر تو ہے؟"

اماں نے اب غور کیا ـــ ورنہ کل سے مارے تعصب کے انہوں نے اس کی طرف آنکھ اٹھا کر نہ دیکھا تھا ـــــ

پھوپھی ماں کی آواز سن کر بنو دوڑ کر باہر آئی ـــ زلفی کو دیکھ کر وہیں دہلیز میں رک گئی ـــــ پھر دروازے کا ایک پٹ زور سے پکڑ کر بولی۔

"ابا اے اماں ـــ زلفی بھائی آئے ہیں ـــــ اب پوچھ لو نا ان سے۔ میں نے کیا برائی کی تھی ـــــ کونسا عشق کیا تھا ان کے ساتھ ـــ کبھی ان کی محبت کا دم بھرا تھا ـــ کب اُن سے شادی کرنے کا وعدہ کیا تھا ـــــ پوچھو نہ اماں اُن سے ـــــ سامنے ہیں ـــــ بتا دیں گے آپ کو ـــــ مجھ پر اتنا بڑا الزام آگیا ـــــ صرف اتنا ہی قصور تھا نا ـــــ؟ میرا کہ میں نے ان کو سدھارنا چاہا ـــــ میں نے چاہا کہ یہ شرافت کی زندگی بسر کرنا شروع کر دیں ـــــ لوگ ان سے نفرت نہ کریں۔ یہ بھی عام انسانوں کی طرح اپنا گھر بسا لیں ـــــ آوارگی کا لیبل اپنے ماتھے سے اتار لیں ـــــ اس کے علاوہ

اور میں نے کیا کیا ـــــ بتائیں نا؟ بتائیں زلفی بھائی۔ اماں کو سب کچھ بتائیں ـــــ پھر اماں نے مجھے اس قدر کیوں مارا ـــــ اتنا کیوں مارا کہ میرے جسم پر اب تک نیل پڑے ہیں ـــــ" بنو رونے لگی ـــــ "زمانے کے سامنے مجھے رسوا کر دیا ـــــ کیا میں اتنی بری تھی کہ مجھے چوروں جیسی مار دی جاتی ـــــ کاش میں مر گئی ہوتی ـــــ"

اماں بھی تو پہلے ہی آبدیدہ بیٹھی تھیں ـــــ بنو کی باتیں سن کر باقاعدہ رونے لگیں۔

"آپ نے ـــــ آپ نے زلفی بھائی مجھے مار پڑوائی ـــــ مجھے اپنے گھر سے بے گھر کیا ـــــ" وہ روتے روتے بولی۔ "میرے باپ کی حویلی چھڑوائی . . . جیتے جی اماں مجھے اس قبر میں لے آئی ہیں ـــــ مجھے اپنا گھر یاد آتا ہے ـــــ اپنا کمرہ یاد آتا ہے ـــــ اپنے ابا یاد آتے ہیں ـــــ نہ ابا مرتے نہ ہم یہ دن دیکھتے ـــــ بن باپ کے جو لڑکیاں ہوتی ہیں ـــــ اُن کے مقدر میں سیاہیاں اور بن باس لکھے ہوتے ہیں . . . . مجھے بھی اپنی معصومیت کی سزا مل رہی ہے ـــــ اور آپ ـــــ آپ آج پھر بارہ ہزار لے کر میری اماں کو خریدنے آگئے ہیں ـــــ ان بارہ ہزار سے سونے کا سیٹ تو بن سکتا ہے ـــــ میری لٹی ہوئی نیک شہرت تو واپس نہیں آسکتی ـــــ"

اس بات پر پھوپھی اماں بھی رونے لگیں ـــــ حالات یوں صورت اختیار کریں گے۔ زلفی کو امید نہ تھی ـــــ اس نے سب کی طرف مجرمانہ نظروں سے دیکھا ـــــ اور پھر اُٹھ کر باہر نکل گیا ـــــ!

پھوپھی ماں نے روتی ہوئی بنّو کو سینے سے لگا لیا ——

ٹھیک ایک ہفتے بعد ——

ہاتھوں میں بہت سے ڈبے پکڑے ڈرتا ڈرتا زلفی ان کے گھر میں داخل ہوا۔

سامنے کوئی نظر نہیں آیا —— تو اندر کو چلا ——

پھوپھی آماں نے اسے اندر جاتا ہوا دیکھ لیا تھا —— اس کے پیچھے لپکیں —— اندر بنّو زمین پر دری بچھائے بیٹھی کشیدہ کاری کر رہی تھی —— وہ آہستہ آہستہ چلتا ہوا جا کر اس کے پاس بیٹھ گیا —— اور سارے ڈبے اس کے آگے رکھ دیئے —— یہ کیا ہے —— ؟ اس نے پوچھا ——

"ان سب میں چوڑیاں ہیں ——!"

"اتنی بے شمار چوڑیاں —— ؟"

"ہاں بنّو —— اُس دن خالہ آماں نے تمہیں ناحق مارا تھا نا ؟ تو تمہاری کلائیوں کی سب چوڑیاں ٹوٹ گئی تھیں —— اور تمہاری ناک کی کیل دُور جا پڑی تھی —— اس ڈبی میں ایک کیل ہے ——" اس نے سونے کی کیل اس کے ہاتھ میں پکڑا دی ——

اندر آتی ہوئی پھوپھی ماں مصلحتاً دروازے میں رُک گئیں۔

"کیا بتاؤں بنّو —— اس دن تمہیں مار کھاتا دیکھ کر مجھے کتنا دُکھ ہوا تھا ——

خدا کی قسم میرا دل چاہتا تھا اپنے آپ کو قتل کر دوں —— میری وجہ سے تم پر عذاب نازل ہو رہا تھا —— اس دن سے لے کر آج تک میں چین سے نہیں سویا —— اب جب تک مجھے تم معاف نہ کر دو گی —— مجھے سکون نہ ملے گا —— میں نے تمہارے خلوص کو پہچانا نہیں تھا ——"

"یہ ڈبے لے جایئے یہاں سے ——" بنّو نے سب ڈبے پھینک دیئے۔

چوڑیاں اِدھر اُدھر بکھر گئیں —— "آپ کو خیرات دینے کی عادت ہے شاید ——"

"نہیں بنّو —— میں بڑے خلوص سے تم سے معافی مانگنے آیا ہوں —— اور میں کسی قابل نہیں ہوں ——"

اتنے میں اماں بی گھر میں داخل ہوئیں —— پھوپھی ماں کو دروازے سے لگ کر باتیں سنتے دیکھ کر کرخت لہجے میں بولیں۔

"کون ہے اندر —— کون آیا ہے —— ؟"

زلفی ڈر کر کھڑا ہو گیا —— اور پھر باہر نکل آیا ——

"اچھا تو آج تم پھر آ گئے ہو ——" انہوں نے غصّے سے لرزتے ہوئے کہا۔

"تمہیں کس نے آنے کی اجازت دی ہے —— اپنے بارہ ہزار روپے لے جاؤ۔ ہم نے فیصلہ کیا ہے کہ تمہیں گھر میں نہیں رکھیں گے —— لاؤ مہر و بی —— میری صندوقچی اندر سے ——" پھوپھی ماں صندوقچی لینے چلی گئیں ——

"خالہ اماں —— آپ ناراض نہ ہوں —— میں تو آج بنّو سے معافی مانگنے آیا تھا ——"

"کس نے اجازت دی ہے تمہیں بنّو سے بات کرنے کی —— اس کی زندگی میں کانٹے بو کر اب تم اور کیا چاہتے ہو —— چاہتے ہو کہ ہم یہ شہر ہی چھوڑ جائیں ——"

"نہیں خالہ بی —— آپ غصہ نہ ہوں —— میں اب کبھی نہیں آؤں گا بلکہ اپنا ٹرانسفر کرا لوں گا —— وہ آہستہ آہستہ باہر کو جانے لگا —— پھوپھی ماں

صندوقچی لے آئی تھیں ——

"ٹھہرو اپنی رقم لیتے جاؤ ——"

اس نے مڑکر دیکھا —— بنّو دروازے میں آکھڑی ہوئی تھی اور دروازے کے ایک پٹ کے ساتھ اپنا رخسار لگائے دروازے سے لپٹی کھڑی تھی —— جانے اس کی پھیلی پھیلی آنکھوں میں کیا تھا —— زلفی جاتے جاتے رُک گیا —— اور بولا ——

"خالہ امّاں —— میں ایک بات کہنی چاہتا ہوں —— آپ سُن لیں۔ سُن لیں آپ —— اگر آپ کو منظور ہو تو مجھے بیٹھ جانے کو کہیں —— ورنہ میں چلا جاؤں گا ——" خالہ امّاں خاموش ہوگئیں —— زلفی کہنے لگا ——

"خالہ امّاں —— میں کیا ہوں —— میں اچھی طرح جانتا ہوں —— میرا ماضی اس بات کی اجازت نہیں دیتا کہ میں کوئی بھی بات منہ سے نکالوں۔ مگر میں اتنا بُرا بھی نہیں ہوں جتنا مجھے سمجھ لیا گیا ہے —— جب سب مجھے بُرا کہنے لگے تھے تو میں نے بھی بُرا بن کر دکھانے کا تہیّہ کر لیا تھا —— یہ ضرور ہے کہ میں شراب پیتا ہوں —— بلکہ پیتا تھا ——

جس روز آپ نے بنّو کو مار مار کے لہولہان کر دیا تھا —— مجھے اتنا دُکھ ہوا کہ میں نے قسم کھائی کہ جب تک آپ کی غلط فہمی دُور نہیں کرا دوں گا۔ شراب کو ہاتھ نہیں لگاؤں گا —— سو آج تک میں نے شراب کو ہاتھ نہیں لگایا ——

اس کا میری صحت پر بھی اثر ہوا ہے —— مجھے رات کو نیند بھی نہیں آتی —— پھوپھی ماں پوچھ رہی تھیں، تو کمزور کیوں ہوگیا ہے —— اب چھوڑ دی ہے تو قیامت تک ہاتھ نہیں لگاؤں گا ——

یہ بھی سچ ہے کہ میں دو بیویوں کو طلاق دے چکا ہوں —— اب میں اپنی صفائی نہیں پیش کروں گا —— مگر اتنا ضرور کہوں گا —— اس بارے میں میری مجبوریاں جانتے —— مجھ کو آپ بھی جانتی ہیں —— جتنی خوبصورت تھی وہ —— اتنی ہی بدمزاج اور بدزبان تھی —— اس کا خیال تھا —— میں اس کے

حُسن کا اسیر ہو جاؤں گا —— اُس نے مجھے اپنی شیریں زبان سے نہیں، اپنے حُسن سے جیتنا چاہا —— میں کسی اور مزاج کا آدمی ہوں —— ہماری نہ بن سکی۔ پھر اس نے دباؤ ڈال کر طلاق لے لی۔

ہاں یہ ضرور ہے کہ میں تعلیم کے زمانے میں رضوانہ سے محبّت کرتا تھا اور بعد میں اسی سے شادی کر لی۔ بلکہ اس نے مجھ سے شادی کر لی۔ وہ بہت ہی امیر والدین کی بیٹی تھی۔ اُسے شوہر نہیں ایک غلام چاہیے تھا۔ اس نے میرے جذبات کو سمجھنے کی کوشش ہی نہیں کی اور مجھے بندۂ بیدام بن جانے کا حکم دے دیا —— مرد آخر مرد ہوتا ہے۔ وہ کسی عورت سے کتنی بھی محبت کیوں نہ کرتا ہو —— اس کی ڈگڈگی کی تال پر ناچنے کو تیار نہیں ہوتا۔ بات بات میں وہ مجھے تجمّل کا طعنہ دیتی تھی —— اپنے باپ کا ڈراوا دیتی تھی —— پھر آخر وہی ہوا —— جو ایسی شادی کا انجام ہوتا ہے۔

اگر میری بیوی کوئی بنّو جیسی سادہ دل اور معصوم سی لڑکی ہوتی تو وہ مجھے بھٹکنے سے بچا لیتی —— ان دونوں نے مجھے گمراہی کی طرف دھکّا دے دیا —— میں عورت ذات سے نفرت کرنے لگا —— اور ہر وہ حرکت جو اس نفرت کو ہوا دے —— میرا بنّو سے کوئی ایسا ویسا تعلق نہیں ہے۔ میں نے آپ کے گھر میں رہتے ہوئے اسے صرف ایک ننھی سی سرکش بچی قرار دیا تھا —— جو قیدِ تنہائی کی ماری ہوئی تھی اور اپنی گھٹن کو کم کرنے کے لئے ہر ایک سے اُلجھ پڑتی تھی —— لیکن مقدّر نے —— ہم دونوں پر ایک اتنا بڑا الزام لگا دیا کہ کوئی تعلق نہ ہونے کے باوجود ہمارا نام ایک ساتھ آنے لگا —— آپ لوگ مجھے کس حد تک ناپسند کرتے ہیں —— اس کا اندازہ اس بات سے ہو سکتا ہے —— کہ آپ وہ گھر چھوڑ کر آ گئے ——

آخر آپ کو بنّو کی شادی کرنا ہے —— کسی بھی اجنبی سے کر دیں گی۔ آپ اس کے لئے پریشان ہیں —— گو میں خود کو اس قابل نہیں سمجھتا —— پھر بھی درخواست کرتا ہوں کہ آپ بنّو کی شادی مجھ سے کر دیں —— میرا ماضی خواہ کیسا ہے —— میں بنّو کو اچھا مستقبل دوں گا۔ اس کو پھولوں کی طرح رکھوں گا۔"

طاق میں لگی لگی بنّو کا دل دھڑک اٹھا ـــــ (کرتے پاجامے میں ملبوس، اُداس ـــــ اُداس، مظلوم ـــــ بڑھی ہوئی شیو کے ساتھ وہ کتنا اچھا لگ رہا تھا) بنّو لپک کر اندر بھاگ گئی۔

"آپ سب اپنے گھر واپس چلئے ـــــ اسی محلّے میں ـــــ اسی گھر میں ہم سب مل جُل کر رہیں گے ـــــ ہمارا الگ ایک خاندان ہوگا! اور ہم نئی زندگی کی ابتدا کریں گے اور لوگوں کو جلنے کا موقع دیں گے ـــــ ایک غلط بات کے لئے ہم سب کی زندگیاں کیوں برباد ہوں۔"

امّاں بی ماتھے پر بل ڈالے بیٹھی تھیں ـــــ ابھی وہ کچھ کہنے کو تھیں کہ پھوپھی امّاں نے جلدی سے آگے بڑھ کر کہا۔ "بیٹا بیٹھو تو سہی ـــــ اتنی دیر سے کھڑے ہو ـــــ ایسی بھی کیا غیریت کہ تم بیٹھ کر بات نہیں کر سکتے۔"

واقعی زلفی کھڑا کھڑا تھک گیا تھا ـــــ جلدی سے بیٹھ گیا ـــــ امّاں بی نے گھور کر پھوپھی ماں کو دیکھا ـــــ پھوپھی ماں نے پیچھے سے امّاں بی کے چٹکی لی ـــــ اور بولیں۔

"بھابی تم ذرا جا کر چائے کا ایک پیالہ تو بنا لاؤ ـــــ پھر بعد میں تسلّی سے باتیں ہوں گی"

پھوپھی ماں کی چٹکی کا مطلب امّاں بی سمجھ گئی تھیں، بارہ ہزار کے نوٹ ابھی تک پلنگ پر پڑے تھے ـــــ وہ ناگواری سے اُٹھ کر اندر کمرے میں چلی گئیں ـــــ حالانکہ انہیں باورچی خانے میں جانا تھا ـــــ

کیا دیکھتی ہیں کہ بنّو نے زلفی کی لائی ہوئی ساری چوڑیاں پہن رکھی ہیں ـــــ دونوں کلائیاں بھر گئی ہیں ـــــ اور وہ آئینے کے آگے بیٹھی اس کی لائی ہوئی کیل پہن رہی ہے ـــــ

امّاں کی آہٹ پا کر اس نے مڑ کر دیکھا ـــــ اور پھر خوفزدہ ہو کر کھڑی ہو گئی۔

امّاں کی آنکھوں میں جانے کیا تھا ـــــ کہ وہ پھر ڈر گئی ـــــ اسے اس دن کی مار یاد آ گئی، اس نے بے اختیار اپنی کلائیوں کی طرف دیکھا اور پھر ہاتھ اپنے ناک کی کیل پر رکھ لیا ـــــ

"کیا بات ہے امّاں ـــــ" اس نے خوف سے لرزتے ہوئے کہا اور پھر تھر تھر کانپنے لگی ـــــ

اسے یوں لگا ـــــ آج پھر امّاں ڈنڈا اٹھا کر اس کی چوڑیاں چور چور کر دیں ـــــ

اس کی کلائیاں زخمی کر دیں گی ـــــ ناک کی خوبصورت کیل نوچ کر پھینک دیں گی۔

آج تو اُن کے پاس ثبوت تھا ـــــ!

ثبوت ـــــ کیسا ثبوت ہے ـــــ اس کا دل دھک دھک کرنے لگا ـــــ جذبے کتنی جلدی راہ بنا لیتے ہیں ـــــ!

یکایک امّاں کی گھورتی ہوئی بے حس نگاہ آنسوؤں میں ... ڈھل گئی ـــــ آگے بڑھ کر انہوں نے بنّو کو سینے سے لگا لیا ـــــ اس کی چوڑیوں سے بھری کلائی چوم لی ـــــ

وہ حیران سی امّاں کے بوڑھے سینے سے لگی کھڑی تھی ـــــ امّاں کے اندر سے مامتا کی خوشبو آ رہی تھی ـــــ ان کا کمزور دل دھک دھک کر رہا تھا ـــــ اس وقت اُسے امّاں پر بہت ترس آیا ـــــ روتے روتے امّاں کا چہرہ بھیگ گیا تھا ـــــ

امّاں نے بنّو کو بہت زور سے بھینچ لیا ـــــ اپنے بوڑھے ... بازوؤں میں سمیٹ لیا ـــــ پھر اس کی پیشانی چوم کر بولی ـــــ "میں صرف تجھے ہمیشہ خوش رہنے کی دُعا دے سکتی ہوں ـــــ صرف دعا اور میرے پاس کچھ نہیں ہے بنّو! ـــــ"

"میری اچھی ماں ـــــ"

بنّو نے چوڑیوں سے بھری کلائیاں امّاں کی گردن میں ڈال دیں۔ اور اپنا تپتا ہوا رخسار امّاں کے جھریوں بھرے رخسار پر رکھ دیا۔

خشک پتّوں کا الاؤ ۔۔۔۔

عشق دی بھاہ ہڈاں دا بالن عاشق بہہ سکیندے ہُو
گھت کے جان جگر وِچ آرہ دیکھ کباب تلیندے ہُو
سر گردان پھرن ہر ویلے خون جگر دا پیندے ہُو
ہوئے ہزاراں عاشق باہُو پر عشق نصیب کہیں دے ہُو

(سُلطان باہُوؒ)

جاگو

جاگو

اٹھو . . . . اٹھو . . . .

آؤ آؤ . . . . ہولے ہولے آؤ

دبے دبے میرے پیچھے چلی آؤ . . . .

میرے کندھے پہ ہاتھ رکھ دو۔

دیکھو تمہارے احساس کی جھانجھر نہ چھنکے

بلکتے گھونگھروؤں کے مُنہ پر ہاتھ رکھ دو۔

سانس کے سرگم سے کہو۔

دھیرے دھیرے بہے . . . . .

بالکل اس طرح جس طرح میں چلتی ہوں۔

میں ۔ کہ سب کو چھیڑتی ہوں۔ سب سے الگ رہتی ہوں۔

ہاں آؤ . . . . آؤ . . . .

میرے پیچھے پیچھے چلی آؤ۔

دبے دبے، ہولے ہولے . . . .

دیکھنا کسی کو خبر نہ ہو۔

ہوائیں تو پاگل ہیں، شوریدہ سر ہیں۔
دیوانہ وار در و دیوار سے پٹتی پھرتی ہیں۔
کبھی میری چوکھٹ پر، کبھی اُس دہلیز پر۔
کبھی یہاں — کبھی وہاں —
کہتی ہیں چپ بھی نہ رہو۔
کہتی ہیں شور بھی نہ مچاؤ۔
میری بے حسی کی لَٹ کو پریشان کر جاتی ہیں۔
اِدھر اُدھر
جذبے سمیٹ سمیٹ کر میں تھک جاتی ہوں۔
پھر میرے کان میں آ کر سنسناتی ہیں۔
آؤ . . . . آؤ . . . . .
بند دروازوں کے اس طرف مجھے ان کی مترنم چاپ سنائی دیتی ہے۔
آؤ . . . .
آؤ . . . .

رُت کیوں بدلتی ہے۔
دھرتی کی شہزادی جوانی کی انگڑائی کیوں لیتی ہے۔
اس کی انگڑائی سے اتنی مہک کیوں نکلتی ہے۔
در و دیوار کا پیراہن کیوں بدل جاتا ہے۔
ہوائیں یہ خوشبو کیوں اڑا لاتی ہیں۔
در در پہ جا کے کیوں بھٹکتی پھرتی ہیں۔
بدلتی رُت کی خوشبو،
بہاروں کی خوشبو۔

جب سب سو جاتے ہیں، سنسار سو جاتا ہے۔
صرف دل کے دھڑکنے کی صدا سنائی دیتی ہے۔
اس وقت کوئی میرا دروازہ پیٹتا ہے۔
ایسے کہ دستک مجھے اپنے دل پر محسوس ہوتی ہے۔
میں باؤلی اٹھ دوڑتی ہوں۔
دروازہ کھول دیتی ہوں۔
آواز کا تعاقب کرتی ہوں۔
قدم دُور ہوتے جاتے ہیں، اور دُور
میں ان کے پیچھے لپکتی ہوں۔
ہوا قہقہہ لگا کر ہنس پڑتی ہے۔
میرا گریبان چاک ہو جاتا ہے۔
میرا کوئی دامن نہیں۔
میرا کوئی آنچل نہیں۔
کہاں سے پکڑو گی؟
میں جھلا اٹھتی ہوں۔
واپس لوٹتی ہوں۔
تب وہ کہتی ہے۔
آؤ . . . . آؤ . . . .
میرے پیچھے پیچھے چلی آؤ، گپ چپ — جیسے صدیوں سے میں چل رہی ہوں۔
آؤ میں تمہیں ایک انجانے جہان میں لے جاؤں۔
خوشبوؤں اور آرزوؤں کا جہان۔
بھول جاؤ سب باتیں۔
اپنا آپ کہیں رکھ کر بھول جاؤ۔

دیکھو رُت بدل رہی ہے۔
دیکھو فضا مہک رہی ہے۔
دیکھو رات گنگنا رہی ہے۔
پھُول اور پتے شہنائیاں بجا رہے ہیں۔
وقت کی سبز پری مہندی لگا رہی ہے۔
بہار کی دُلہن ابٹن میں بسی ہے۔
محبت اس کے لئے گجرے بنا رہی ہے۔
جوانی اس کے دولہے کو سجا رہی ہے۔
تم پردوں میں منہ چھپائے لیٹی ہو۔
اٹھو۔۔۔ اٹھو۔۔۔
پھُول، پات، روشنی۔۔۔
زمین، آسمان
زندگی، خدا۔۔۔
سب ایک سچائی ہے،
سب تمہیں بلاتے ہیں۔
آؤ۔۔۔ آؤ۔۔۔
میرے پیچھے دبے دبے۔۔۔ ہولے ہولے۔

رُت نہ بدلا کرے۔
خوشبو نہ آیا کرے۔
زنجیر نہ ہلا کرے دروازے کی۔
دل نہ ٹوٹا کرے۔
کرچیاں نہ چبھا کریں۔

رُوح نہ گھائل ہو۔
فضاؤں میں تالیں نہ بجا کریں۔
سپنوں کی رہ گذر لہولہو نہ ہو۔
میں یہ سارے دریچے بند کر دوں۔
سو جاؤں —
کھو جاؤں
بھُول جاؤں۔
وہ کہتی ہے، اٹھو اٹھو۔۔۔ آؤ۔۔۔ آؤ۔۔۔

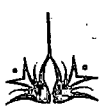

جاؤ۔۔۔ جاؤ۔۔۔
کسی اور دیس میں جاؤ۔
یہاں سب بھکاری بستے ہیں۔
سب نے دامن پھیلا رکھے ہیں۔
اتنی بھیک دینی پڑتی ہے کہ اپنا خزانہ خالی ہو جاتا ہے۔
محبت کی جھولی پھیلا کر فرض کی بھیک مانگتے ہیں۔
جینے کی قیمت چاہتے ہیں۔
دیکھو تو چاروں طرف کشکول ہی کشکول ہیں۔ دامن ہی دامن ہیں۔
بھکاری ہی بھکاری ہیں۔
اجلے بھکاری۔
شاطر بھکاری۔
بیوپاری بھکاری۔
من موجی بھکاری۔
سب نے جھولی پھیلا رکھی ہے۔

مجھے تو بھیک مانگنا بھی نہ آیا۔ دامن کچھ ایسا دریدہ بھی نہ تھا۔

میں کہتی ہوں۔

جاؤ۔۔۔ جاؤ۔۔۔۔

اُلجھو نہیں، ستاؤ نہیں۔

وقت سے کہہ دو کہ سو جائے، ورنہ مجھے نہ جگائے۔

ایک چکر اور نکل جانے دو۔

میں سفید بالوں والی بڑھیا کی طرح وقت کے چکر کے پیچھے بھاگ رہی ہوں۔

مجھے سفید بال درکار ہیں۔

میں جھرلیوں کی بھیک مانگتی ہوں۔

مجھے خالی من اور ٹھنڈا تن درکار ہے۔

میرے مانگنے کا انداز نرالا ہے۔

میری مانگ مضحکہ خیز ہے۔

ہے تو۔

جاؤ۔۔۔۔ جاؤ۔۔۔۔

خدا کے لئے جاؤ۔

اور بھی تو در ہیں۔

اور بھی زنجیریں ہیں۔

میرے آنگن سے نکل جاؤ۔

آؤ۔۔۔ آؤ۔۔۔۔

میرے پیچھے پیچھے چلی آؤ۔

دبے دبے

ہولے ہولے۔۔۔۔

ہوائیں مجھے ستاتی ہیں۔

اپیا تین دن سے جانکنی کی حالت میں تھیں اور سارا گھرانہ ان کی پٹی سے لگا بیٹھا تھا، اب ڈوری ٹوٹی کہ تب ٹوٹی۔

عجیب ہے زندگی، اس کی چاہ ہر دل میں ہے، صحت و عافیت ہر ذی رُوح مانگتا ہے۔ مریض کے سرہانے زندگی مانگی جاتی ہے۔ شفا اور آسودگی مانگی جاتی ہے۔ مگر اپیا کے معاملے نے سب کو بتا دیا تھا کہ کبھی کبھی موت بھی مانگنی پڑتی ہے۔ وہ موت جو مریض کو آسودہ کر دے۔

اتنی پیاری اپیا، اتنی پیاری اس کی عادتیں، اتنے اچھے اس کے کام۔ اتنا پاکیزہ اس کا دِل۔

اپیا اس گھر میں محبت کا اچھوتا پیغام تھیں۔ آج سب کے سر پر قرآن رکھ کر قسم کھلوائی جاتی تو سب یہی کہتے کہ اپیا نے کبھی کسی کا دل نہیں دکھایا۔ دل دکھانا اپیا کو آتا ہی نہ تھا۔ خدمت گزاری ان کا مسلک تھا۔ یہ باتیں تربیت سے حاصل نہیں ہوتیں۔ بعض لوگ ایسی صفات پیدائشی لے کر آتے ہیں۔ یا پھر یہ بھی ان کے ستاروں کی کرامت ہوتی ہے۔

اپیا سب سے بڑی اولاد تھیں۔ ان کے بعد پانچ بیٹے ہوئے اور پھر ایک بیٹی۔ اگر بیٹی پہلوٹھی کی ہو تو جلد اسے ماں بننا پڑتا ہے، یہی حال اپیا کا ہوا۔ اماں تو دو بچوں کی پیدائش کے بعد ہی چارپائی سے لگ گئیں اور پانچ سال کی اپیا بڑی مشاقی سے ننھے اظہر

کو نہلاتی دُھلاتی دودھ پلاتی اور اسکول بھی جاتی۔

اماں تھیں تو بیمار چارپائی پر پڑی رہتیں۔ مگر اپنی زندگی کا احساس دلانے کے لئے، ہر دوسرے تیسرے سال اور ایک بچہ پیدا کر کے اپیا کی گود میں ڈال دیتیں۔

ننھی سی اپیا حوصلے سے اس کو بھی سنبھال لیتی۔ جانے کس طرح انہوں نے میٹرک کر لیا۔ پھر اس کے بعد تعلیم جاری نہ رکھ سکیں۔ البتہ سارا گھر انہوں نے سنبھال لیا۔

چھوٹے بھائیوں کو تیار کرنا، اسکول بھیجنا، شام کو گھر پہ پڑھانا، سارے خاندان سے میل جول رکھنا، تقریبات میں شامل ہونا اور ابا کے دوستوں کی تواضع کرنا۔ ہر نیا سال اپیا کو کچھ اور تجربہ، کچھ اور عقل دے جاتا، جسے اپیا جھولی پھیلا کر لے لیتیں اور جس طرح جھولی پھیلا کر اپیا نے افسوں کو لیا تھا اس کی مثال نہیں۔

پانچ بھائیوں کے بعد اماں خزاں زدہ ڈال کی طرح سوکھ گئی تھیں۔ سب کا خیال تھا اب یہ شاخ کبھی ہری نہ ہوگی۔ پلنگ پہ پڑی پڑی ختم ہو جائے گی۔

پھر ایک دن سب کی حیرت کی انتہا نہ رہی، جب شاخ ہری ہونا شروع ہو گئی تھی۔ اپیا کو خوشی اس بات کی تھی کہ ننھی سی بہن آ گئی۔ ایک ہمدم کے لئے وہ بڑی ترس رہی تھی۔ چھوٹے بھائیوں کی مصروفیت، شرارتیں اور قباحتیں اس کو اگرچہ اچھی لگتی تھیں مگر تنہائی کا احساس برابر رہتا تھا۔ پر جب گھر میں مُنی سی بیٹی آ گئی تو اس کو پتہ چلا، بیٹی کے ساتھ گھر میں ہزار رنگ آ جاتے ہیں، اس کی زندگی رنگوں سے مزین ہوتی ہے۔ اس کا ہر کام ایک دلچسپ مشغلہ ہوتا ہے۔ اور اس کے ہر کام میں ایک حسن ہوتا ہے۔ حسن بھی لڑکی کے ساتھ آنگن میں اترتا ہے۔

تبھی اس نے خود اس کا نام افسوں رکھا۔

افسوں کو اتنا پیار دیا کہ ماں کا پیار اس کے آگے ماند ہو گیا۔ کبھی کبھی تو یہ شک ہونے لگتا کہ افسوں اپیا ہی کی بیٹی ہے اور جب بڑے بھائی اس کو تنگ کرتے کہ تو اپیا کی بیٹی نہیں ہے تو وہ دھواں دھار رویا کرتی اور اس بات پر بھی اپیا کو بہت پیار آیا کرتا۔

لیکن پھر ایک موڑ بیچ میں آن کھڑا ہوا۔

جب افسوں دس سال کی ہوئی تو اپیا کی شادی ہو گئی۔ اپیا جیسی لڑکی کو خاندان میں ہر کوئی بہو بنا لینا چاہتا تھا، وہ بنی بنائی ماں اور پیدائشی عورت تھی۔

پر نصیبہ بھی جاگا تو کنعان بھیا کا۔

وہ کوئی بہت دُور کے رشتہ دار تھے، چھوٹا کنبہ تھا۔ اچھی پوسٹ پر تھے۔ کھاتا پیتا گھرانہ تھا۔ ابا نے انہی کے ہاتھ میں اپیا کا ہاتھ پکڑوا دیا۔

ایک بات کی سب کو فکر تھی اور اپیا کو بھی تھی۔

"افسوں، اپیا کے بغیر نہیں رہ سکتی تھی، اور اگر کنعان نے افسوں کا وجود برداشت نہ کیا تو کیا ہوگا۔

اماں کو اس بات کی فکر نہیں تھی۔

ان کا خیال تھا عورت میں اپنے پیروں پہ آپ کھڑے ہونے کی طاقت ہوتی ہے، آج نہیں تو کل افسوں خود سنبھل جائے گی بلکہ اپیا کی جگہ لے لے گی اور بڑے بھائیوں کا بالکل ماں کی طرح خیال کرنے لگے گی۔

ایک سال تو اپیا چھپ چھپ کر افسوں سے پیار کرتی رہیں۔ کلیجے سے لگا کر روتی رہیں۔ شادی کے فوراً بعد وہ گھر میں کوئی رخنہ کھڑا نہ کرنا چاہتی تھیں اور جانتی تھیں کہ محبت کے معاملے میں مروکس قدر تنگ نظر اور حاسد ہوتا ہے۔

پھر ایک سال بعد جب پری ان کی گود میں آ گئی تو اپیا کو افسوں کو گھر میں بلانے کا بہانہ مل گیا۔

افسوں کئی کئی دن اپیا کے گھر رہتی، ان کے چھوٹے موٹے کام کر دیتی۔ پری کو جھولا جھلا دیتی۔ اپیا کی آنکھوں کے سامنے رہتی اور اپیا کو قرار آیا رہتا۔

سب بھائی اس بات پر ضد کرتے تھے کہ وہ بھی اپیا کے گھر جا کر رہیں گے۔

مگر اماں ہمیشہ ڈانٹ پلا دیتیں۔

"بہن کے گھر بھائی رہتے ہوئے اچھے لگتے ہیں۔ شرم کرو کمبختو! بس اتنا ہی کافی ہے کھڑے کھڑے جایا کرو اور خیریت پوچھ کر آ جایا کرو۔"

"بس اماں بھی پرانے خیالات کی ہیں۔"

بھائی بسورا کرتے۔

اپیا اماں کو سمجھا سمجھا کر تھک گئی تھیں اور تو اور کنعان بھائی بھی سو بار کہہ چکے تھے کہ وہ پرایا گھر نہیں۔ وہاں صرف ایک اپیا کی ساس ساتھ رہتی تھیں۔ مگر اماں نے جو کبھی اپنا مؤقف بدلا ہو۔

"اس گھر میں سب رعایتیں صرف افسوں کے لئے ہیں۔"

سب بھائی افسوں کے پیچھے پڑے رہتے، مگر افسوں کو کوئی فکر نہ تھا۔ ایک اپیا اس کی ہمنوا تھیں، اور بس دنیا میں اسے کسی سے کوئی سروکار نہ تھا۔ اور کبھی کبھی اپیا کے ہاں جا کر رہنا کتنا اچھا لگتا تھا۔

پھر اگلے سال اپیا کے ہاں "زری" آ گئی۔

اور اس سے اگلے سال "خوشی"

اپیا کو لڑکیاں اچھی لگتی تھیں۔ اس لئے اللہ نے ان کو اوپر تلے تین بیٹیاں عطا کی تھیں۔

اپیا کے کام بڑھ گئے تھے۔ اب اپیا کو احساس ہوتا تھا کہ کسی کے بچے کو پالنا اتنا مشکل نہیں جتنا اپنے بچوں کو۔

یہ کام تو اپیا بچپن سے کرتی آ رہی تھی، پر اب تھک جاتی۔ عاجز آ جاتی اور جب کنعان ان کو اس حالت میں دیکھتے تو کہتے۔

"بھئی افسوں کو بلا لو۔"

تب اپیا کو احساس ہوا کہ کنعان تو روایتی شوہر نہ تھے وہ افسوں کو بھی اسی طرح پیار کرتے تھے جس طرح اپیا کو کرتے تھے بلکہ اسے اپنی بیٹی سمجھتے تھے۔ اس کی ضدیں مانتے۔ اس کے ساتھ ہنسی مذاق کیا کرتے۔

اپیا نے جیسے اطمینان کی سانس لی۔

جب کنعان کو کوئی اعتراض نہ ہوا تو پھر اپیا کی ساس نے کیا کہنا تھا۔ سو افسوں ننھی

ٹھاٹھ سے اپیا کے گھر رہنے لگی۔

ذرا چھٹیاں ہوتیں، دوڑی آتی۔ اپیا بلاتیں تو کوئی نہ کوئی بہانہ کر کے آ ہی جاتی اور پھر دنوں لوٹ کر نہ جاتی۔ یہاں سے افسوں کا کالج بھی نزدیک پڑتا تھا۔

اماں پڑی پڑی چیخا کرتیں، مگر وہ کب سنتی تھی۔ وہ یہاں سارا دن پری، زری اور خوشی کے ساتھ مگن رہتی، ان کو گڑیاں بنا کر دیتی، گڑیوں کی شادی رچاتی۔ گڈی مرجاتی، تو گڈے کی دوسری شادی کروا دیتی۔ "خوشی" کے لئے پیارے پیارے فراک سیتی، ان کو انگریزی پڑھایا کرتی، کمرے میں بند کر کے ڈانس کرنا سکھاتی، گا گا کر گانے گانا سکھاتی اپیا سے ڈانٹ کھا کھا کر انہیں پکچر دکھانے لے جاتی۔

اپیا کی تینوں بیٹیوں کے نام بھی اس نے رکھے تھے۔

پری چہرہ

زرگل

اور خوش بخت۔

تینوں لڑکیاں اس سے اس قدر مانوس تھیں، جیسے افسوں اپیا سے ہوا کرتی تھی۔ خالہ خالہ کرتی اس کے پیچھے دیوانہ وار پھرا کرتیں۔ کنعان بھیا بھی خوش رہتے کہ افسوں نے گھر کا آدھا کام سنبھال لیا تھا۔ اپیا سوچا کرتیں۔ کون کہتا ہے، اس دنیا میں صلہ نہیں ملتا۔ بعض کاموں کا صلہ یہیں اس دنیا میں مل جاتا ہے۔

پر خنداں خنداں رہنے والی، خدمت گزار اور خوبرو اپیا کو ایک روگ لگ گیا۔ ایسا روگ جس کا دنیا میں کوئی علاج نہیں۔

اماں انہیں اپنے گھر لے آئیں۔ افسوں نے بچیوں کو سنبھال لیا۔ ڈاکٹر علاج میں لگ گئے۔ لیکن اپیا کو مہلت صرف چھ ماہ کی ملی۔

سب کو معلوم تھا کیا ہونے والا ہے مگر سب ہی معجزے کے منتظر تھے۔ دوائیں، دعائیں، التجائیں۔ سبھی کچھ تو ہو رہا تھا۔

اپیا کو بھی پتہ تھا، انہیں کیا ہونے والا ہے، وہ سب سے زیادہ سکون میں تھیں۔

شاید اب بھی انہوں نے جلدی سے سمجھوتہ کر لیا تھا سمجھوتہ کرنے کا ڈھنگ کچھ اپیا کو ہی آتا تھا۔

گو سب لوگ ان کے سامنے نہ پریشان شکل بناتے تھے اور نہ روتے تھے مگر وہ خوب جانتی تھیں کہ ان سب کے دل رو رہے ہیں۔

ہمیشہ کی بیمار اور لاچار اماں بی بیٹھی رہ گئیں اور ہنستی مسکراتی جگ مگ کرتی اپیا چل دیں۔

اپیا جس نے اماں کے چھ بچے پالے، اپنی تین بچیوں کا بوجھ نہ اٹھا سکیں جب سیج بچ ان کی سانس کی ڈوری ٹوٹی اور وہ ابدی سکون کی دنیا میں داخل ہو ہو گئیں تو سب سے زیادہ چلا چلا کر افسوں روئی۔ افسوں کو یوں لگا جیسے اس کی ماں مر گئی ہو، محبت مر گئی ہو۔ رفاقت مر گئی ہو۔

اور جتنی بار وہ تڑپ کر روئی، فہد کی گود میں منہ چھپا کر روئی۔

اب فہد کے سوا اس کے پاس کیا رہ گیا تھا۔

مگر یہ بھی اس کا فریب نظر تھا۔

وہ اکثر روتی رہتی، جبکہ سب گھر والوں کو صبر آ گیا تھا، وہ سوچتی، وہ آنا کیوں روتی ہے کیا اپیا کی مہربانیاں یاد کر کر کے، یا وہ ایک ظلم یاد کر کر کے جو اپیا جاتے جاتے کر گئی تھیں۔

فہد اماں کی ایک بچپن کی سہیلی کا بیٹا تھا۔ اماں اور وہ ایک ساتھ اسکول میں پڑھا کرتی تھیں پھر دونوں کی ایک ہی محلے میں شادی ہو گئی۔ اماں کو جوڑوں کی ایسی تکلیف ہوئی کہ چارپائی سے لگ گئیں۔ یہ بچے پیدا ہوتے رہے۔

خالہ رقیہ اگرچہ تنومند اور چاق و چوبند تھیں۔ مگر کوئی صحت مند بچہ نہ پیدا کر سکیں۔ یوں تو ان کے آٹھ دس بچے پیدا ہوئے، مگر پیدائش کے فوراً بعد یا شکم مادر میں ہی ختم ہو جاتے تھے۔

علاج معالجے کے علاوہ خالہ رقیہ تعویذ گنڈے بھی کراتی رہیں۔ پیروں فقیروں کے پاس بھی جاتی رہیں۔ ہر بار اماں سے دعا کرواتیں اور کہتی تھیں۔

"بیٹی ہوئی تو تمہیں دے دوں گی، تم پال لینا۔"

مگر نہ کوئی بیٹی ہوئی نہ بیٹا۔

اور جب وہ بالکل مایوس ہو چکی تھیں تو اللہ تعالیٰ نے فہد ان کی گود میں ڈال دیا۔ چالیس دن تک وہ اس کے مرنے کا انتظار کرتی رہیں۔ جب وہ بچ گیا تو لا کے اماں کی گود میں ڈال دیا، بولیں:

"تو اولاد کے معاملے میں نصیب والی ہے، لے اسے بھی پال دے۔ تیرے بچوں کی خیرات میں یہ بھی پل جائے گا۔"

تب اماں نے ننھے فہد کو سینے سے لگالیا۔ یہ تو اچھا ہوا کہ اماں کا دودھ کبھی نہ اترا ورنہ وہ فہد کو اپنا دودھ پلا دیتیں۔ کیونکہ فہد اور افسوں میں صرف چند ہفتوں کا فرق تھا فہد اور افسوں اماں کے گھر میں ایک ساتھ پلنے لگے۔ فہد کی اماں اس کو صرف رات کو لے جاتیں تھیں۔ ان کا عقیدہ اتنا راسخ تھا کہ جوان ہونے تک فہد کو ان کے گھر میں رکھا ان کے بچوں کا جھوٹا کھلاتیں اور ان کے بچوں کے اترے ہوئے کپڑے پہناتیں۔ انہوں نے منت مانی تھی۔ بیس سال تک وہ فہد کو دوسروں کی اُترن پہنائیں گی۔ ان کا بیٹا جیتا رہے۔

فہد فطرتاً بہت نرم خو اور ڈرپوک بچہ تھا، وہ کسی بات پہ ضد نہیں کرتا تھا۔ افسوں کے بھائی بہت تیز و طرار تھے۔ اس پر حکم چلایا کرتے اور نوکروں کی طرح اس سے کام لیتے۔ مگر وہ کبھی چوں چرا نہیں کرتا تھا، نہ اس کی ماں برا مانتی تھی۔

وہ ہمیشہ کہتی۔

"بہن! فہد میں نے تمہیں دے دیا ہے، اس کو اپنا بیٹا بنالو۔"

"ہاں" اماں بن کر کہتیں۔ "میں اسے گھر جوائی بنالوں گی۔"

اور سب اس پر ہنسا کرتے۔ یہ وہ بات تھی جو بچپن ہی سے افسوں کو بُری لگا کرتی۔ کمزور سا، مریل سا، یتیم سا فہد اس کو زہر لگتا۔ نہ شرارت کرتا، نہ بڑے بھائیوں کی طرح چیت لگاتا۔ مسمسی سی شکل بنا کر سامنے آکھڑا ہوتا۔ ہر وقت تعمیل کے لئے تیار رہتا اور جب کوئی مذاق میں کہہ دیتا۔

"تیری شادی تو فہد کے ساتھ ہوگی۔"

تو اس کو جیسے مرگی کا دورہ پڑ جاتا۔

روتی چلاتی، منہ سے جھاگیں نکالتی۔

کپڑے پھاڑ دیتی۔ چیزیں اٹھا کر مارتی۔ اندر سے دروازہ بند کر کے کھانا پینا چھوڑ دیتی۔

اور جب بھی کسی کو اس سے کوئی چیز ہتھیانی ہوتی یا اسے تنگ کرنا مقصود ہوتا۔ فہد کا نام لے لیتے۔ بس جی گھر میں ایک حشر بپا ہو جاتا۔ رفتہ رفتہ یہ بات سارے خاندان

میں مشہور ہو گئی۔ حتیٰ کہ اس کے اسکول تک بھی پہنچ گئی۔ جتنا لوگ اسے چھیڑتے اتنا ہی فہد کی نفرت اس کے دل میں بڑھتی۔ وہ چاہتی کہ فہد ان کے گھر آنا چھوڑ دے۔ سب کے احکام بجالانا چھوڑ دے مگر وہ کچھ بھی نہ کر سکتی تھی۔ انجام کار روتی اور چلاتی۔ کئی کئی دن تک اسکول نہ جاتی۔ بھائیوں سے بولنا چھوڑ دیتی۔ غرض ہر طرح سے اپنا حال خراب کرتی۔

پھر ایک دن ابا نے اسے اندر کمرے میں بند کر لیا اور بڑی دیر تک پیار سے سمجھاتی رہیں۔

دیکھو افسوں! اس دنیا میں جو شخص رونا چاہتا ہے۔ لوگ اسے رلاتے ہیں، جو چڑتا ہے لوگ اسے چڑاتے ہیں۔ جب کسی کو کسی کی کمزوری یا دُکھتی رگ کا پتہ چل جاتا ہے تو اسی جگہ پر ہاتھ رکھ دیتا ہے۔ جب تک تم چڑتی رہو گی۔ روتی رہو گی، احتجاج کرتی رہو گی سب تمہیں تنگ کرتے رہیں گے، سب تمہارا تماشہ بناتے رہیں گے۔

"جس دن تم نے تماشا بننا پسند نہ کیا، ڈٹ کر کھڑی ہو گئیں بُزدلی کا مظاہرہ نہ کیا تو لوگوں کی زبانیں بند ہو جائیں گی۔"

"یہ سب کس طرح ہو گا؟" اس نے آنسو پونچھ کر پوچھا۔

"اس طرح ہو گا کہ تم فہد کے نام سے چڑنا چھوڑ دو۔ اس بیچارے کی مجبوری ہے کہ اسے اس گھر میں آنا ہے۔ دیکھو تو وہ تمہاری وجہ سے کتنا سہما رہتا ہے اور پگلی! شادی بیاہ کے معاملے تو اللہ کے اختیار میں ہوتے ہیں۔ جہاں اس نے تمہارا مقدر لکھا ہے وہیں شادی ہو گی۔ خواہ ساری دنیا یک زبان ہو کر کسی کا بھی نام لیتی رہے۔ پھر اگر فہد تمہیں پسند نہیں تو ہم کس لئے ہیں؟ میں کس لئے ہوں، جب تم بڑی ہو جاؤ گی، جہاں کہو گی میں تمہاری شادی کر دوں گی۔"

اب تم ایسا کرو خود بھی نکو بننا چھوڑ دو اور فہد کو بھی بچالو۔

اور اس کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ فہد کے ساتھ خوب گھل مل کر رہا کرو۔ جب وہ گھر میں آئے تو منہ پھیر کر کمرہ نہ بند کیا کرو۔ اس کے پاس بیٹھا کرو، اس سے اپنے کام کروایا کرو اس کے ساتھ ہنسی مذاق کیا کرو۔ وہ غریب بھی اپنے کو مجرم نہیں سمجھے گا اور سب کی

زبانیں بند ہو جائیں گی۔

شاباش میری بہن ایسا کر کے دیکھو، صرف ایک بار میری خاطر کر کے دیکھو۔"

اس نے اثبات میں سر ہلایا۔

" اور پھر فہد بُرا لڑکا تو نہیں ہے، دیکھو تو کتنا مہذب اور لائق بچہ ہے، ہر سال اپنی کلاس میں فرسٹ آتا ہے۔ اماں کے کتنے کام کرتا ہے۔ میری کتنی عزت کرتا ہے تم کس بات کی اسے سزا دینا چاہتی ہو؟"

بات تھوڑی تھوڑی افسوں کی سمجھ میں آ گئی۔

رات کو اس نے سوچا اپیا ٹھیک کہتی ہیں، یہ سب کر کے دیکھنا چاہیئے۔ گو ایسا کرنا اسے بہت مشکل نظر آ رہا تھا۔

پر وہ اپیا سے وعدہ کر چکی تھی۔

اور تھوڑے دنوں میں اسے معلوم ہو گیا کہ یہ کچھ ایسا مشکل کام نہ تھا۔ فہد واقعی بہت اچھا لڑکا تھا۔ خصوصاً اسکول کے کام میں اس کی بڑی مدد کر دیتا۔ حساب میں تو وہ ازل سے کمزور تھی۔ کتنے اچھے طریقے سے اسے سب سوال سمجھا دیتا تھا تو اس کا ہم عمر مگر اپنی ذہانت کی وجہ سے اس سے دو جماعتیں آگے تھا۔ وہ اسکول میں دیر سے داخل ہوئی تھی۔ جبکہ اس کی امی نے چار سال کی عمر میں اسے داخل کرا دیا تھا۔

اب وہ میٹرک میں تھا اور افسوں مڈل میں تھی۔

پھر اس کا یہ معمول ہو گیا کہ رات کو فہد کے پاس بیٹھ کر اسکول کا کام کیا کرتی۔ اُس کے پڑھنے سے ایک یہ فائدہ ہوا کہ اس مرتبہ اس کی پوزیشن اچھی آ گئی۔

دیکھتے دیکھتے فہد سے اس کی بڑی پکی دوستی ہو گئی۔

اور دیکھتے ہی دیکھتے سب کی زبانیں آپ ہی آپ بند ہو گئیں۔ شروع شروع میں سب نے اس میل پر حیرت کا اظہار کیا۔ اسے تنگ کرنے کی کوشش کی، مگر وہ بھی اپیا کے فارمولے پر عمل پیرا رہی۔ اب سب خاموش ہو گئے تھے۔ اب ہر جگہ افسوں اور فہد اکٹھے نظر آتے، اب دونوں گھنٹوں کیرم کھیلا کرتے، لوڈو کھیلا کرتے، کتابیں پڑھا کرتے

شعر بھی جمع کیا کرتے۔

پھر جانے کیسے مہ و سال اُن کے اوپر سے نثار ہوتے رہے اور وہ اتنے بڑے ہو گئے کہ اپنی دھڑکنوں کا مفہوم جاننے لگے۔

دل کی زبان کا مفہوم بدل گیا تھا، جیسے وہ ایک دوسرے کی روح میں بس گئے تھے وُہ دبلا، پتلا، کمزور، زرد رُو اور احمق سا فہد لمبا تڑنگا اسمارٹ اور ذہین نوجوان بن گیا تھا اور افسوں گو قد میں اس سے بہت چھوٹی تھی۔ مگر صورت پر چاند سورج ٹک گئے تھے اور جب وہ ایک دوسرے کا چہرہ دیکھتے تو انہیں یوں محسوس ہوتا، وہ ایک دوسرے کے بغیر جی نہ سکیں گے۔

اب افسوں کا دل چاہتا کہ لوگ اسے فہد کے نام سے چھیڑیں، تنگ کریں۔ بار بار اس کا نام لے کر ستائیں۔ اس کی اور فہد کی شادی کا قصہ چھیڑیں۔ کہیں کہ وہ بچپن سے ایک دوسرے سے منسوب ہیں۔ اور وہ ہر بار شرما شرما کر سُرخ ہو جائے۔

ہائے کتنا اچھا لگتا ہے، یوں چھیڑنا اور لجانا۔ پر اب کوئی کچھ نہیں کہتا تھا۔ جانے کیوں اب لوگوں کی زبانیں بند ہو گئی تھیں۔ کیا انہیں نظر نہیں آتا تھا کہ وہ والہانہ ایک دوسرے کو دیکھتے ہیں۔ ایک دوسرے پر نثار ہیں، ایک دوسرے کو چاہتے ہیں۔ شاید کسی کو فرصت نہ تھی یہ سب دیکھنے کی۔ اپیا ٹھیک ہی کہتی تھیں۔ اب سب بے پرواہ ہو گئے تھے۔

فہد تو خیر بچپن ہی سے افسوں کو پسند کرتا تھا۔ افسوں کے لئے یہ جذبہ بالکل نیا تھا نفرت جب پلٹ کر محبت بنتی ہے تو دیوانگی اختیار کر لیتی ہے۔ ایسا ہی حال افسوں کا تھا ایک رات کے لئے وہ جدا ہوتے اور اگلے دن کہنے کے لئے ہزار باتیں ہوتیں۔

فہد کو بہار کا موسم بہت اچھا لگتا تھا۔

جب بہار آتی، پھول جوان ہوتے، خوشبوئیں فضاؤں میں بس جاتیں، وہ دیوانہ ہو جاتا۔

اس کی دیوانگی کا اکثر افسوں مذاق اڑایا کرتی تھی۔

"میرا تو دل چاہتا ہے۔" وہ فضا کو سونگھ سونگھ کر بولتی۔ "کہ بہار میں سفر کیا جائے لمبا سفر۔ اس دنیا کے کونے سے اس دنیا تک جہاں جہاں پھول کھلے ہیں۔ وہاں وہاں ہم جائیں چلتے جائیں، بس چلتے جائیں۔"

"نہیں۔ میرا تو دل چاہتا ہے۔"

وہ آنکھیں بند کر لیتا اور سادھوؤں کی طرح پالتی مار کے بیٹھ جاتا۔

"میرا تو دل چاہتا ہے۔"

"میں بہار کے بھرے موسم میں مر جاؤں۔"

"پاگل" افسوں قہقہہ لگا کر ہنستی۔

"یہ بھی کوئی مرنے کا سیزن ہے۔"

"جی ہاں۔ اس سے بہتر مرنے کا کوئی سیزن ہی نہیں ہو سکتا۔"

"او پگلے موت تو موسم نہیں دیکھا کرتی۔"

"ہاں مجھے معلوم ہے، مرنے سے وہ مراد نہیں جو تم لے رہی ہو۔"

"اچھا صوفی بننے کی کوشش نہ کرو۔"

تبھی وہ کہتا۔

"بھئی میں چاہتا ہوں، ہماری شادی بہار میں ہو۔"

"نہ بابا نہ۔"

وہ اٹھلا کر کہتی۔ "تمہارا تو مرنے کا بھی یہی سیزن ہے۔ ادھر شادی ہو اور ادھر تم مر جاؤ تو میں کیا کروں گی۔"

"پگلی"۔ اب وہ کہتا۔ "جب تمہیں پا لیا تو پھر کیوں مروں گا۔ موت آئی بھی تو اسے کہہ دوں گا۔ جاؤ بی بی! میں تو پہلے ہی اپنی اصلی موت کو گلے لگا چکا ہوں۔"

"کمینہ۔"

وہ اس کے پیچھے دوڑتی۔

اور کبھی کبھی وہ سر جوڑ کر بیٹھتے تو افسوں دور دیکھتے ہوئے کہتی۔

"سوچو فہد! کبھی اگر ایسا ہو کہ ہماری شادی نہ ہو سکے۔"

"مگر کیوں نہ ہو سکے، جب سب جانتے ہیں۔ ہم ایک دوسرے کو پسند کرتے ہیں اور خالہ بی نے تو پیدا ہوتے ہی مجھے گھر جوائی مان لیا تھا۔"

"فرض کرو۔ فرض بھی تو کیا جا سکتا ہے نا۔ کل کیا ہونے والا ہے۔ کسی کو کیا معلوم، فرض کرو۔"

افسوں کے اندر سے وہ عورت جھانکتی جو ہمیشہ آنے والے خطروں کا عرفان رکھتی ہے، جس کی ایک حس اسے بیدار رکھتی ہے۔

"تو پھر پتہ ہے کیا ہوگا۔"

"کیا؟"

"میں زہر کھالوں گا۔"

"اونہہ کبھی مردوں نے بھی زہر کھایا ہے، زہر ہمیشہ لڑکی کھاتی ہے اور مجھے لگ رہا ہے کہ زہر مجھے ہی کھانا پڑے گا۔"

"تم تو ازل سے بزدل ہو، میں تو فوراً زہر کھالوں گا۔"

"ہاں تم بڑے بہادر ہو نا۔"

"واقعی خودکشی کرنا بڑے دل گردے کا کام ہے، تم جیسی کمزور اور ڈرپوک لڑکیاں جو اندھیرے میں دوسرے کمرے میں نہیں جا سکتیں کبھی خودکشی نہیں کر سکتیں۔"

"ویسے فہد مجھے بہت ڈر لگتا ہے، دراصل مجھے موت سے ڈر لگتا ہے۔"

"جو بزدل ہیں وہ پہلے موت سے سو بار مرتے ہیں۔
دلاور اک دفعہ دنیا تے فانی سے گذرتے ہیں۔"

بڑے جوش میں آکر فہد یہ شعر پڑھتا اور پھر کہتا۔

"اب اس کا انگریزی ترجمہ سناؤں؟"

"مجھے پتہ ہے۔" وہ اسے روک دیتی۔ "تم نے پچھلی مرتبہ ڈی بیٹ میں اسی شعر کے انگریزی ترجمے پر ٹرافی جیتی ہے۔"

وہ ہنس پڑتا۔

"جلتی ہو مجھ سے۔"

"کیوں نہ جلوں۔" اتنے زیادہ نمبر لیتے ہو، ہر سال فرسٹ آتے ہو، اس پر مباحثوں میں انعام لینے لگے ہو۔"

"پگلی یہ سب تمہارے لئے ہے، تمہارے نام پر۔"

"اونہہ۔"

"جب تک تم میرے ساتھ ہو، میں اس ساری دنیا کو تسخیر کروں گا۔ تمہیں نہیں معلوم عورت کی محبت کیا چیز ہوتی ہے۔"

وہ دل میں کہتی۔

"تمہیں نہیں معلوم مرد کا عشق کیا چیز ہے۔ اس کے سامنے ساری دنیا بے حقیقت معلوم ہوتی ہے۔"

ہاں اپیا بھی اس کی بدلی ہوئی کیفیت محسوس کر رہی تھیں۔

ایک دن پوچھ ہی بیٹھیں۔

تب اس نے شرما کر اپیا کے گلے میں بانہیں ڈال دیں۔

اور پھر ان کے کان کے قریب منہ لے جا کر بولی۔

"اپیا یاد ہے، آپ نے ایک وعدہ کیا تھا۔"

"کیا؟" اپیا انجان بنتے ہوئے بولیں۔

"کہ جہاں میں کہوں گی آپ وہیں میری شادی کریں گی۔"

"ہاں وعدہ تو کیا تھا، مگر فہد کے ساتھ نہیں کہو گی نا۔"

"اپیا۔ اپیا۔۔۔" وہ مچل کر ان کے پیچھے پڑ گئی۔ "میں تو بس فہد سے ہی شادی کروں گی۔ اور کسی سے نہیں، کبھی نہیں۔ کبھی نہیں۔ ہوں تو یہ بات ہے۔"

اپیا مسکرا کر بولیں۔

"دیکھ افسوں تو پہلے بی۔ اے کر لے اور فہد کو ایم۔ اے کرنے دے۔ اس کے مستقبل کا سوال ہے۔ کیریئر کے بغیر آدمی اپنی وقعت کھو دیتا ہے اور شادی کے بعد اور جھمیلے شروع ہو جاتے ہیں۔ وہ ایم۔ اے کر لے تو اسے ملازم کروا دیں گے۔ پھر تمہاری شادی کر دیں گے۔"

"ٹھیک ہے۔"

"ہاں ٹھیک ہے۔"

"وعدہ۔"

"وعدہ۔"

حالانکہ افسوں کا دل پڑھائی میں ذرا نہیں لگتا تھا، نہ اُسے ڈگریوں کا شوق تھا مگر اپیا

سے اس نے وعدہ کر لیا تھا اور یہ کم بخت بی۔ اے پاس کرنا بھی ضروری تھا۔ نہیں پاس کی شرط اپیا نے نہیں لگائی۔ وہ صرف امتحان دے گی، پاس ہو یا نہ ہو اسے پروا نہیں۔ بس اس کا دل چاہتا جلدی سے شادی ہو جائے، مگر فہد پر ظاہر نہ کرتی۔

بڑا کمینہ تھا۔

چھیڑ چھیڑ کے اس کا ناطقہ بند کر دیتا۔

اس نے بی اے کا امتحان دے لیا تھا اور اسے پاس ہونے کی ہرگز توقع نہ تھی۔

اور فہد اپنا فائنل دے رہا تھا۔

جب اچانک اپیا بیمار ہو گئیں۔

اپیا بیمار کیا ہوئیں، ہنستا کھیلتا گھر نہ بھنور میں آ گیا۔

ڈاکٹروں نے کہا۔ باہر لے جاؤ۔ کنعان بھیا لندن لے گئے۔ چھ ماہ بعد واپس آ گئے، مگر زندگی کی مہلت نہ بڑھوا سکے۔

اس عرصہ میں اپیا کی تینوں بچیاں افسوں کے پاس رہیں۔ افسوں اور فہد ہر طرح سے ان کی دلداری میں لگے رہتے۔

افسوں نمازیں پڑھ پڑھ کر اپیا کے لئے دعائیں مانگا کرتی۔

جب اپیا واپس آئیں تو اماں کے گھر ہی رہیں۔ وہ شاید یہیں سے رخصت ہونا چاہتی تھیں۔

پھر یوں ختم ہونے لگیں جیسے مہیب رات میں دیئے کا تیل ختم ہوتا ہے۔ آخری بار دو تین بار بھڑکیں بھی۔

ہاں جب سب مایوس ہو جاتے، آنسوؤں کے ریلے بہہ جاتے تو وہ خاموشی سے آنکھیں کھول دیتیں اور اس طرح دیکھتیں جیسے کہہ رہی ہوں۔

"تمہیں کیا ہوا ہے لوگو؟"

اس آخری رات بھی جب آنسوؤں اور آہوں کا طوفان اٹھا تو افسوں دوڑ کر اپیا کے کمرے کو چلی۔ پیچھے پیچھے فہد بھی لپکا۔ ابھی ابھی دونوں نے مل کر پری، زری اور خوشی

کو سلایا تھا۔ بچیاں بڑی بے چین تھیں اور سونا نہیں چاہتی تھیں۔

جب دوڑ کر افسوں کمرے میں داخل ہوئی تو اچانک مردہ اپیا نے اپنی بے نور آنکھیں کھول دیں اور پھر یہ آنکھیں افسوں کے چہرے پر ٹک گئیں۔

افسوں کچھ نہ سمجھ سکی، روتی ہوئی قریب آئی اور پلنگ کے کنارے پر بیٹھ گئی۔

"اپیا۔ اپیا" بس وہ اتنا ہی کہہ سکی۔

"افسوں" اپیا کے لب ذرا سا ہلے، سب لوگ ہمہ تن گوش ہو گئے، جیسے سبھوں نے سانس روک لئے۔

"افسوں" وہ بہت آہستہ آواز میں بولیں۔ چونکہ سب لوگ ان کی طرف متوجہ تھے۔ اس واسطے اتنی ہلکی آواز کو سب نے ہی سن لیا۔

"افسوں... پیاری تم میری بچیوں کی ماں بن جانا"

"اپیا" افسوں زور سے چیخی۔

"وعدہ کرو، تم ان کی ماں بن جاؤ گی"

"اپیا.... اپیا...." افسوں چیختی رہی۔

"کنعان" انہوں نے شوہر کی طرف دیکھا۔

"میری بات یاد رکھنا"

"میری بچیوں کی ماں..... ماں..... افسوں...."

اور پھر وہ خاموش ہو گئیں۔ دل ٹھہر گیا۔ وجود ٹھنڈا ہو گیا۔ وہ چلی گئیں، نہ جانے کس دروازے سے، نہ کوئی پردہ ہلا، نہ کوئی چاپ ہوئی۔

مگر کمرہ اس طرح خالی ہو گیا۔ جس طرح سب کے دل خالی تھے۔

سب عزیزوں رشتہ داروں نے چیخ چیخ کر آسمان سر پر اٹھا لیا تھا۔ مگر اتنے شور کے باوجود کمرہ خالی تھا۔

کمرے میں کوئی نہیں تھا۔

وہ اتنی دور چلی گئی تھیں۔ جہاں دلدوز چیخیں نہیں پہنچ رہی تھیں۔ البتہ تینوں

بچیاں ڈر کر اٹھ گئیں تھیں اور اب کمرے میں آکر سب کو روتا دیکھ کر رو رہی تھیں ، چلا رہی تھیں، مگر انہیں اب بھی سمجھ نہیں آرہی تھی سب کے رونے کی وجہ کیا ہے۔

اور ماں یوں ساکت کیوں لیٹی ہے؟

ایک بات کہنے کے لئے انہوں نے تین دن لئے، تین دن تک سانس گلے میں اٹکی رہی، جو وہ کہنا چاہتی تھیں، کہہ نہ سکتی تھیں۔ اور کہے بنا وہ جا نہ سکتی تھیں، بالآخر انہوں نے فیصلہ کر لیا۔ سب کہہ ڈالا، تب پرواز کی طاقت مل گئی۔ پر اب پچھلوں کا حال ہو سو ہو۔ وہ یہ دیکھنے کو باقی نہ تھیں۔

"اپیا"

بیٹھی بیٹھی افسوں خلاؤں سے باتیں کیا کرتی۔

"آپ کو تو سب پتہ تھا، آپ تو سب جانتی تھیں۔ یہ دونوں پودے آپ ہی نے سینچے تھے، دل کا بھی اور محبت کا بھی"

پھر اپیا پھر۔

آپ نے جاتے جاتے یہ کیا کر دیا۔

یہ کیا کر دیا اپیا۔

بہت زیادہ چاہنے والی، مر مٹنے والی۔ جاوداں پیار لٹانے والی اپیا۔

یہ آپ نے کیا کر دیا؟

کیوں کر دیا؟

آپ کو دل توڑنا بھی آتا تھا۔

آپ سودا کرنا بھی جانتی تھیں۔

یہ میں نہ جانتی تھی۔

جاتے سمے کتنی بے دردی سے کہہ دیا۔

"تم ان کی ماں بن جانا"

اس سے تو اچھا تھا کہہ دیتیں۔ میرے بعد چونکہ تو میرا دکھ جھیل نہ سکے گی، پھندہ گلے میں ڈال کر مر جانا۔

یا اتنا ہی کہہ دیتیں۔ زندگی بھر کنواری رہنا اور میری بچیوں کو پالنا تو بھی اسے سو جان سے منظور ہوتا۔

واہ اپیا واہ۔

یہ کونسا محبت کا انداز تھا۔

یہ کونسا احسانوں کا بدلہ چکانے کا وقت تھا۔

احسان تو وہ ہوتا جو آپ کہتیں ابھی میرے ساتھ مرجا۔

مر مر کے جیئے جانے کی سزا کیوں دی۔

کیوں ری اپیا، او اپیا۔

پھر وہ خود ہی بیٹھے بیٹھے چیخنے چلّانے لگتی، رونے لگتی۔

تینوں بچیاں دوڑ کر اس کے پاس آجاتیں، اس سے لپٹ جاتیں، رونے لگتیں۔

اور خوفزدہ لہجے میں کہتیں۔

"کیا آپ بھی مرجائیں گی خالہ؟"

"پلیز آپ نہ مریئے گا افن خالہ۔"

"پہلے ہماری امّی مرگئی ہیں۔"

"اگر آپ مرگئیں تو ہم سے پیار کون کرے گا؟"

وہ انہیں سینے سے لگالیتی۔

ہاں اگر وہ مرگئی تو ان سے پیار کون کرے گا۔

پیار تو زندہ رہ کر کیا جاتا ہے۔

لیکن کیا وہ زندہ ہے۔

دن پر دن گذر رہے تھے، اس کے غم میں اضافہ ہو رہا تھا۔ اسے سمجھ نہیں آتی تھی۔ دراصل اسے کس بات کا غم ہے۔

گھر کی فضا ہی سوگوار تھی۔

نہ وہ کچھ کھاتی نہ پیتی۔ اپنے آپ سے بے نیاز سارا دن بچیوں کے ساتھ لگی رہتی اور شام کو زمین پر سو جاتی۔ کتنا اچھا لگتا تھا زمین پر سونا۔

جب آدمی عرش سے فرش پر گرتا ہے تو کانچ کے بنے ارمان اس طرح چور چور ہو جاتے ہیں۔

پھر کیا زمین اور کیا آسمان۔

امتیاز ہی مٹ جاتا ہے۔

ابھی اپیا کو گئے ایک مہینہ ہی گزرا تھا کہ ایک روز پھر لال لال آندھی کے جھکڑ اُٹھے چاروں طرف اتنا دھواں چھا گیا کہ آنکھیں بصارت سے محروم ہوگئیں۔ یوں لگا آسمان اور زمین ٹکرا ٹکرا کر پاش پاش ہو رہے ہیں۔

ہاں ـــــ وہ بھری بہار کی مہکتی ہوئی دوپہر تھی۔ مگر اچانک کالے بادل گھر گھر کر آگئے تھے۔

افسوں صحن میں زمین پر دوزانو بیٹھی تھی۔ وہ جانے کیا سوچ رہی تھی۔ بال کھلے تھے کپڑے میلے تھے اور دل ہمیشہ سے زیادہ ویران تھا۔

جب گھر کے باہر شور اٹھا اور پھر شور گھر کے اندر آگیا۔

"ہائے ہائے کچھ سنا تم نے۔"

جیسے سب آوازیں یہی کہہ رہی تھیں۔

"اب کیا ہے سننے کو۔"

افسوں نے دل میں سوچا۔

"ہے ہے کچھ سنا تم نے۔"

ایک عورت اسے جھنجوڑ رہی تھی۔

"فہد نے زہر کھالیا ہے اور اسے ہسپتال لے جا رہے ہیں۔"

فہد نے زہر کھالیا ہے۔

فہد نے زہر کھا لیا ہے۔

فہد نے زہر کھا لیا ہے۔

کتنی دیر تک گرد باد کی طرح یہی فقرہ اس کے ذہن میں چکر لگاتا رہا۔

مگر کیوں ؟

کیوں ؟

کیوں ؟

اس کا ذہن سُن ہو گیا۔

بہت سی عورتیں اندر آئیں۔ باہر گئیں۔ اس کے پاس آئیں، اماں کے پاس گئیں۔

سب نے بار بار اسے جھنجوڑا۔

پتہ نہیں سب اُسے کیا کہہ رہے تھے، اسے کچھ سمجھ نہیں آ رہی تھی۔

پھر سب لوگ باہر نکل گئے۔

وہ جیسے زمین کے ساتھ جم گئی۔

بدلیاں ہولے ہولے برسنے لگیں۔

وہ وہیں بیٹھی رہی۔

ایک گھنٹہ گذر گیا۔ دو اور پھر تین۔

اسے کیا کرنا چاہیئے۔

کیا فہد کے بچنے کی دُعا کرنی چاہیئے۔

یا اس کے مر جانے کی۔

بچنے کی کیوں ؟

اور مر جانے کی کیوں ؟

اب کیا ہونا چاہیئے ؟

وہ سوچنے سمجھنے سے عاری تھی۔

پھر دوبارہ گلی میں شور اٹھا۔ عورتیں بھاگ کر اندر آئیں۔ ایک نے اس کے دو ہتھڑ

مارا اور چیخ چیخ کر بولی۔

"فہد چل بسا"

"اری بدنصیب وہ چلا گیا ؟"

"اری اس نے ہسپتال جانے سے پہلے دم توڑ دیا"

تو وہ جیت گیا۔

وہ سچا تھا۔

وہ کہتا تھا، میں زہر کھا لوں گا۔ بھری بہار میں مر جاؤں گا۔

تو وہ مر گیا۔

بہت اچھا ہوا۔

پر وہ کیوں مر گیا ؟

سب لوگ اس کو گھسیٹتے تھے کہ چل کر اس کو دیکھ، مگر وہ اپنی جگہ سے ہل نہیں سکتی تھی، شاید زمین نے اسے پکڑ لیا تھا۔

لوگ اس پر حیران تھے۔

آخر میں فہد کی ماں روتی پیٹتی آئی اور بولی۔

آ اپنے دُولہا کو دیکھ، بارات لے کر جا رہا ہے"

مگر وہ بے ہوش ہو چکی تھی۔

جب اسے ہوش آیا تو اس کے پاس کوئی نہ تھا۔ بادل دھواں دھار برس رہے تھے، اک جل تھل تھی۔

میرے آنسو ان بادلوں کی آنکھوں میں کیوں چلے گئے۔

رونے کا یہ کیا انداز ہے کہ ساری دنیا بھیگ رہی ہے۔

وہ تب بھی بیٹھی رہی۔

صبح جب اسے وہاں سے اٹھایا گیا تو اسے تیز بخار کے ساتھ نمونیا ہو چکا تھا۔

کئی دن تک تو ہوش نہیں آیا۔

سب کا خیال تھا اب وہ بھی جائے گی اپنے دُولہا کے پاس۔
کبھی کبھی جب اسے ہوش آتا، وہ بھی یہی سوچتی کہ چلو زندگی سے تو چھوٹیں گے۔
شاید اللہ کو ترس آ گیا۔ یوں منزل مل جاتے اور حشر کے دن اپیا سے شرمندگی بھی نہ ہوگی
مگر تین ہفتے چارپائی پہ لیٹے لیٹے جب وہ بچ گئی تو اسے اپنی سخت جانی پر
بڑی شرمندگی ہوئی۔
کیا عشق کا سودا جھوٹا تھا؟
یا بزدِل تھی وہ۔
مر بھی نہ سکی۔
فہد ٹھیک کہتا تھا۔
اپنی مرضی سے مرنا بھی بہادروں کا کام ہے۔ بُزدِل لوگ خودکشی نہیں کر سکتے
کتنی بار اس نے مرنا چاہا۔ مرنے کی خواہش کی۔
دوائیوں سے ناراض رہی، خوراک چھوڑ دی۔
بالآخر وہ بچ گئی۔
چھ مہینے بعد چلنے پھرنے کے قابل بھی ہو گئی۔
دن، ہفتے اور مہینے اسی سرعت سے بدلتے رہتے ہیں۔ انہیں کیا خبر کہ لوگوں
پر کیا بیت رہی ہے۔
ایک انسان پہلے کیا تھا اور اب کیا ہو گیا ہے۔
وہ بالکل بدل گئی تھی۔
ایسا لگتا تھا، اس کا ڈھانچہ وہی ہے، لیکن اس کا باطن کسی نے نکال کر پھینک
دیا ہے۔
جینے کی ایک یہ بھی قسم ہوتی ہے۔
جب آگے کچھ نظر نہیں آتا۔ پیچھے جانے کا راستہ نہیں ملتا۔ تب موت ایک ایسی
مشعل نظر آتی ہے۔ جو راہ دکھا سکتی ہے۔

مگر موت تو بالکل اپنی مرضی کی مالک ہے۔
وہ ایسے جی رہی تھی جیسے زادِ راہ اور ٹکٹ کے بغیر کوئی شخص گاڑی میں بیٹھ گیا اور اسے
علم بھی نہ ہو کہ اس نے کون سے اسٹیشن پر اترنا ہے اور جب سارے اسٹیشن ختم ہو جائیں گے
تو پھر کیا ہو گا؟
گاڑی الٹا چلنا شروع ہو جائے گی۔
ممکن ہے اسے اسی پہلے اسٹیشن پر اتار دے۔
سوہ گاڑی کے الٹا چلنے کی منتظر بیٹھی تھی۔
پھر ایک سال گزر گیا۔
پری، نرزی اور خوشی اس کے ساتھ تھیں۔ وہ ان کی خدمت میں بالکل کوتاہی نہیں
کر رہی تھی۔
یہ فرض بہرحال اسے ادا کرنا تھا۔
بچیاں اس کے سوا کسی کے پاس نہ جاتی تھیں۔ شام کو ذرا سی دیر کے لئے کنعان
بھی دیکھنے آ جاتے۔
پھر سب لوگوں نے اماں کے کان میں وقت کا منتر پھونکنا شروع کر دیا۔
کب تک بٹھائے رکھو گی؟
بیٹی کی روح بے قرار ہو گی؟
"اس کی وصیت پر عمل کر ڈالو"
سال تو بیت گیا ہے۔
اب کس بات کا انتظار ہے۔
بچیاں بھی اسی کو ماں سمجھ رہی ہیں۔
"اور جوان آدمی کا ہر شام گھر میں آنا ٹھیک بھی نہیں"
آخری وار اماں کے دِل پر کاری لگا۔
وہ چاہتی تھیں، افسوں کنعان سے شادی کرے، مگر کہنے کی ہمت نہیں پا رہی

تھیں، جب عزیزوں اور رشتہ داروں اور ملنے جلنے والوں نے اماں کو اکسانا شروع کیا تو ان میں ہمت پیدا ہوئی۔

بہت سے مسئلے ان لوگوں کی وجہ سے ہی کھڑے ہو جاتے ہیں یا حل ہو جاتے ہیں بچارے چپ بیٹھ جو نہیں سکتے۔

اماں نے اسے کہلوانا شروع کیا۔

تو وہ سوچ میں پڑ گئی۔ شادی کیا ہوتی ہے۔ کبھی لاش کی بھی شادی ہوتی ہے اور شادی تو دو روحوں کا سنگم ہے، صرف ایک وجود سے شادی نہیں ہو سکتی۔ فہد نے بھی ساتھ چھوڑ دیا۔ اکیلے اکیلے شادی رچالی۔ جلد باز تھا۔ ہمیشہ کا جذباتی تھا۔ میرا فیصلہ بھی نہ سُنا۔ شاید ابا سے معافی مانگ لیتی، کنعان سے بچیاں لے لیتی۔ دوسری طرح ان کی ماں بن جاتی، اُن کی خاطر جوگ لے لیتی۔ اپنا بچہ ہی نہ پیدا کرتی۔ وقت گذرنے کے ساتھ ساتھ کوئی حل نکال ہی لیتی؛ لیکن اب یہ سب کس کے لئے؟

اس پر اماں نے ایک نیا طریقہ نکالا۔

بار بار پیار اور زور سے کہلوایا۔

"اچھی خالہ آپ ہماری امی بن جائیں نا"

پلیز ہمارے گھر میں چل کر رہیں، جہاں ہماری امی رہتی تھیں۔

ہم اپنے ابو کے پاس رہنا چاہتی ہیں۔

وہاں ہماری امی کی یادیں ہیں۔

نہیں اس طرح نہیں، ہماری امی بن کر۔

تو اپیا تم جیت جاؤ گی۔ اس نے سوگواری سے سوچا۔ میں جانتی ہوں تم جیت جاؤ گی۔ تمہاری راہیں فہد نے آسان کر دیں اور میری مشکل کر دیں۔

کس کی خاطر جنگلوں میں نکل جاؤں؟

کس کے آگے دامن پھیلاؤں؟

کسی اور شبستان مہکانے کی اس میں ہمت نہ تھی۔ اس نے سناٹوں کے شہر میں

دفن ہونا گوارا کر لیا۔

کبھی کبھی اپنے دفن ہونے کا نظارہ خود کرنا چاہیئے۔

شادی کا دن مقرر ہو گیا۔

مگر گھر میں نہ ڈھولک بجی، نہ جہیز کی رم جھم شروع ہوئی۔ اماں نے جو بنا رکھا تھا۔ اسی پر اکتفا کیا، نہ سہیلیاں چھیڑنے کے لئے آئیں نہ سہاگنوں نے وصال کے گیت چھیڑے۔

جو بھی گھر میں آتا، اس کے بجھے ہوئے زرد چہرے کو دیکھ کر ایک لمبی آہ کھینچتا اور پھر منہ ہی منہ میں کچھ بڑبڑاتا چلا جاتا۔

پتہ نہیں اس کے چہرے پر کیا لکھا تھا۔

وہ ہنستی "کیا اس طرح شادی کی مبارک باد دیتے ہیں"۔

البتہ پری، زری اور خوشی ہنستی مچلتی اندر باہر جاتیں۔ تالیاں بجاتیں۔ مہندی اور غرارے کی فرمائشیں کرتیں۔

انہیں کیا معلوم کیا ہونے جا رہا ہے۔

ان کو تو اس بات کی خوشی تھی۔ افن خالہ ان کی امی بن رہی ہیں اور اب ہمیشہ ان کے ساتھ ان کے گھر میں رہے گی۔ جہاں اندر سے کمرہ بند کر کے انہیں گانے سناتی تھیں ڈانس کرتی تھیں، اور ان کو لطیفے سناتی تھیں۔

فلمیں دکھاتی تھی۔ اچھے اچھے فراک سی کر دیتی تھی۔

ابا بھی وہیں ہوں گے، زندگی پھر لوٹ آئے گی۔

افسوں نے شور نہیں کیا، غل نہیں مچایا۔ واویلا نہیں کیا۔

شادی والا دن کیسا ویران تھا۔

سب لوگ اس طرح شرکت کے لئے آئے جیسے چور ہیں۔ ہر کوئی احتیاط سے بات کر رہا تھا۔ قہقہہ لگا کر ہنسنا جرم سمجھا جا رہا تھا۔

اُس نے نہ مہندی لگائی، نہ سُرخ جوڑا پہنا، ایک ہلکے گلابی رنگ کا جوڑا کسی نے پہنا دیا اور اس کے مقدر میں رکھے گئے زیور بھی پہنا دیئے۔

سب سنگھار کئے وہ یوں منہ چھپائے بیٹھی تھی، جیسے کسی نے منہ پر کالک مل دی ہو۔

نکاح بھی اسی انداز میں ہو گیا۔

چھوہارے بھی بٹ گئے، لوگوں نے مبارک سلامت بھی کیا مگر ہر آواز اُسے بین کی آواز لگ رہی تھی۔

جب رُخصتی کا وقت آیا تو کسی میں اتنی جُرأت نہ تھی۔ اُسے پکڑ کر موٹر میں بٹھاتا۔ سب کا خیال تھا وہ کچھ اس طرح روئے گی کہ آسمان کا کلیجہ شق ہو جائے گا۔ اور زمین کانپ اُٹھے گی۔

لوگوں کی ایما پاکر وہ خود پاؤں پاؤں چلتی ہوئی آئی اور موٹر میں بیٹھ گئی۔ نہ روئی نہ آنسو بہائے، نہ کسی کے کندھے کے احسان اٹھائے۔

اسی گھر سے اماں نے ابا کو گلے لگا لگا کر رُخصت کیا تھا اور محلے کی کئی لڑکیوں کے سر پر ہاتھ رکھا تھا اور اب دور بیٹھی یوں تسبیح ہلا رہی تھیں جیسے پتھر بن گئی ہوں۔ نہ کچھ دیکھ رہی ہیں اور نہ کچھ سُن رہی ہیں۔ اس نے بھی اماں کے قدم چھونے کی ضرورت نہ سمجھی۔

جانے کب کس کا کلیجہ پھٹ جائے۔

موٹر میں کنعان پہلے سے بیٹھے تھے، ان کے گلے میں ایک ہار تھا بس۔

اور اس طرح سر جھکائے بیٹھے تھے۔ جیسے بیچ بازار میں نقب لگاتے پکڑے گئے ہوں اور اب نظر ملانے کا حوصلہ نہ ہو۔

ان کے سفید بال صاف نظر آرہے تھے۔ اپیا کے بعد وہ ایک دم بوڑھے ہو گئے تھے۔ البتہ تینوں لڑکیاں زرق برق کپڑے پہنے ان کے ارد گرد اور گود میں بیٹھی اٹھلا رہی تھیں۔ کیوں نہ اٹھلاتیں اپنے ابا کی بارات لے کر جا رہی تھیں۔

موٹر جنبش میں آگئی۔

بھائیوں نے کیا کہا، کس کس نے ہاتھ ملایا وہ اپنے پیروں کی جانب دیکھ رہی تھی۔

"اے دنیا کے خود ساختہ دستور! کیا ایک بہن کی قربان گاہ پہ دوسری کو بھینٹ چڑھانا جائز ہے۔

صرف سگی بہن ہی کیوں اچھی ماں تصور کر لی جاتی ہے۔ ماں تو بہت سی عورتیں بن جاتی ہیں۔ ایک ماں کے لئے دوشیزہ کا دل توڑ دیتے ہو۔

بزرگو!

تم زندگی کی قیمت نہیں جانتے، زندگی جو صرف ایک بار ملتی ہے۔ جھوٹے برتن میں کھانا کون پسند کرتا ہے۔ ہر لڑکی اپنے ارمان اور آرزوئیں لے کر پیدا ہوتی ہے۔

ہر لڑکی کے خیال میں ایک جنت ہوتی ہے۔ ہر لڑکی کے احساسات کی ایک مختلف زبان ہوتی ہے۔

ہر لڑکی اپنی سیج پہ تازہ پھول بچھانا چاہتی ہے۔

تم سیج کو قبر کیوں بنانا چاہتے ہو۔

قتل کرنے کے تو اور بھی طریقے ہیں۔ شرع اور قانون تمہیں کیوں معاف کر دیتے ہیں۔ کیوں کہ تم ہی لوگ شرع اور قانون وضع کرنے والے ہو؟

تمہاری گردن پر کسی کا خون کیوں نہیں ہوتا؟

تم سے قصاص کیوں نہیں مانگا جاتا؟

پھر دلہن کی سہاگ رات آگئی۔

آخر اس رات سے کب تک بچتا؟ اس نے تو زندگی میں کبھی نہ کبھی آنا تھا۔ اس طرح نہ آتی، اس طرح آگئی۔ اس نے بے وفا فہد کو یاد نہیں کیا۔ اس رات سے اس کا کیا تعلق تھا۔ اس نے تو اسے جاتے سمے دیکھا بھی نہیں تھا کہ وہ اس کا وہی تر و تازہ چہرہ ذہن میں محفوظ رکھنا چاہتی تھی۔

پھر کہیں سے اپیا نکل آئیں اور بولیں۔

فہد میرے پاس ہے، مزے میں ہے، اس کی فکر نہ کرو۔ جس طرح ساری زندگی کا زہر پیا ہے، یہ آخری گھونٹ بھی پی جاؤ، میری خاطر، میری بچیوں کی خاطر۔

اونہہ۔ وہ ہنس پڑی۔

کیسا تھا حجلۂ عروسی، نہ پھولوں کی چادر، نہ خوشبو کے فوارے، نہ روشنی کے قمقمے، ہاں یہ وہی کمرہ تو تھا۔ جہاں اپیا نے بہت سے شب و روز ہنستے کھیلتے گذارے تھے، ان کی سہاگ رات کی خوشبو یہاں پھیلی ہوئی تھی۔

آنکھیں تو بند کی جا سکتی تھیں مگر رواں رواں انگارہ بن رہا تھا۔

روئیں روئیں کے کرب پر کیونکر ہاتھ رکھا جا سکتا تھا۔

ہر رات ایک پل صراط سے گذرنا ہوگا۔

ہر صبح ایک نیا دریا پار کرنا ہوگا۔

اس نے کپڑے بدلے اور بچیوں کے کمرے میں چلی گئی۔ وہ اسے بلا رہی تھیں۔

روز کی طرح انہیں سلایا، پھر اسی کمرے میں آگئی۔ دل تو چاہ رہا تھا، بچیوں کے ساتھ ہی سو جاتے۔ مگر دنیا کا ڈر تھا۔ اب تک اگر احتجاج نہیں کیا تھا تو ایک غلط قدم اٹھا کر وہ دنیا کو افسانے اور کہانیاں نہیں دینا چاہتی۔

ان قصے کہانیوں کے سب منتظر تھے۔

تھوڑی دیر بعد کنعان کمرے میں آگئے۔

اس نے نظر اٹھا کر دیکھا۔

کیسا تنا تنا ان کا چہرہ تھا۔ ایک ایک قدم تنا رہا تھا۔ زبردستی اندر دھکیلا گیا ہے۔

آخر اُن پر بھی تو کچھ گذر رہی ہوگی۔

بیوی یاد آ رہی ہوگی۔

جس لڑکی کو ہمیشہ بیٹی کہا۔ اس سے نیا رشتہ استوار کرنا مشکل لگ رہا ہوگا۔

مگر یہ تو مرد ہیں۔

یہ تو کہہ سکتے تھے، میں عائشہ کے بعد کسی سے شادی نہیں کرنا چاہتا۔ یہ مرد ہیں ان کو معاشرہ احتجاج کا پُورا پُورا حق دیتا ہے۔ مگر یہ بھی خود غرض بن گئے۔

اپیا۔

ہاں اپیا ہی سب کی مجبوری بن گئیں۔

وہ آ کر ایک کرسی میں بیٹھ گئے۔ تھکے تھکے، لُٹے لُٹے۔

شاید ان کے پاس کہنے کو کچھ نہیں تھا۔ اور وہ یہ بھی جانتے تھے کہ افسوں نے سب کچھ فہد سے سننا چاہا تھا۔

اُن کے چہرے پر عجیب سی اُلجھن تھی۔

اس رات کا نُور نہ تھا، چاند گہنا جا چکا تھا۔ وہ اپنی باری بھگت چکے تھے۔ کسی اور کی باری بھگتنا کوئی آسان کام نہیں تھا۔

اور اس رات کے کچھ تقاضے تھے جنہیں پُورے کئے بنا دونوں آگے نہ بڑھ سکتے تھے۔ مگر دونوں میں اُمنگ نہ تھی۔ مگر دُنیا بھی کوئی شے ہے نا؟

یہی دُنیا جس نے انہیں قدم قدم پر گھائل کیا تھا۔

دونوں اپنی جگہ پتھر ہوئے بیٹھے تھے۔

افسوں نے احتیاطاً نیند کی گولیاں اپنے پرس میں رکھ لی تھیں، کبھی کبھی اس پر انتقامی جذبہ طاری ہو جاتا تھا۔ آخر وہ کیوں نہ سب سے بدلہ لے، وہ جانتی تھی ایک ایسا مشکل موڑ آئے گا۔ جب یہ گولیاں کام آئیں گی۔

اُس نے پرس میں سے شیشی نکالی۔

شیشی میں سے اپیا نکل آئیں۔

واہ اچھی بے وفائی ہے۔ میری سیج کے مُنہ پہ کالک مل رہی ہو۔ حوصلہ نہیں تھا تو یہاں تک کیوں آئیں۔ وہیں کیوں نہ ختم ہو گئیں۔

میرا رُوپ اختیار کر کے، میری مامتا کا رُوپ چڑھا کے اب میری بچیوں کو دھوکا دینا چاہتی ہو۔ صبح تمہاری لاش دیکھ کر ان کا کیا حال ہوگا؛ ان کا دنیا پر سے اعتبار اُٹھ جائے گا۔ وہ ماں کا نام لیتے ہوئے خوف کھائیں گی۔ میرا شوہر مجرم بنا دنیا سے مُنہ چھپاتا پھرے گا زندگی کسی کے نام پر لگاتی ہے تو اس کا حق بھی اسے دے دو۔ ایثار کیا ہے تو اس کا صلہ اتنی جلدی نہ مانگو، درد شدید ہے تو ضبط کرو آہ بھرنے سے کم نہ ہوگا۔ عادت ڈالنے سے کم محسوس ہوگا۔

افسوں کے ہاتھ لرزنے لگے۔

اُس نے صرف ایک گولی نکالی اور پانی کے ساتھ نگل لی۔

اس کے بنا چارہ نہ تھا۔

اب آگے کیا ہونا ہے۔ وہ جانتی تھی۔ یہ آخری پُل صراط تھا۔ مگر اُسے ڈر تھا، اس کا پاؤں پھسل جائے گا اور جہنم میں جا گرے گی۔ اس جہنم سے یہ جہنم بہتر تھا۔ وہ ہوش سے بیگانہ ہو کر اس پُل صراط سے گذرنا چاہتی تھی۔

گو لاش احساس سے عاری ہوتی ہے۔ مگر زندہ ذہن لاش کی چیخوں کو سُن لیتا ہے اور پھر دُنیا کا منہ بھی بند کرنا تھا۔ دُنیا جبڑے پھاڑے کھڑی تھی، کل کی طرف دیکھ رہی تھی۔

رفتہ رفتہ وہ نیند کی آغوش میں ڈوب گئی۔

کنعان جانتے تھے، اس نے ایسا کیوں کیا؛

ان کو بھی ایک مشکل مرحلے سے گزرنا تھا۔ کیا مرد کے احساسات نہیں ہوتے کاش وہ بھی گولی کھا سکتے، احساس سے عاری ہو جاتے۔

اس کے بعد بھی یہی گولیاں اس کا مدار ہیں، اور انہی کے دم سے سُہاگ راتیں گذرنے لگیں۔

اگر نیند کی گولیاں ہزار سال پہلے ایجاد ہو چکی ہوتیں تو پھر آج دُنیا میں کوئی مذہب نہ ہوتا۔

اس نے کبھی اپنے ہوش و حواس میں اپنے لٹنے کا تماشا نہیں دیکھا، نہ آنکھوں کو گنہ گار کیا۔ نہ لب سے ہائے نکالی۔

البتہ اوپر تلے دو بیٹے ہو گئے۔

ساحل اور کامل

کتنی عجیب سی بات لگتی ہے۔ وہ اپنا پھولا ہوا پیٹ دیکھ کر سوچا کرتی وہ بچے کی ماں بننے والی ہے۔

مگر کیسے؟

یہ اسے یاد نہیں، مگر لوگ ضرور دلشاد ہو گئے ہیں کہ چلو جی میاں بیوی راضی...

میاں بیوی کی رضامندی کا سرٹیفکیٹ یہی بچے تو ہیں۔

ورنہ جو عورت بیوی نہ بن سکی وہ ماں کیسے بن سکتی ہے۔

کیا یہ ازدواجی زندگی ہے؟

وہ سارا دن مشین کی طرح کام کرتی رہتی۔

نہ کبھی اچھے کپڑے پہنے، نہ سنگھار کیا، نہ بال قرینے سے بنائے، گھر کو صاف ستھرا کر کے کھانا پکانے میں لگ جاتی۔ وہاں سے فارغ ہوتی تو بچوں کے اسکول سے آنے کا وقت ہو جاتا، ان کے کپڑے نکال کر رکھتی، انہیں کھانا کھلاتی۔ شام کے کاموں سے فارغ ہو کر انہیں پڑھانے بیٹھ جاتی۔

گھر میں کون آیا، کون گیا۔ اسے سروکار نہ تھا۔ کبھی جو سامنا ہو، تو سلام کر دیا۔ ورنہ اپنے کام میں مگن رہی۔ رات کو بچوں کو کھانا کھلا کر اپنے اپنے کمرے میں سلا کر جب وہ فارغ ہوتی تو تھک کر چور ہو چکی ہوتی، پھر جو سوتی تو صبح اذان کے وقت ہی اس کی آنکھ کھُل جاتی۔ نماز پڑھ کر پھر کام میں جُت جاتی۔

اس کو یہی زندگی پسند تھی۔

مگر کبھی کبھی اسے کنعان پہ بڑا ترس آتا۔ شام کو دفتر سے آ کر اس طرح چپ چاپ بیٹھ جاتے، جیسے ان سے بڑا مظلوم کوئی نہیں۔ ان کے سارے کام افسوں کہے بنا کر دیتی تھی۔ ان کی عادتوں سے واقف تھی۔ یا وہ انہیں بات چیت کا زیادہ موقع نہیں دینا چاہتی تھی اور وہ بھی اس سے بہت مختصر بات کرتے تھے، جیسے ڈرتے ہوں۔ تھوڑی سی بات کو ہی وہ اچھی طرح سمجھ جاتی اور چاہتی بن کہے اُن کے سارے کام پورے ہوتے رہیں۔

شام کو جب شوہر گھر آتا ہے، تو بیوی کے پاس ہزار باتیں ہوتی ہیں کہنے کو، اور نہیں تو وہ کوئی سا بقہ لڑائی ہی کھاتے میں نکال لاتی ہے، اور دیر سے آنے پر تو اکثر میاں بیوی اُلجھ پڑتے ہیں۔

مگر وہ خود چاہتی تھی کنعان دیر سے آئیں۔ وہ اپنی دلچسپیاں باہر کی دُنیا میں ڈھونڈ لیں۔ وہ کلب جائیں۔

اسے تو دور رہنے کا بہانہ مل جائے گا۔ پھر وہ مرد ہیں۔ ان کو بھرپور زندگی گذارنے کا حق ہے، کچھ بھی کریں۔ کریں تو۔

مگر کیسی یتیم شکل بنا کر سر شام گھر آ جاتے ہیں۔

ہاں بچوں سے ذرا گپ شپ ہو جاتی ہے۔ اس کے بعد وہ کوئی رسالہ یا کتاب لے کر ایک طرف بیٹھ جاتے ہیں۔ بعض اوقات رات گئے تک بیٹھتے رہتے۔

افسوں نے عام بیویوں کی مانند اس بات پر شور نہیں مچایا۔ بس اپنا پلنگ ذرا دُور لے گئی، جہاں اُن کے ٹیبل لیمپ کی روشنی نہ پڑتی ہو۔

انہوں نے استفسار نہیں کیا۔

جیسے دونوں یہ بات سمجھتے ہوں۔

وہ تو ویسے بھی "رابوٹ" کی مانند گھر کے سارے فرائض ادا کرتی رہتی تھی مگر کنعان کو گھر آباد کرنے کا کیا فائدہ ہوا؟

البتہ ان کی والدہ کبھی کبھی غصّہ کرتی اور پھر یوں نکالتی۔

"اے دُلہن چوڑیاں تو پہنا کرو۔ کتنی بُری لگتی ہیں سُونی کلائیاں!"

"مجھے عادت نہیں ہے۔"

"پہنو گی تو عادت ہو جائے گی۔"

"کام نہ کیا جائے گا۔"

"ارے دو چار ہی پہن لو۔"

"دانے نکل آتے ہیں کلائیوں پر۔"

"تو وہ کس کام کی ہیں اتنی چوڑیاں۔"

"بچیوں کے کام آئیں گی، بنک میں رکھ چھوڑی ہیں۔"

زیوروں سے اسے سخت نفرت تھی۔ حتیٰ کہ اس کے ہاتھ میں ایک انگوٹھی تک نہ ہوتی۔ ساس کہہ کہہ کر تھک گئی۔ عزیزوں، ہمسایوں نے سمجھایا، مگر اس نے ایک زیور بھی گھر پر نہ رکھا۔ جا کر لاکر میں رکھ آتی۔ تاکہ یہ روز روز کی کِل کِل تو تھے۔

ایک روز اس کی ساس کی ایک سہیلی کہہ رہی تھی۔

"آپ کی یہ بہو تو بہت ہی کم گو ہے، ہم نے تو اسے کبھی ہنستے دیکھا ہی نہیں"

"شرمیلی ہے۔"

ساس نے بُرا سا مُنہ بنا کر دھیرے سے کہا۔

پھر ذرا آواز بُلند کر کے کہنے لگی۔

"میری عائشہ بڑی ہی خوش مزاج تھی۔ ہر وقت چہرے پر مُسکراہٹ رہتی۔ کام کرتے وقت بالکل ایسا دکھائی دیتا کہ احسان کر رہی ہے۔ خندہ پیشانی سے ہر کام کرتی اور ہر ایک سے بڑی خوش مزاجی سے ملتی تھی! اور بڑوں کا کہا تو ایسے مانتی جیسے اس کے ایمان میں فرق پڑ جائے گا۔ بھئی آج کل کی پڑھی لکھی لڑکیاں بھی عجیب ہیں۔ ان کے ماتھے پر ہمیشہ شکنیں ہی رہتی ہیں۔ کچھ بھی کہہ لو، مجال ہے کہ مان جائیں۔ ڈھٹائی میں ان کا کوئی ثانی نہیں اور یوں ہر کام کریں گی۔ جیسے احسان کر رہی ہوں۔ بس بوا ان کا کچھ پوچھو ہی نہیں۔"

وہ خاموش بیٹھی ساگ کاٹتی رہی۔

جانتی تھی سب اسے سنانے کو کہا جا رہا ہے۔ مگر یوں بن گئی جیسے بہری ہو۔ ہزار باتیں وہ چور چور ہوئی تھی۔ شکستہ دِل کی آواز اس نے کئی بار سُنی تھی۔ تمناؤں کا تڑپنا بھی دیکھا تھا۔ جسم کا سلگنا بھی دیکھا تھا اب کوئی بات بُری نہیں لگتی تھی۔

نہ کسی بات پہ غصہ آتا تھا۔

نہ پلٹ کر جواب دینے کو دِل چاہتا تھا۔

خاموشی کا لبادہ اوڑھے اور تن مَن سے بے پروا ہوئی بیٹھی تھی۔

وہ خاموشی کا ایسا کنواں بن گئی تھی۔ جس میں کنکر پھینکنے سے کوئی آواز نہ پیدا ہوتی تھی۔

خاموشی موت کا دوسرا نام ہے۔

اور مرے ہوئے لوگ نہ بُرا مانتے ہیں اور نہ پلٹ کر جواب دیتے ہیں۔ ویسے دوسروں کو دل کی بھڑاس نکالنے کا پُورا پُورا حق مِلنا چاہیئے اور موقع بھی۔

تین بیٹیاں اور دو بیٹے اس کی زندگی کا مقصد بنے ہوئے تھے۔
ان کو پروان چڑھانا اور اپنی اپنی منزل کی جانب روانہ کرنا ہی دنیا میں اس کا کام رہ گیا تھا۔
اور وہ جس فرض کو زندگی کا مقصد بنائے ہوئے تھی۔ ایک دن کھل کر سامنے آ گیا۔
تینوں چھوٹے بچے آپس میں لڑ رہے تھے۔ خوشی اور ساحل کی تو بہت ہی لڑائی رہتی۔ پھر کامل بھی اپنے بھائی کا ساتھ دینے کو محاذ میں شامل ہو جاتا۔ جس گھر میں دو چار بچے ہوں جھگڑتے ہی رہتے ہیں۔ افسوں اس بات پر توجہ نہ دیتی تھی۔
کیونکہ پری اب سیانی ہو گئی تھی۔ میٹرک میں پڑھتی تھی۔ گھر کے کاموں میں اس کا ہاتھ بٹاتی تھی۔ بالکل اس کی چھوٹی بہن لگتی۔ شکل بھی دونوں کی بہت ملتی تھی۔ اکثر لوگ سمجھتے تھے، وہ اس کی چھوٹی بہن ہے۔ اور افسوں ابھی سے اس کی شادی کے بارے میں سوچنے لگی تھی۔
ساحل کہہ رہا تھا۔
"یہ تمہاری امی نہیں ہیں، میری امی ہیں۔ اگر تمہاری امی ہوتیں تو تم انہیں ہماری طرح امی جان کہا کرتیں۔"

"کیوں یہ ہمارے ابا کی بیوی ہیں تو ہماری بھی امی ہیں۔"
"پھر تم انہیں خالہ کیوں کہتی ہو۔"
"بس ہماری مرضی ہم کہیں گے۔"
"تو بس یہ تمہاری ماں نہیں خالہ ہیں۔"
"اور ہاں یہ ہماری ماں ہیں، یہ ہمارا گھر ہے۔ تم اپنی خالہ کے گھر رہتی ہو۔" کامل نے بھی ساتھ دیا۔
"نہیں یہ ہمارا گھر ہے، ہمارے امی ابا کا گھر ہے، تم تو بعد میں آئے ہو۔"
"تو جھوٹ بولتی ہے، بکواس کرتی ہے۔" ساحل نے اس کے بال نوچے۔
"الو کا پٹھا، کمینہ۔" خوشی نے بال چھڑا کر ساحل کی کلائی میں دانت گاڑ دیئے۔ کامل نے بڑھ کر اس کی ناک دبا لی اور اس کی پیٹھ پر چڑھ بیٹھا۔
دو لڑکے ایک طرف اور ایک لڑکی بیچاری۔
گتھم گتھا ہوتے پڑے تھے۔ ساحل کی کلائی سے خون نکل رہا تھا۔ خوشی کی آنکھ سوج گئی تھی، جب افسوں نے آ کر انہیں چھڑایا۔
وہ انہیں کتنی بار لڑنے سے منع کر چکی تھی۔ آج بھی پٹائی ساحل اور کامل کی ہی ہوئی۔
"میں نے تمہیں کتنی بار سمجھایا ہے کہ عورت پر ہاتھ نہیں اٹھاتے خواہ بڑی ہو یا چھوٹی اور تم اپنی بڑی بہن کو مار رہے تھے۔"
"اس نے بھی تو ہمیں مارا ہے، دیکھیں کلائی سے خون نکل رہا ہے۔"
"سب تمہارا قصور ہے، اگر تم زیادتی نہ کرتے تو وہ تمہیں کچھ نہ کہتی۔"
"ہاں آپ تو ہمیں کو مارتی ہیں۔"
"اٹھو غسلخانے میں جا کر منہ دھو کر آؤ، ورنہ میں کھال ادھیڑ دوں گی۔" دونوں روتے ہوئے اٹھے اور بڑبڑاتے ہوئے غسلخانے کی سمت چل دیئے۔
افسوں نے خوشی کو سینے سے لگا لیا۔
"نہ رو میری بیٹی، ابو کو آ لینے دو، آج ان کی مرمت کرواؤں گی۔"

"خوشی تم بھی چھوٹے بھائیوں سے خواہ مخواہ الجھتی ہو۔"

پری جو دُور بیٹھی سب دیکھ رہی تھی، اندر آ کر بولی۔

"ہاں میں خواہ مخواہ اُلجھتی ہوں۔" وہ پھر رونے لگی۔ "مجھے بار بار کہتے ہیں یہ تمہاری امّی نہیں ہے۔"

"تو کہنے سے کیا ہوتا ہے۔ ساری دنیا جانتی ہے، یہ ہماری امّی ہیں۔" پری نے کہا۔

اب زرّی بھی اندر آ گئی تھی۔ بولی۔

"اس کا تو صحیح علاج یہ ہے کہ تم خالہ کو امّی کہنا شروع کر دو۔"

"ہاں۔"

افسوں کو زرّی کی بات بہت پیاری اور گہری لگی۔ ذرا سوچ کر بڑے ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولی۔

"میں آپ تینوں سے کہنے والی تھی کہ آپ اب مجھے امّی کہا کریں۔ خالہ نہ کہیں۔"

پری اِٹھلا کر بولی۔

"خالہ آپ چاہے کتنا ہی بُرا کیوں نہ مانیں۔ مگر میں تو آپ کو خالہ ہی کہوں گی۔"

"کیوں؟" افسوں کا دل دھڑک اُٹھا۔

"مجھے سوتیلی ماں کا رشتہ اچھا نہیں لگتا۔ ویسے ہی اس سے خوف آنے لگتا ہے۔"

"لیکن کیا میں تمہارے ساتھ سوتیلی ماں کا سا سلوک کرتی ہوں۔"

"نہیں خالہ۔" پری نے اس کے گلے میں بانہیں ڈال دیں۔ "آپ تو ہمیں اپنی امّی سے بھی زیادہ پیار کرتی ہیں۔ آپ کی تو مثال نہیں۔"

"پھر تم نے ایسی بات کیوں کہی۔"

"بات یہ ہے کہ۔"

اُس نے جھجکتے ہوئے کہا۔

"خالہ کا رشتہ بہت پیارا ہوتا ہے۔ سوتیلی ماں سے اچھا ہوتا ہے۔

لیکن پیاری خالہ ماں تو وہی ہوتی ہے جو جنم دیتی ہے۔ اگر ہم نے آپ کو

امّی کہنا شروع کر دیا تو اپنی ماں کو بھول جائیں گے۔ ان کے ساتھ ایک ذہنی تعلق رکھنے کے لئے ضروری ہے کہ ان کے علاوہ کسی کو ماں نہ کہا جائے۔"

سُن لیا اپیا آپ نے،

سُن لیا . . . . .

میں نے تو ان کی ماں بن جانے کی کوشش کی۔

پھر کس کارن تم نے مجھے اتنا بڑا بن باس سونپ دیا۔

میں سب کچھ ہونے کے باوجود سوتیلی ماں ہوں۔

مگر مجھے یہ کسی سے کہنا نہیں۔

کیونکہ میرا بن باس ابھی پُورا نہیں ہوا۔

اس میں کس کا قصور تھا اپیا۔

اس سارے قصّے میں قصوروار کون تھا؟

اماں کا بھی کوئی قصور نہیں، کیونکہ انہوں نے مجھے جنم دیا۔

اپیا تمہارا بھی دوش نہیں کہ تم نے مجھے پالا پوسا۔

اور فہد کا بھی کیا قصور ——— وہ جو کہا کرتا تھا۔ اُس نے کر دکھایا۔

پھر قصور کس کا ہے؟

اُس کا جو سزا بھگت رہا ہے؟

یا

اس کا جو سزا دے رہا ہے؟

ایک عورت کا گھر ہو ——— شوہر ہو ——— بچّے ہوں۔

پھر وہ تہی دامن ہو۔

خالی خولی

جوانی کی یہ لمبی ڈگر، اور سُونی سُونی راہیں . . . .

پگ پگ آرزوؤں کا کوئی دیپ روشن نہیں۔

اماں یہ دیپ کس نے بجھا دیئے ؟
تم نے ؟ اپیا نے — یا فہد نے ؟
میرا مجرم کون ہے ؟
کس کو کٹہرے میں لاؤں ؟
اپنی مجرم میں آپ ہوں ۔
من میں چور تو میرے تھا۔
اب تن میں بھی چور ہے ۔
تم نے کبھی مُردہ بیل کو گاڑی کھینچتے دیکھا ہے ؟ جب گاڑی بان کو اس پر ترس نہیں آتا۔ تو راہ گیروں کو کیوں آئے ۔

سب کھڑکیاں، دروازے، روزن بند کر کے میں بے حسی کی نیند سوتی ہوتی ہوں
پھر نہ جانے کیسے بہار کی رُت میں،
سب دروازے کھڑکیاں دھڑا دھڑ بجنے لگتے ہیں ۔
نیند کی گولیاں کھا کھا کر میں نے بے خوابی سے سمجھوتہ کر لیا ۔
پھر یہ ہوا ۔
خوشبوؤں میں لدی، دبے پاؤں چلتی ہوا ۔
نہ جانے کس طرح بند دروازوں کے اندر چلی آتی ہے ۔
بدلتی رُت میرے دِل کے دریچے پر دستک دیتی ہے ۔
دریچہ آپ ہی آپ وا ہو جاتا ہے ۔
تم نے کبھی خشک پتوں کا الاؤ دیکھا ہے ؟
بہار آنے سے پہلے جب شاخیں ننگی ہو جاتی ہیں، تو سوکھے پتے سڑکوں پر دیوانہ وار دوڑتے پھرتے ہیں ۔
پھر ایک دن انہیں ایک چوراہے پر اکٹھا کر کے آگ لگا دی جاتی ہے ۔
سوکھے پتوں کا الاؤ مسلسل جلتا رہتا ہے ۔

کل یہ پتے بہار کی جان تھے ۔ آج انہیں آگ لگا دی جاتی ہے ۔
اُن کی آہیں اس سیاہ ڈھیر پر فغاں کرتی رہ جاتی ہیں ۔
اور جب سوکھے پتوں کو آگ لگتی ہے تو پھر بہار آتی ہے، مردہ پتوں پر نئے قدم جماتی بہار، درختوں، شاخوں، پھولوں پتوں کو نیا پیراہن عطا کرتی ہے ۔
میرا دِل ان جلے ہوئے پتوں کے ڈھیر کی طرح رہتا ہے ۔
اور دبے دبے . . . . ہوا میرے دریچے پر دستک دیتی ہے ۔
اور کہتی ہے ۔
آؤ آؤ . . . . میرے پیچھے پیچھے چلی آؤ ۔
میں دروازہ کھول کر دیوانہ وار دوڑتی ہوں ۔
وہ اور دور ہو جاتی ہے ۔
میں اس کی طرف کھنچی چلی جاتی ہوں ۔ اس کو پکڑنا چاہتی ہوں ۔
وہ اور دُور ہوتی جاتی ہے ۔
میں بادلی ہوئی فضاؤں میں اِدھر اُدھر دیکھتی ہوں ۔ خوب صورت لمحے مجھے ڈس لیتے ہیں ۔
اماں — اپیا — فہد —
خوب صورت موسم مجھے بچھڑے ہوئے چہرے یاد دلاتا ہے ۔ خوشبوئیں میرے دِل کا درد جگاتی ہیں ۔ پرانے گیت مجھے ماضی کی طرف لے جاتے ہیں ۔
ہیں کہ
تن من کو وائے، آس و نراس کو چھوٹے ۔ دھونی رچائے بیٹھی ہوں میرے پہلو میں شعلے جاگ اٹھتے ہیں ۔
تم ہی بتاؤ فہد یہ شعلے کیا کہتے ہیں ؟
ہوائیں نہ چلا کریں ۔
رُت نہ بدلا کرے ۔

زنجیر نہ ہلا کرے دروازے کی۔
فضاؤں میں پائلیں نہ بجا کریں۔
وقت کی شہزادی جوان نہ ہوا کرے۔
جاؤ۔۔۔۔ جاؤ۔۔۔ کسی اور دیس میں جاؤ۔
فضائیں کہتی ہیں۔
آؤ۔۔۔ آؤ۔۔۔۔۔
جاگو۔۔۔۔ جاگو۔۔۔۔
میرے پیچھے پیچھے چلی آؤ۔
دبے دبے۔۔۔۔ ہولے ہولے۔

۔۔۔۔ کہ باز آید پشیمانی !

لگا تیر جگر وِچ کاری
تھیا خون اکھیں توں جاری
میں مٹھڑی ڈوکھڑیں ماری
ھے ! کیندے سانگ جلیساں

(خواجہ غلام فریدؒ)

اسماء نے سر سے لے کر پاؤں تک شہلا کو دیکھا۔ بچاری نے معمولی سی چھینٹ کا سوٹ پہنا ہوا تھا۔ سادہ سے بالوں کے ساتھ کس کے چٹیا کی ہوئی تھی۔ سر پر تیل بھی خوب لگا تھا۔ ہوائی چپل اور کھردرے کھردرے ہاتھ جن سے صاف ظاہر ہوتا کہ اس کی جوانی برتن مانجھنے اور آٹا گوندھنے میں گذر رہی ہے۔

شہلا کی عمر کوئی اٹھارہ برس کی ہوگی۔ جب اس کا باپ فوت ہوا تھا تو وہ غالباً بارہ برس کی تھی۔ تب اسماء نے اسے پہلی بار دیکھا تھا۔ لیکن پھر اتنا عرصہ ان کی طرف جا ہی نہ سکی تھی اور اب اس یتیم اور غریب لڑکی کو دیکھ کر اسے خیال آیا کہ اپنے غریب رشتہ داروں کے ہاں جانا چاہیئے۔ ان کی خبر لینا چاہیئے۔

ویسے لڑکی اسے ہر طرح سے معقول نظر آئی۔ اس لئے بھابی شمیم سے اس نے کہا۔

"آپ جائیں شہلا میرے پاس رہے گی۔"

بھابی شمیم کو تو جیسے من کی مراد مل گئی۔ دعائیں دیتی۔ اپنا بوسیدہ برقعہ اٹھا کر باہر نکل گئی۔

اسماء نے شہلا کو پاس بچھی ہوئی کرسی پر بیٹھ جانے کو کہا۔

وہ سکڑی سمٹی کرسی پر بیٹھ گئی۔

اسماء کے ذہن کا بوجھ ذرا کم ہوا۔

ہاں۔ یہ سب زندگی کے بوجھ ہوتے ہیں۔ کہنے کو تو معمولی باتیں ہیں۔ مگر ان سب باتوں

کا انسان کی زندگی کے ساتھ گہرا رابطہ ہے۔ اور ان سے بچ کر انسان کہاں جائے۔

اسماء کی شادی کو تیرہ برس ہو گئے تھے۔ اُوپر تلے تین لڑکیاں تھیں۔ کیا کیا ارمان نہ تھے اس کے دل میں لڑکے کے لئے ـــــ ہر عورت کی تمنا ہوتی ہے اُس کا لڑکا ضرور ہو۔ مگر اسماء کی تمنا تو تڑپ بن چکی تھی۔ ہر بار جب بچہ پیدا ہونے ڈالا ہوتا، تو کیا کیا نہ ٹوٹنے کرتی ـــ تعویز منگواتی۔ وظیفے کرتی، مگر جب لڑکی پیدا ہو جاتی تو کرب سے آہ بھر کے یوں گردن ڈال دیتی۔ جیسے اپنی تقدیر پر ماتم کرنے کی بھی اس میں طاقت نہیں ہے۔ علی احمد اس کو بہت سمجھاتا تھا اور کہتا تھا کہ اس زمانے میں لڑکی ہو یا لڑکا کچھ فرق نہیں پڑتا۔

مگر اُس کی زندگی کی تو واحد آرزو تو بس لڑکا تھا۔

لڑکیاں کافی سیانی ہو گئی تھیں اور علی احمد نے اسے مزید بچے نہ پیدا کرنے پر آمادہ کر لیا تھا۔ مگر جب بھی کوئی ملنے جلنے والی اس سے کہتی:

"ارے آپ کی تو تین تین لڑکیاں ہیں، لڑکا کیوں نہیں پیدا کیا؟" تو وہ حسرت سے کہتی

"بس اللہ کو یہی منظور تھا۔"

"تو کیا ہوا ایک کوشش اور کر ڈالئے۔"

"نہیں بھئی اب ہمت نہیں ہے۔"

"واہ ابھی کیا ہوا ہے۔ آپ جوان ہیں، صحت مند ہیں، زیادہ دیر کی تو بعد میں پچھتائیں گی۔"

"کیا خبر اب بھی لڑکا نہ ہو۔"

"ارے ہو گا۔ ضرور ہو گا۔ عام طور پر تین لڑکیوں کے بعد لڑکا ضرور ہوتا ہے ـــ میری فلاں ـــ کا ہوا ـــ فلاں کا ہوا ـــ ان بہنوں کو کم از کم ایک بھائی تو دیجئے نا؟"

"بہن اللہ سے تو مقابلہ نہیں۔" اندر اندر وہ قائل ہو جاتی۔

"ہاں اللہ سے التجا تو کی جا سکتی ہے۔"

"بس اللہ ان بچیوں کو سلامت رکھے۔"

"نہیں جی ایک کوشش اور کر دیکھئے۔ میں آپ کو فلاں سائیں سے تعویذ لا دوں گی دیکھنا تو سہی اللہ کے حکم سے لڑکا ہی ہو گا۔"

جب بھی کوئی خاتون ایسا مشورہ دے کر جاتی، کئی کئی دن اسماء کی طبیعت بے چین رہتی۔ اس کا کسی کام میں دل نہ لگتا۔ بچیوں کو خواہ مخواہ مارتی رہتی۔ علی احمد سے الجھتی رہتی اور علی احمد خوب جانتا تھا کہ کبھی کبھی کون سی محرومی اسماء کو چڑچڑا اور کھردرا کر دیتی ہے۔

اسماء خود بھی سوچتی تھی کہ اب اور بچہ پیدا کرنے کا وقت نہیں رہا۔ سب بچیاں اسکول جانے لگی تھیں۔ گھر کا کام بڑھ گیا تھا۔ خود اس میں پہلے جیسی طاقت نہ رہی تھی۔

مگر ـــــ خواہش تو وہ شمع ہے جو دل کے اندھیرے میں بن پانی کے جلتی رہتی ہے۔ خدا جانے یہ لاشعوری خواہش کا اثر تھا یا شعوری کوشش کا۔ پورے چھ سال بعد اسماء کو پھر حمل ہو گیا تھا اور اس عرصے میں اسماء نے دوائیں، دعائیں۔ تعویذ گنڈے، وظائف سب کچھ کر لیا تھا۔

اور اب جب زچگی کا وقت بہت قریب تھا، وہ بہت بے زار تھی۔ لاچار تھی جیسے جان لبوں پر آئی ہو چاہتی تھی جو کچھ بھی ہے اب جلد اس سے خلاصی مل جائے۔ سب سے زیادہ فکر اسے اپنی تینوں بچیوں کا تھا۔ آج کل گھر پر کوئی ملازمہ نہ تھی۔ سب مرد نوکر تھے علی احمد اپنی نوکری میں مصروف رہتا تھا۔ اُسے سمجھ نہیں آ رہی تھی، کہ لڑکیوں کے پاس کس کو چھوڑ کر ہسپتال جائے۔

حنا بارہ سال کی تھی۔

صبا دس سال کی۔

اور دعا چھ سال کی۔

تینوں اسکول جاتی تھیں۔ کئی بار اُس نے علی احمد سے کہا کہ بچیوں کے لئے کوئی بندوبست کرے۔ مگر اُس نے ہمیشہ یہی کہا کہ تم اپنی کسی بہن یا میری کسی بہن کے ہاں بچیوں کو چند دنوں کے لئے چھوڑ دو، ایسا کرنے پر وہ بالکل راضی نہ تھی۔ ویسے بھی اس کی طبیعت وہمی تھی۔ اپنی بچیوں کو اپنی نظروں کے سامنے رکھنا چاہتی تھی۔

جوں جوں دن کم ہوتے جا رہے تھے، اُس کا فکر بڑھتا جا رہا تھا۔

خدا کا کرنا یوں ہوا کہ بھابی شمیم اُس کی خبر لینے آ گئی۔ شمیم اُس کے دُور کے رشتے کے بھائی کی بیوی تھی۔ دس سال پہلے اُس کے بھائی کا ایک ایکسیڈنٹ میں انتقال ہو گیا تھا شمیم کے نو بچے تھے اور عین جوانی میں بیوہ ہو گئی تھی تب اسماء اسے پُرسہ دینے گئی تھی۔ اسماء نے بعد میں بھی ہر طرح سے اس کی مدد کی تھی۔ عیدوں پر اس کے بچّوں کے لئے کپڑے بھجوا دیتی تھی۔ زکوٰۃ میں سے خاصی رقم ان کو دے دیتی تھی۔ اگر کسی بچّے کو فیس وغیرہ کی ضرورت ہوتی تو وہ اُسی سے مانگنے آتے۔ گو اسماء اُن کے ہاں جاتی نہیں تھی۔ اس لئے اُسے اُن کے اندرونی حالات کا علم نہیں تھا، مگر خاندان میں یہی ایک خاتون تھی، جو اُن کی برابر مدد کئے جا رہی تھی۔ کبھی کبھی بھابی شمیم اُس کی خبر لینے یا اس کے احسانات کا شکریہ ادا کرنے آ جاتی تھی۔

اسماء نے اُسے منع کر رکھا تھا کہ وہ علی احمد کے سامنے اس کی مدد کا ذکر نہ کرے جو وہ وقتاً فوقتاً کرتی رہتی ہے۔ تاکہ علی احمد کی نظروں میں اس کی عزّت کم نہ ہو جائے۔

علی احمد اس خاندان کا سب سے امیر آدمی تھا۔ اور خاندان کے باقی لوگ اسماء کی قسمت پر رشک کرتے تھے۔ علی احمد اسماء کا رشتہ دار نہیں تھا۔ بالکل غیر تھا۔ دونوں یونیورسٹی میں اکٹھے پڑھتے تھے۔ خوبصورت جذبات جب دل میں پیدا ہوئے تو انہوں نے شادی کر لی۔ علی احمد کا باپ تاجر تھا۔ لائلپور میں کپڑے کی ملیں تھیں۔ چمڑے کا کارخانہ بھی تھا۔ علی احمد چونکہ تعلیم یافتہ تھا۔ اس لئے اپنے شوق سے نوکری کرتا تھا۔ یوں گھر میں اللہ کا دیا سب کچھ تھا۔ اور اسماء جدید ترین گھریلو سہولتوں میں بڑے آرام کی زندگی بسر کر رہی تھی۔ بس وہی ایک خلش کہ ایک لڑکا ہو۔ ولی عہد ہو ـــــ جانشین ہو ـــــ بڑھاپے کا سہارا ہو ـــــ اور جب وہ اسی ادھیڑبن میں بیٹھی تھی تو بھابی شمیم نے اس کی مشکل آسان کر دی۔ یہ کہہ کر کہ میں اپنی شہلا کو بھیج دیتی ہوں۔ تم فکر نہ کرو بچیوں کا خیال رکھے گی۔

"ارے ہاں شہلا کا تو مجھے کبھی خیال ہی نہیں آیا۔ کتنی بڑی ہو گئی ہے؟"

"لو اور سنو ـــــ دیکھو تو پہچان نہ سکو۔ وہ کم بخت تو بانس بن گئی ہے۔ دیکھتے دیکھتے۔"

"کون سی جماعت میں پڑھتی ہے؟"

"پڑھنا وڑھنا کیسا۔؟" بھابی شمیم نے آہ بھر کر کہا۔ "دو سال پہلے اس نے میٹرک کر لیا تھا۔ پھر میں نے اُسے گھر بٹھا لیا۔ تم جانتی ہو کتنی مشکل سے دن گزر رہے ہیں۔ اس پر میں کالج کا خرچہ نہیں اٹھا سکتی۔ ابھی تو سب چھوٹے ہیں۔ ان کی تعلیم ضروری ہے۔ لڑکی کے لئے بس اتنا

ہی کافی ہے۔ مجھے ضروریات کے لئے اِدھر اُدھر جانا پڑتا ہے۔ وہ گھر میں چھوٹے بچوں کا خیال رکھتی ہے۔ اور گھر کو سنبھالتی ہے۔"

"اچھا اگر آپ کو تکلیف نہ ہو تو بھیج دیں۔"

"ارے مجھے کیا تکلیف ہونی تھی۔ میں تو خود سر کے بل چل کے آجاتی۔ پورا سوا مہینہ تمہارے پاس گزارتی۔ تمہاری خدمت کرتی۔ مگر وہ جو فوج کی فوج گھر میں بیٹھی ہے۔ شہلا اُسے نہیں سنبھال سکتی۔ پھر محلہ بھی کچھ ٹھیک نہیں اس لئے جوان لڑکی کو وہاں اتنے دن تنہا نہیں چھوڑ سکتی۔ اور تمہارے پاس چھوڑنے میں تو مجھے اعتراض نہیں۔ جیسی وہ وہاں محفوظ ہے۔ ویسی یہاں ـــــ کہو تو یہاں چھوڑ جاؤں؟"

اسماء سوچنے لگی۔

"بہت ہوشیار ہے میری شہلا۔ گھر کا سب کام جانتی ہے۔ دیکھنا تو سہی تمہیں اتنا آرام دے گی کہ تم اسے جانے نہ دو گی۔"

"اچھا تو پھر اسے لے آئیں۔"

اور اب بھابی شمیم حسب وعدہ شہلا کو چھوڑ گئی تھی۔ اور شہلا ڈری سہمی اس کے پاس بیٹھی تھی اور وہ اس کا جائزہ لے رہی تھی۔ آج صبح سے اسماء کو ہلکی ہلکی تکلیف ہو رہی تھی۔ قرائن کہہ رہے تھے۔ آج کل میں کچھ ہو جائے گا۔ لیٹے لیٹے جب اُس نے درد سے بلبلا کر ہائے کہا تو شہلا اُٹھ کھڑی ہوئی اور بولی:

"آپا میں آپ کی ٹانگیں دبا دوں۔" اسماء کو سارے خاندان کے بچے آپا کہتے تھے کوئی بھی خالہ یا پھوپھی نہیں کہتا تھا۔ اس لئے شہلا نے بھی آپا کہہ دیا۔ اور پھر اُس کا جواب سنے بغیر جلدی سے سلیپر اُتار کر اس کے بستر پر بیٹھ گئی اور اپنے گرم ہاتھوں سے اسے دبانے لگی۔ اسماء کو اس وقت اس کا دبانا بڑا اچھا لگا۔ پھر یہ محسوس کر کے اسے بڑی خوشی ہوئی کہ شہلا کو بہت اچھی طرح دبانا آتا تھا۔ ویسے عام طور پر اس کی عمر کی لڑکیوں کو یوں دبانا نہیں آتا۔

"تم تو بہت اچھا دبا لیتی ہو شہلا۔ کہاں سے سیکھا؟"

"آپا" شہلا نے شرما کر کہا۔ "میں امی کو روز دباتی ہوں نا۔ اس لئے مجھے عادت پڑ

گئی ہے۔"

"امی کی خدمت کرتی ہو؟" اسماء نے دانتوں میں درد دبا کر کہا۔

"جی آپا ـــــ"

"بہت اچھا کرتی ہو۔ جو بچے والدین کی خدمت کرتے ہیں، اللہ تعالیٰ اُن کو اجر دیتا ہے۔"

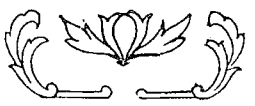

اسی رات اسماء کو ہسپتال جانا پڑ گیا۔ اُس نے آدھی رات کے وقت شہلا کو جگایا، جو بچیوں کے کمرے میں سو رہی تھی۔ اور کچھ ضروری ہدایات دینے لگی۔ ابھی تو اس نے گھر کے بارے میں پوری طرح شہلا کو سمجھایا بھی نہیں تھا۔ اس کا خیال تھا کہ صبح اُٹھ کر بچیوں کے کپڑے اور کمرہ شہلا کے حوالے کر دے گی اور اسکول جانے کے بارے میں بھی سمجھا دے گی۔ مگر اسے ہسپتال جانا پڑ گیا۔ وہاں جانے کے چند گھنٹے بعد اسماء کو اللہ تعالیٰ نے پیارا سا لڑکا دیا۔

خوشی کے مارے وہ کئی مہینوں کی تکلیف بھول گئی۔ وہ یہ بھی بھول گئی کہ چند گھنٹے قبل اس کی جان کے لالے پڑے ہوئے تھے۔ اُسے خون کی بوتلیں چڑھائی جا رہی تھیں۔ آکسیجن لگی ہوئی تھی ـــــ بچہ آپریشن سے ہوا تھا۔ اور وہ پلنگ پر بالکل سیدھی لیٹی تھی۔ اور ابھی جانے کب تک یونہی لیٹنا تھا۔ جسم کا پور پور ناسور کی طرح دُکھ رہا تھا، لیکن روح میں کیسی خوشی تھی ـــــ اس کے لڑکا پیدا ہوا تھا۔

جیسے اندھیرے گھر میں چاند طلوع ہوا ہو۔

جیسے گھر کے آنگن میں پہلا گلاب کھِلا ہو!

اللہ ضرور سنتا ہے۔ وہ دِل ہی دل میں اُس کا شکر ادا کرنے لگی۔ اُس نے میری بھی سُن لی۔ اب علی احمد کتنا خوش ہوگا۔ ویسے اوپر سے کہتا تھا کہ مجھے بیٹے کی ضرورت نہیں بھلا بیٹے کی بھی کسی کو ضرورت نہیں ہوتی۔ مرد یونہی جان بوجھ کر اپنی کمزوریوں پر پردہ ڈالتے

ہیں۔ حالانکہ اُس نے کئی بار نوٹ کیا تھا کہ جب بھی گھر میں کوئی مہمان آتے اور ان کے ساتھ چھوٹے چھوٹے لڑکے بھی ہوتے تو علی احمد بے اختیار اُن کے ساتھ کھیلنے لگتا۔ تب اسے اپنی بڑی سبکی محسوس ہوتی ـــــ نہ جانے کیوں وہ دِل ہی دِل میں شرمندہ رہتی تھی کہ اس کی لڑکیاں ہی لڑکیاں ہیں۔ شکر ہے اب دِل کی وہ شرمندگی تو دُور ہو گئی تھی۔

گویا لڑکے نے اُسے سربلندی عطا کی تھی۔

شام کو علی احمد جب تیسری مرتبہ اُسے دیکھنے آیا تو بچیوں کو بھی ساتھ لیتا آیا کیونکہ بھائی کی خبر پا کر لڑکیاں بے چین ہو رہی تھیں اور جلد از جلد اپنا منا بھائی دیکھنا چاہتی تھیں۔

بچیاں جب کمرے میں آگئیں تو اسماء کو خیال آیا کہ کل تک وہ ان بچیوں کے لئے کتنی فکرمند تھی۔ اور آج لڑکے کی خوشی میں اُسے کچھ بھی یاد نہ رہا تھا۔

تینوں لڑکیاں دُور کھڑی اُسے حیرت سے دیکھ رہی تھیں۔ وہ اوپر سفید چادر تانے سیدھی لیٹی تھی۔ مگر زندہ لوگوں والی حرکتیں کر رہی تھی۔

"وفا، میری بچی میرے قریب آؤ۔"

"آؤ تم بھی صبا۔"

"حنا جلدی سے آؤ۔"

تو تینوں لڑکیاں دوڑ کر آگئیں۔ اُس نے لیٹے لیٹے باری باری انہیں پیار کیا۔ وہ حیرت سے اِدھر اُدھر دیکھ رہی تھیں۔

"منا بھائی دیکھنا چاہتی ہو؟" اسماء نے اُن کے تجسس کو تاڑ لیا۔

"ہاں"

انہوں نے سر اٹھایا۔

تب اسماء نے شہلا کی موجودگی محسوس کی اور بولی۔

"شہلا انہیں بچے کی کاٹ کے پاس لے جاؤ۔ اور باری باری بچہ دِکھا دو۔ ابھی سویا ہے کہیں جگا نہ دینا۔"

"اچھا آپا ـــــ" خوشی سے لہراتے ہوئے شہلا نے بچیوں کو پچکارا اور لے کر بچے

کی سمت بڑھی۔

اس نے غور کیا کہ تینوں بچیاں بہت قرینے سے تیار ہو کر آئی تھیں۔ شام کے لئے جو کپڑے انتہائی موزوں تھے، وہ انہوں نے پہنے ہوئے تھے۔ تینوں کے بال بڑے اسٹائلش اور مختلف انداز کے بنے ہوئے تھے اور چہرے چمک رہے تھے۔ ذرا نہیں لگ رہا تھا کہ وہ اُس کے آجانے کے بعد گھبراتی ہوں۔ یا روتی رہی ہوں۔ اسماء کو اطمینان سا ہو گیا۔ شہلا اُس کے اندازے سے بھی زیادہ ہوشیار اور سمجھدار ثابت ہو رہی تھی۔

پھر اُس نے شہلا کو بلا کر پوچھا۔

"بچیاں اسکول گئی تھیں، کھانا کھا لیا تھا؟ روئی تو نہیں تھیں؟" مگر بچیاں خود ہی بول اٹھیں۔

"امی شہلا باجی بہت اچھی ہیں۔ ہمارے ساتھ کھیلتی ہیں اور ہمیں کہانیاں بھی سناتی ہیں۔"

"ہم آج بھی اُن کو اپنے کمرے میں سُلائیں گے۔"

"ٹھیک ہے" اسماء نے آئندہ چند دنوں کے لئے شہلا کو ہدایات دیں۔ اپنے کمرے کے بارے میں سمجھایا۔

اور یہ بھی بتا دیا کہ شام کو روز بچیوں کو لے آیا کرے۔

"جی اچھا آپا۔"

ہر بات پر شہلا مُسکرا مُسکرا کر یہی کہتی رہی۔

اسماء کو اطمینان سا ہو گیا۔

ویسے بھی اپریشن کی وجہ سے اسے دس بارہ دن ہسپتال میں رہنا تھا۔ اگر شہلا نہ آگئی ہوتی تو وہ بہت پریشان رہتی۔ ہسپتال میں علی احمد نے اس کے لئے ایک نرس کا بندوبست کر دیا تھا۔ اس کو وہاں بھی ایک تیماردار کی ضرورت تھی۔

ٹھیک بارہ دن کے بعد اسماء گھر آگئی۔

گھر آکر اُسے بہت سکون ملا۔ اُس کا کمرہ اُس کی توقع کے خلاف بہت صاف ستھرا تھا۔ بستروں پر مچھیوں کی چادریں بدلی ہوئی تھیں۔ گلدان میں تازہ پھول پڑے تھے۔

اور شہلا بھاگ بھاگ کر اُس کا اور بچے کا سامان کمرے میں لا رہی تھی۔ جلدی میں اُس نے بچے کی بہت سی چیزیں قرینے سے سجا دیں۔ اُس کو انتہائی آرام سے لٹایا۔ خانساماں کو اس کے کھانے کے بارے میں بتا کر آئی اور بچیوں کے کمرے میں آگئی۔ انہیں لُٹ کا کھانا کھلایا۔ سونے کے کپڑے بدلوائے اور بستروں میں ڈال کر کہانی سنانے بیٹھ گئی۔

جب سے اسماء آئی تھی۔ بچیاں صرف ایک مرتبہ اس کے کمرے میں آئی تھیں۔ جی بھر کے بچے کو ٹٹولا۔ مسلا۔ اِدھر اُدھر کی باتیں کیں اور پھر اپنے کمرے میں چلی گئیں۔ اگر شہلا کی ذات سے انہیں دلچسپی نہ ہوتی تو وہ ماں کے سر پر سوار رہتیں۔ طرح طرح کے سوالات کرتیں۔ بار بار بچے کو اٹھانے کی ضد کرتیں۔ کہ نومولود چھوٹے بچوں کے لئے بڑی دلچسپی کا باعث ہوا کرتا ہے۔ اور اسی بات سے اسماء ڈر رہی تھی۔ ویسے بھی اُسے اتنی کمزوری محسوس ہو رہی تھی کہ وہ چاہتی تھی کہ کوئی اُس کے کمرے میں آکر اُسے تنگ نہ کرے۔ اس بات سے بھی اُسے بڑی تسلی ہوئی کہ شہلا کے آنے کی وجہ سے بچیوں کی توجہ بٹی رہے گی۔

رات کو جب بچیاں سو گئیں تو شہلا اسماء کے کمرے میں آئی اور بولی۔

"آپا، آپ کے لئے سوپ لے آؤں؟"

"ہاں لے آؤ شہلا۔ اور ساتھ باقی کھانا بھی لے آنا۔"

جب تک اسماء کھانا کھاتی رہی۔ شہلا بچے کو لے کر بیٹھی رہی۔ اسی اثنا میں بچہ چلّانے لگا۔ شہلا اُسے بڑے قرینے سے چُپ کراتی رہی۔

"شاید اس نے چھی چھی کر دی ہے اس لئے رو رہا ہے۔" اسماء نے کہا۔

"ہاں آپا۔ میں نے دیکھ لیا ہے۔ آپ کھانا کھاتی رہیں۔ میں ابھی صاف کر دیتی ہوں۔"

اسماء کا دل نہیں چاہ رہا تھا کہ بچے کی گندگی اس سے صاف کرائے۔ مگر اس کا خلوص دیکھ کر خاموش رہی۔

شہلا نے جس مشّاقی اور سلیقے سے بچے کو صاف ستھرا کر کے پاؤڈر چھڑک کے نیا نیپکن باندھا اسماء حیران رہ گئی۔ اِس عمر کی لڑکیوں کو ایسی باتیں کہاں آتی ہیں۔

جب شہلا کھانے کے برتن چھوڑ کر آئی تو اسماء بچے کو دُودھ پلا چکی تھی۔ شہلا نے منّا اُس کے ہاتھ سے لیا اور بڑے قرینے سے کاٹ میں لٹا کر پہلو میں ایک تکیہ لگایا اور اُوپر جالی ڈال کر آ گئی۔

"آپ کے سر میں تیل لگاؤں آپا۔ دیکھیں تو آپ کے بال کیسا جنگل بن رہے ہیں۔"

"ہاں شہلا لگا ہی دو۔"

اور شہلا بھاگ کر تیل کی بوتل اٹھا لائی۔

پھر اس کی مشّاق انگلیاں جب اسماء کے سر میں مساج کرنے لگیں تو اسے بہت سُرور آیا۔

حیران ہو کر بولی۔

"شہلا! تم تو بہت اچھا تیل لگا لیتی ہو۔ کہاں سے سیکھا؟"

"بس ویسے ہی آپا ــــ" شہلا شرما گئی۔ "مجھے دراصل کام کرنے کا بہت شوق ہے۔ اس لئے جو کام بھی کرنا ہو اُسے پہلے توجہ سے سیکھتی ہوں۔"

"ابھی میں نے دیکھا۔ تم نے اتنی اچھی طرح منّے کو صاف کیا اور اتنی خوبصورتی سے کاٹ

میں لٹایا۔ حالانکہ لڑکیاں تو اتنے چھوٹے بچوں کو اٹھاتے ہوتے گھبراتی ہیں۔ بلکہ بعض تو نفرت کرتی ہیں۔"

"نہیں آپا۔ مجھے چھوٹے بچوں سے بہت محبّت ہے۔ اصل میں اپنے ــــ ہم بہت سے بہن بھائی ہیں۔ اور میں تو ابھی پانچ چھ برس کی تھی کہ مجھے اپنے چھوٹے بہن بھائیوں کو سنبھالنا پڑ گیا تھا۔ ایک کے بعد دوسرا پیدا ہو جاتا تھا اور پہلا مجھے سنبھالنا پڑتا تھا۔"

"تمہیں تو اپنے بہن بھائی بہت اچھے لگتے ہوں گے۔"

"نہیں آپا! اس وقت اچھے نہیں لگتے تھے۔ ان کو سنبھالنا مجھے مصیبت لگتا تھا۔ مگر اب مجھے چھوٹے بچے اچھے لگتے ہیں۔"

پھر وہ تیل کی شیشی اُٹھا کر پائنتی کی طرف آ گئی۔

"آپ کی ٹانگوں کی مالش کر دوں۔ لیٹے لیٹے آپ تھک گئی ہوں گی۔"

"دس بج رہے ہیں شہلا۔ اب جا کر آرام کرو۔"

"نہیں آپا مجھے اتنی جلدی نیند نہیں آتی۔ ابھی کام کرنے کو دِل چاہ رہا ہے۔"

"اچھا۔" اسماء کو اس کے جذبے پر پیار آیا۔

"میں ذرا غسل خانے سے ہو آؤں۔ پھر مالش کروا تی ہوں۔ منّے کا خیال رکھنا۔"

"آپ بے فکر رہیں۔"

تھوڑی دیر بعد اسماء غسل خانے سے لوٹی تو شہلا اسی حالت میں بوتل تھامے قالین پر بیٹھی تھی۔

اسماء کو دیکھ کر کھڑی ہو گئی۔

اسماء نے اچانک غور کیا۔ کہ اس نے وہی چھینٹ کا سوٹ پہنا ہوا تھا۔ جو وہ پہلے دن پہن کر آئی تھی اور اب وہ خاصا میلا بھی لگ رہا تھا۔

"کیا بات ہے۔ جب سے تم آئی ہو تم نے کپڑے نہیں بدلے۔ کیا فرصت نہیں ملتی؟" اسماء نے اپنا پاؤں اُس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ اُس نے لپک کر اس کا پاؤں پکڑ لیا۔ پھر ہتھیلی پر تیل ڈال کر دونوں ہاتھوں پر رگڑا اور دونوں ہاتھوں سے اسماء کے پیروں پر ملنے لگی۔

"آپا.... دراصل.... وہ بات یہ ہے کہ میں اس دن کپڑے ساتھ لانا بھول گئی تھی امی نے کہا تھا اگر زیادہ دن رکنا پڑ گیا تو وہ مجھے کپڑے دے جائیں گی۔ خدا جانے وہ کیوں نہیں آئیں ویسے پچھلے ہفتے میں نے یہ جوڑا دھو کر پہن لیا تھا۔ صبح پھر دھو لوں گی۔"

"اوہو، تم نے مجھے کیوں نہیں بتایا۔" اسماء کے دل میں درد کی لہر اٹھی۔ پتہ نہیں اس کے پاس کوئی دوسرا جوڑا ہے بھی یا نہیں ——"

"صبح میں تمہیں اپنے کوئی کپڑے نکال دوں گی۔ کاٹ کر فی الحال ٹھیک کر لینا۔ پھر جب بازار جانے کے قابل ہوں گی تو تمہیں نئے کپڑے لا دوں گی۔"

"جی اچھا آپا ——" شہلا نے فرمانبرداری سے گردن جھکا لی۔

صبح اپنے کاموں سے فارغ ہو کر اسماء دھیرے دھیرے چلتی ہوئی اپنی ڈریسنگ کے پاس گئی اور وہاں سے اپنے دوپٹے نے ریشمین جوڑے نکالے اور شہلا کو دیکر بولی۔

"اسٹور میں میری مشین پڑی ہے۔ نکال لو۔ کاٹ کر ٹھیک کر لو۔ اور جب وقت ملے نہا کر بدل لینا۔"

شہلا پرانے جوڑے نے کر اتنی خوش ہوئی، جیسے دو جہان کی دولت ہاتھ آ گئی ہو۔ اس وقت بچہ سو گیا تھا۔ اس لئے اسماء نے بھی مناسب سمجھا کہ تھوڑا سا آرام کر لے۔ پھر بچیاں جب اسکول سے آ جائیں گی تو گھر میں ہنگامہ مچ جائے گا۔

اسماء غالباً دو گھنٹے سوتی رہی۔ بچے کے مسلسل رونے سے اس کی آنکھ کھل گئی۔ شہلا بھی غائب تھی۔ اُس نے دو تین آوازیں دیں۔ کوئی جواب نہ ملا۔ خود ہی اٹھ کر بچے کو دیکھنے لگی۔

جانے کہاں چلی گئی ہے شہلا ——" وہ ابھی سوچ ہی رہی تھی کہ آہٹ ہوئی۔ نظر اُٹھا کر دیکھا۔ شہلا آ رہی تھی۔ ارے اُس نے تو پہچانا ہی نہیں ——

شہلا نے اُس کا گلابی فلیٹ کا سوٹ پہن رکھا تھا۔ گلے پر تھوڑا تھوڑا کام تھا اور اتنی کھلی قمیض کی کٹائی کر کے اُس نے بالکل اپنے ناپ کی بنا لی تھی اور نہا دھو کر وہی سوٹ پہن کر آ رہی تھی۔ ابھی تک گیلے بالوں سے پانی نکل رہا تھا۔

"آپا آپ نے مجھے بُلایا تھا؟" اُس نے شرماتے ہوئے کہا۔

"اری شہلا، میں نے پہچانا ہی نہیں۔ اتنی جلدی کیسے یہ کپڑے ٹھیک کر لئے؟"

"بس آپا آپ سو گئی تھیں۔ میں نے مشین نکالی۔ جلدی سے کپڑے تیار کئے۔ اور ابھی نہا کر نکلی ہوں۔"

"ذرا بھی پتہ نہیں چل رہا کہ یہ سوٹ میرا تھا۔ بالکل تیرا لگ رہا ہے۔ اس کا مطلب ہے تجھے سلائی بھی بڑی اچھی آتی ہے۔"

"اچھی تو نہیں کہہ سکتی آپا مگر سی ضرور لیتی ہوں۔ گھر میں سب بہنوں بھائیوں کے کپڑے میں ہی سیتی ہوں۔ بلکہ میں تو کہنے لگی تھی کہ اگر آپ نے صبا اور وفا کے فراک سلوانے ہوں تو کسی دن کپڑا نکال دیں۔"

"ضرور ضرور سلواؤں گی۔" اسماء نے خوشی سے کہا۔ "میرے پاس کپڑا پڑا ہے، ذرا ٹھیک ہو جاؤں تمہیں نکال دوں گی۔"

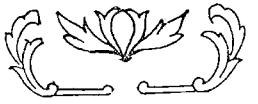

اگلے ہی دن صُبح صُبح شمیم بھابی آگئیں۔ ایک چھوٹا سا ڈبہ لڈوؤں کا لائیں اور ایک پوٹلی میں شہلا کے کپڑے۔ جب اُس نے کھول کر شہلا کے آگے کئے تو اسماء نے دیکھا بہت معمولی اور پُرانے کپڑے تھے۔ پھر بھابی شمیم نے اپنی مجبوریوں کی فہرست سُنانی شروع کردی کہ وہ بچے کی خبر سُن کر اتنے دن مبارکباد کے لئے اس لئے نہ آسکی تھیں کہ چھوٹی لڑکی کو خسرہ نکل آیا تھا۔ بیٹا سائیکل سے گر گیا تھا۔۔۔ بڑے کے امتحان تھے۔ وغیرہ وغیرہ ــــ

اسماء نے شہلا کو چائے لانے کے لئے کہا۔ جس طرح شہلا اسماء کی خدمت کر رہی تھی۔ اسے پہلے کبھی خیال نہ آیا تھا کہ وہ اس لڑکی کو بلا کر اپنے پاس رکھ لیتی۔ نوکروں کی طرح بھاگ بھاگ کر سارا دن کام کرتی تھی۔ مگر ہر کام سے اس کا خلوص جھلکتا تھا۔

سچی بات تو یہ ہے جب بھابی شمیم نے شہلا کو گلابی فلیٹ کے سوٹ میں ہنستے مسکراتے دیکھا۔ تو اس کی باچھیں کھِل گئیں۔ چند دنوں ہی میں اچھا کھانا پینے سے لڑکی کے چہرے پر خون اُتر آیا تھا۔ پہلے کیسا بے رونق چہرہ رہتا تھا اُس کا۔ جیسے کہ کوئی روگ لگ گیا ہو۔ مگر اب وہ بڑی خوش باش نظر آتی تھی۔ گھر کے اندر باہر یوں دوڑتی پھر رہی تھی۔ جیسے برسوں سے یہاں رہتی آئی ہو۔ بھابی شمیم کا دل تو یہ چاہ رہا تھا کہ شہلا ابھی کچھ دن اور یہیں ٹک جاتے تاکہ اس کی

صحت اچھی ہو جائے۔ مگر اوپرے دل سے بولی۔

"پتہ نہیں اس کم بخت نے تمہاری کچھ خدمت بھی کی ہے یا نہیں ــــ؟"

"شہلا بہت اچھی ہے۔" اسماء جلدی سے بولی۔ "مجھے تو اندازہ ہی نہیں تھا کہ یہ اتنی سگھڑ اور سلیقہ شعار ہوگی۔"

"اللہ اس کو نیکی کی توفیق دے۔" بھابی شمیم بولی۔ "اگر تم اجازت دو تو میں اُس کو لے جاؤں"

"ارے ابھی سے ــــ؟ ابھی تو میں اچھی طرح ٹھیک بھی نہیں ہوئی۔ کم از کم بھابی سوا مہینہ تو گذرنے دو۔ میں تو ٹھیک طرح سے مُنے کو اٹھا بھی نہیں سکتی۔ آپریشن کی وجہ سے بہت کمزور ہو گئی ہوں چل پھر نہیں سکتی۔"

"اچھا جیسی تمہاری مرضی۔" بھابی شمیم دل میں خوش ہوتی ہوئی بولی۔ "بچی ہے۔ مجھے ڈر تھا کہ کوئی نقصان نہ کر بیٹھے۔"

"ایسے بہت سمجھدار بھی ہے بھابی۔" اسماء نے کہا۔ "مجھے تو اُس نے بہت سُکھ دے رکھا ہے بس اب تم اس کو بھول جاؤ۔ ماشاءاللہ اتنے بچے ہیں تمہارے۔ اس کے نہ ہونے سے کیا کمی رہ جائے گی۔ جب میں مناسب سمجھوں گی خود ہی بھیج دوں گی۔"

"اللہ کرے سہاگ سے رہو۔ لمبی عمر پاؤ۔ بچوں کی خوشیاں دیکھو۔" بھابی شمیم چھاجوں دعائیں دیتی۔ رخصت ہو گئی۔

اور شہلا کب یہاں سے جانا چاہتی تھی۔ اس گندے غلیظ گھر میں ــــ جہاں سارا وقت تیل کا چُولھا جلتا تھا۔ ہر کمرے سے جھاڑو لگانا پڑتا تھا۔ سب بچوں کے گندے کپڑے دھونا پڑتے تھے۔ صبح و شام برتن مانجھنا پڑتے تھے۔ بے شمار روٹیاں پکانی پڑتی تھیں۔ اور اُس کے باوجود اماں کی پھٹکار الگ تھی۔ نہ کوئی تفریح تھی نہ خوشی۔ کبھی ٹی وی پر فلم دیکھنا ہو تو اماں کی سو سو خوشامد کر کے ہمسائی کے گھر جانے کی اجازت ملتی تھی اور ــــ یہ اتنا خوبصورت سجا سجایا گھر تھا۔ ہر شے خوبصورت اور دلآویز تھی ــــ کھانا پکانے کو خانساماں تھا۔ صفائی کے لئے جمعدارنی تھی۔ کپڑے دھونے کے لئے الگ مائی تھی بس اسے تو ذرا سی جھاڑ پونچھ کر کے بچوں کے کپڑے سلیقے سے رکھنے پڑتے تھے۔ ننھے میاں کا چھوٹا موٹا کام ہوتا ــــ اسماء آپا کو

مالش والش کر دیتی۔ شام کو مزے سے ٹی وی دیکھتی۔ اور بچیوں کے ساتھ میز پہ بیٹھ کر بہترین کھانا کھاتی۔ کھانے کے بعد خوب پھل ملتا۔ اپنے گھر میں مہینوں پھل کی شکل نظر نہ آتی تھی بلکہ بعض دفعہ موسم گذر جاتا تو اسے پتہ چلتا کہ فلاں پھل بازار میں آیا بھی تھا۔

یہ زندگی بہت خوابصورت تھی ـــــ اور یہاں اُسے نوکرانی بن کر رہنا پڑتا تو بھی۔ اُسے منظور تھا۔ بچیاں واقعی اس سے مانوس ہو گئی تھیں اور اسکول سے آنے کے بعد ہر وقت اس کے ساتھ لگی رہتی تھیں۔

اسماء علی احمد کے آگے بھی ہر وقت شہلا کی تعریفیں کرتی رہتی۔ کہ اُس نے کتنی اچھی طرح گھر اور بچیوں کو سنبھالا ہوا تھا۔ اگر اس عالم میں یہ لڑکی نہ ہوتی تو گھر کتنا ویران ہو جاتا۔

رفتہ رفتہ اسماء نے علی احمد کے بہت سے کام بھی شہلا کے سپرد کر دیئے۔ کیونکہ جب سے بچہ ہوا تھا، اسماء الگ کمرے میں آ گئی تھی کہ کہیں علی احمد کو رات جاگنے کی کوئی تکلیف نہ ہو۔ صبح صبح وہ شہلا کو چائے کی پیالی دے کر بھیجتی۔ پھر شیو کا پانی بھی اسی کے ہاتھ بھیجتی کبھی شہلا پیالی واپس لے آتی اور کہتی۔

"آپا۔ دُولہا بھائی تو سو رہے ہیں۔"

"ارے جگا دو نا ـــــ؟"

"اللہ میں کیسے جگاؤں بھئی۔ اگر انہوں نے ایک ہاتھ جڑ دیا تو ـــــ"

اس پر اسماء خوب ہنستی اور پھر خود جا کر علی احمد کو جگا دیتی۔ کئی بار اُس نے شہلا سے کہا کہ:

"علی احمد کو دولہا بھائی کیوں کہتی ہو۔ رشتے میں وہ پھوپھا ہوتے ہیں۔"

"مگر آپ کو جو آپا کہتی ہوں۔ تو وہ میرے دُولھا بھائی ہی ہوئے۔ ویسے بھی مجھے بڑا شوق تھا کہ میری بڑی بہن ہو۔ بہنوئی ہو۔"

"لیکن ہماری شادی کو تیرہ برس ہو گئے۔ اب وہ کہاں کے دُولھا بھائی ہیں۔"

"بھئی ہمیں تو دولھا ہی لگتے ہیں۔ ہم تو دولھا بھائی ہی کہیں گے، چاہے آپ کو بُرا لگے۔"

اس پر اسماء ہنس پڑی۔

"احمق لڑکی ہے ——"

جب اسماء ذرا ٹھیک ہوئی تو اُس نے اپنے پُرانے بکس کھول کے اس میں سے شادی کے پُرانے جوڑے نکالے۔ شادی سے پہلے اسماء بہت دُبلی پتلی تھی، لیکن اب وہ کپڑے اُسے پورے نہ آتے تھے اور ویسے ہی اُس نے سنبھال رکھے تھے اُس میں پانچ جوڑے اُس نے شہلا کو دے دیئے۔ ایک گوٹے والا غرارہ بھی تھا، وہ کپڑے دیکھ کر شہلا اتنی خوش ہوئی جیسے دو جہاں کی دولت مل گئی ہو۔

"اللہ، آپا آپ کتنی اچھی ہیں۔ ہائے اللہ —— کتنے پیارے کپڑے ہیں۔"

اسی طرح اسماء نے اپنے بہت سے پُرانے سینڈل، چوڑیاں اور رومال بھی دیئے حتیٰ کہ میک اَپ کی وہ چیزیں جن کی اسماء کو ضرورت نہ تھی۔ وہ بھی اُسے دے دیں۔ وہ سوچ رہی تھی کہ یہ کپڑے اور چیزیں ایک غریب لڑکی کی زندگی بن گئی ہیں۔ بہرحال شہلا کی مدد کر کے اسے بہت خوشی ہوئی تھی۔ شہلا جس خلوص اور لگن سے اس کی خدمت کر رہی تھی، اس کے صلے میں یہ بہت کم تھا۔ کبھی کبھی وہ سوچتی کہ وہ شہلا کو ہمیشہ کے لئے اپنے پاس رکھ لے گی۔ اس کی بچیوں کی بھی نگرانی ہوتی رہے گی اور وہ بھی اِدھر اُدھر آجا سکے گی۔ پھر کوئی اچھا رشتہ دیکھ کر وہ شہلا کی شادی کر دے گی۔

ایک دن اُس نے یہی بات شہلا سے کہہ دی تو وہ شرم سے سُرخ ہو گئی۔ اُس نے منہ سے تو کچھ نہ کہا مگر اسماء کو یوں لگا جیسے شہلا کو یہ شادی والی بات بہت پسند آئی ہے ہر لڑکی کی تمنا شادی ہوتی ہے۔ مگر غریب لڑکی تو شادی کو اپنی خوشیوں کی معراج

سمجھتی ہے۔

اس کے بعد تو شہلا نے اور بھی زیادہ خدمت گزاری کے ثبوت دینے شروع کر دیئے ایک خوبی اس میں بہت بڑی یہ تھی۔ کہ ہر وقت ہنستی مُسکراتی نظر آتی تھی۔ ہر کام ہنس ہنس کر کرتی۔ اُس کا ہنستا ہوا شگفتہ چہرہ اسماء کو بڑا اچھا لگتا تھا۔

ویسے بھی اب اسماء نے غور کرنا شروع کیا تھا۔ شہلا اب بہت خوبصورت نکلتی آتی تھی۔ دو مہینے یہاں رہ کر اس کا رنگ صاف ہو گیا تھا۔ جسم اور چہرہ بھر گیا تھا۔ آنکھوں میں چمک آ گئی تھی۔ جوانی کو خوشی میسّر آجائے تو حسن بن جاتی ہے۔ بچاری لڑکی اچھی خاصی خوبصورت تھی مگر غربت نے اُس کا ستیاناس مار دیا تھا۔

اسماء ازل سے خدا ترس تھی اور جب خدا ترسی پر آیا کرتی تھی تو حد سے زیادہ بھی گزر جاتی تھی۔ جب بھی اُس نے کسی کے بارے میں سوچا بڑے خلوص سے سوچا اور جو سوچا کر دکھایا۔

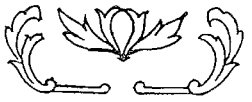

مُنّا تین مہینے کا ہو گیا تو اسماء کو کچھ ہوش آیا۔ یوں تو اُس نے اس سے پہلے تین بچیوں کو جنم دیا تھا اور پالا پوسا تھا مگر لڑکے کی دفعہ اسے ایسا محسوس ہوتا جیسے یہ اس کا پہلا بچہ ہے، اس سے پہلے اسے کوئی تجربہ نہ تھا۔ یا شاید یہ لڑکا تھا اور بڑی مُنّتوں مرادوں کے بعد پیدا ہوا تھا۔ اس لئے ہمہ وقت اس کی جان اسی میں اٹکی رہتی تھی۔ ذرا سی پیٹ میں گڑبڑ ہوتی تو اس کی جان نکل آتی۔ دوسری چھینک پہ ڈاکٹر کے پاس دوڑی جاتی۔ کبھی گرم کپڑے کبھی ٹھنڈے کپڑے۔ دودھ اپنے ہاتھ سے بناتی۔ خود پلاتی۔ اور جتنا دھیان رکھتی بچہ اتنا ہی بیمار رہتا۔ کمزور رہتا۔ تب اسے احساس ہوتا کہ یہ لڑکیاں کتنی بے ضرر ہوتی ہیں آسانی سے پل جاتی ہیں۔ لڑکے تو پیدائش سے ہی مسئلے کھڑے کر دیتے ہیں۔ اور کس قدر ناز نخرے اٹھواتے ہیں۔ لیکن پھر وہ اللہ کا شکر ادا کرتی جس نے اس کی مُراد پوری کی تھی۔

اب مُنّا اس قابل تھا کہ وہ اسے شہلا کے پاس چھوڑ کر باہر بھی چلی جاتی۔ سودا بھی لے آتی۔ گھر میں زندگی رفتہ رفتہ معمول پہ آتی جا رہی تھی۔ ایک عرصے سے وہ علی احمد سے بالکل بے پروا ہو گئی تھی۔ اُس کے زیادہ تر کام اس نے شہلا کے سپرد کر رکھے تھے۔ اب رفتہ رفتہ خود اس کے کاموں میں دلچسپی لینے لگی تھی۔ کبھی اس کی کپڑوں والی الماری کھول کر قمیصوں اور پتلونوں کے بٹن ٹھیک کرنے لگتی۔ کبھی نائٹ سوٹوں کا حساب کرتی۔ سردی اور گرمی کے کپڑے الگ کر کے رکھتی۔ اُس نے تو تقریباً ایک سال سے یہ سب کام کرنے بند کر دیئے تھے۔ جب سے بچہ پیدا

ہونے والا ہوا تھا۔ وہ ہر شے سے بیزار ہو گئی تھی۔

گھر سارا دن شہلا اُس کے ساتھ لگی رہتی۔ مگر کبھی کبھی اسے محسوس ہوتا کہ شہلا کہیں دُور کے خیالوں میں مگن ہے۔ اس میں وہ پہلے جیسی چستی نہیں رہی ـــــ بات کرتی کرتی کھو جاتی ہے۔ کبھی بیٹھی آپ ہی آپ مُسکرائے جاتی ہے ـــــ ایک عجیب بات اُس نے یہ دیکھی کہ وہ اپنا زیادہ وقت بناؤ سنگھار میں گذارنے لگی تھی۔ زیادہ وقت آئینے کے آگے کھڑی رہتی گنگناتی رہتی۔ آتے جاتے ہوئے سنگھار میز کے شیشے میں اپنی شکل ضرور دیکھتی۔

جوانی میں لڑکیاں یہ سب کرنے لگتی ہیں۔ یہ عمر ہی ایسی ہوتی ہے۔ وہ دل میں سوچتی شاید کھانے پینے کو اچھا ملا ہے تو اس کی لاشعوری خواہشات جاگ رہی ہیں۔ کبھی وہ یہ بھی سوچتی کہ اس نے اتنے اچھے کپڑے اور میک اپ کا سامان دیکر کہیں غلطی تو نہیں کی۔ اسے تو جھوٹا موٹا کھانے اور معمولی کپڑے پہننے کی عادت تھی۔ اتنی جلدی کسی کی عادت بدلنے کی کوشش نہیں کرنی چاہیئے ـــــ ایسا نہ ہو ـــــ وہ ـــــ کچھ ایسا ویسا کر بیٹھے۔ پھر وہ اس کی ماں کو منہ دکھانے کے قابل نہ رہے گی۔

"نہیں نہیں"۔ پھر وہ خود ہی اس کی تردید کرتی "شہلا ایسی لڑکی نہیں ہے۔ اسے میری عزت کا پاس ہوگا۔ پھر میں اُسے کونسا گھر سے باہر نکلنے دیتی ہوں۔ چار دیواری میں رہ کر جو مرضی کرے"۔

ویسے بھی بھابی شمیم نے بچی کو بالکل اس کے حوالے کر دیا تھا۔ ان تین مہینوں میں وہ صرف دو بار آئی تھی۔ اور جاتے جاتے کہہ گئی تھی۔

"پہلے تو شہلا نے سارا گھر سنبھالا ہوا تھا۔ اس لئے میں گھر سے نکل آیا کرتی تھی مگر اب میرا گھر سے نکلنا مشکل ہو گیا ہے، روز روز نہیں آ سکتی"۔

اسماء کو بھی اس کی مجبوری سمجھ آ گئی تھی۔

پر اُس کو بھابی شمیم کے آنے نہ آنے سے کوئی دلچسپی نہ تھی اس کا کام تو شہلا سے ہی چل رہا تھا۔

ویسے وہ آجکل مسلسل شہلا کی شادی کے بارے میں سوچ رہی تھی۔ دُور دُور نزدیک کے

کئی لڑکے اُس کے ذہن میں آتے، مگر وہ چاہتی تھی، لڑکا غریب نہ ہو۔ اُسے اچھی زندگی دے سکے۔ ایسا نہ ہو ایک غربت سے نکل کر دوسری غربت میں فنا ہو جائے اور دُوسرا یہ کہ لڑکا شریف النفس ہو۔ تاکہ اسے ازدواجی زندگی کا سارا سُکھ دے سکے۔

خیر ـــــ اُس نے سوچا پہلے وہ لڑکے کا عندیہ معلوم کرے گی اور پھر بھابی شمیم سے بات کرے گی۔ اس اثنا میں شہلا پر کڑی نگاہ رکھنے کی ضرورت ہے۔ جوانی کا کیا ہے۔ یہ تو دیواروں میں روزن نکال لیتی ہے اور فصیلوں سے اس طرف دل کے دھڑکنے کی صدا سُن لیتی ہے۔

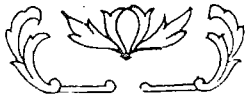

کڑی نگاہ رکھی تو بہت سی قابلِ اعتراض باتیں اس کے مشاہدے میں آنے لگیں! ایسا بھی نہ ہوتا اگر وہ آج صبح صبح ہی صبح ایک عجیب سا منظر نہ دیکھ لیتی۔ آج کل تو وہ صبح کے ناشتے پر خود میز پہ آجاتی تھی اور علی احمد کو ناشتہ کروا کے بھیجتی تھی۔ ورنہ تین چار مہینے سے وہ پابندی سے میز پہ نہیں جاتی تھی بلکہ مُنّے میں مصروف رہتی تھی اور شہلا سے کہہ دیتی تھی جاؤ ذرا دولھا بھائی کو ناشتہ کرا دو۔

شہلا بھی دولہا بھائی کا ہر کام کرنے پلکوں کے بل چل کر جاتی تھی۔ تب اس کو اسماء احسان مندی کے جذبات کہتی تھی . . . .

آج صبح بھی اسماء نے علی احمد کی پسند کا ناشتہ میز پہ لگایا ابھی خود بیٹھنے لگی تھی کہ مُنّے کے رونے کی آواز آئی۔ وہ دوڑ کر جانے لگی تو دروازے میں اُس کی علی احمد سے ٹکر ہو گئی۔ وہ ناشتے کی میز پہ آرہے تھے۔

"میں ابھی آئی" کہہ کر وہ باہر نکل گئی۔

مُنّے کو دودھ پلانے میں ذرا دیر ہو گئی۔ ابھی وہ اپنی قمیض ٹھیک کرتی۔ کھانے والے کمرے کی طرف آرہی تھی کہ اندر سے اُسے ہنسنے کی آواز آئی۔ یقیناً یہ ہنسی تو شہلا کی تھی شہلا جسے ہر وقت ہنستے کھلکھلانے کی عادت تھی ـــــ وہ جانتی تھی کہ یہ اس کا لڑکپن ہے مگر نہ جانے آج کیا ہوا، اس کے لاشعور میں ایک واہمہ سا جاگا۔ اور اُس نے دبے

پاؤں چل کر پیڑے کی اوٹ سے دیکھا، علی احمد ناشتہ کر رہے تھے اور شہلا ساتھ والی کرسی کی پُشت پر جھکی کھڑی تھی اور بڑی بے تکلفی سے ان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر ہنس رہی تھی۔ علی احمد نے زیرلب کچھ کہا ـــــ وہ پھر ہنس پڑی۔ اور اُس نے بھی ادا سے کچھ کہا۔

وہ نوالہ جو علی احمد اپنے مُنہ میں لے جا رہے تھے۔ وہ انہوں نے شہلا کی طرف بڑھا دیا۔

شہلا نے مُنہ کھولا اور نوالہ اُن کے ہاتھ سے اپنے مُنہ میں لے لیا۔

اسماء کے پاؤں تلے سے زمین سرک گئی۔ ایک شعلہ اُٹھا ـــــ اور تن من جلا کر خاکستر کرتا گیا۔

اتنے میں علی احمد اُٹھے۔ ہاتھ دھوئے۔ تولیئے سے صاف کیئے۔ شہلا اُن کے پیچھے پیچھے رہی۔ جاتے مدھم سروں میں انہیں کیا کہہ رہی تھی کہ وہ بدستور مسکراتے جا رہے تھے۔

پھر جاتے جاتے انہوں نے پیار سے ایک ہلکی سی چپت شہلا کے لالہ گوں رخساروں پر ماری اور باہر کی طرف لپکے۔

اسماء دوڑ کر بچے کے کمرے میں چلی گئی۔ وہ اُن پر ظاہر نہ کرنا چاہتی کہ اُس نے چھپ کر سب کچھ دیکھا ہے۔

وہ اس کے کمرے میں خدا حافظ کہنے آئے۔ تو اسماء نے محسوس کیا۔ انہوں نے بہت تیز خوشبو لگا رکھی تھی اور سوٹ بھی سب سے اچھا زیب تن کیا ہوا تھا اور وہ واقعی ہمیشہ سے زیادہ اسمارٹ لگ رہے تھے۔

اسماء نے جلدی سے اپنے حواس دُرست کیئے۔ روز والے انداز میں انہیں خدا حافظ کہا۔ وہ باہر نکل گئے۔

تب وہ اپنے پلنگ پر بیٹھ گئی۔ اور موجودہ حالات پر غور کرنے لگی۔

جو کچھ اس نے دیکھا تھا وہ کیا تھا۔

کیا شہلا نے بچگانہ انداز میں یہ حرکت کی۔ کیا یہ اس کا خلوص تھا کہ وہ علی احمد کو واقعی

اپنا بہنوئی سمجھ کر اس حد تک آگے بڑھ گئی تھی۔ یا وہ اتنی نادان تھی کہ اسے اس بات کی سمجھ نہیں تھی کہ جس ہنڈیا میں کھاتے ہیں اس میں چھید نہیں کرتے۔

اور علی احمد ـــــ کیا وہ نہیں جانتا میں نے اس یتیم لڑکی کو کیوں آسرا دیا ہے اور یہ کہ ایسے کھیل گھروں میں نہیں کھیلے جاتے ـــــ اور بیوی کے اعتماد کو یوں پامال نہیں کیا جاتا؟

یا ـــــ

یہ محض میری غلط فہمی تھی۔ مغالطہ تھا۔ ایسی کوئی بات نہیں جس کا اندیشہ میرے دل میں اُبھر رہا ہے۔

وہ ابھی یہی سوچ رہی تھی کہ شہلا اس کے کمرے میں آ گئی۔

"آپا آپ ناشتہ کریں گی یا میں میز سے برتن اٹھا لوں؟"

اسماء نے اسی انداز میں نظر اٹھا کر شہلا کے چہرے کی طرف دیکھا اور پھر کافی دیر تک حیرت سے اُس کی آنکھوں میں دیکھتی رہی ـــــ

اس کے اس انداز پر شہلا بوکھلا گئی۔ اور اُس نے جلدی سے اپنی نظریں جُھکا لیں جیسے کہ مارے شرم کے ان آنکھوں کا مُقابلہ نہیں کر سکتی تھی۔ اس کے چہرے پر عجیب سی شرمندگی تھی۔ جیسے کچھ چھپانا چاہ رہی ہو۔ پہلے وہ کمرے میں آتی تو اس کا چہرہ لال تھا۔ مگر کھڑے کھڑے پیلا ہو گیا۔

"ہوں ـــــ"

اسماء ایک دم کھڑی ہو گئی۔

"تم منے کے پاس بیٹھو میں ناشتہ کر کے آتی ہوں۔"

شہلا کا چہرہ وہ سپید ہا، سچا اور صاف چہرہ نہ تھا۔ جیسا پہلے تھا۔ اس آئینے پر غبار تھا ـــــ اور اس کی آنکھوں میں وہ بے باکی اور معصومیت بھی نہ تھی۔ بے جھجک بولتی تھی، بے خوف دیکھتی تھی ـــــ اور سادگی میں احمقانہ حرکتیں کر جاتی تھی۔

وہ کافی محتاط اور چالاک لگ رہی تھی۔

'تو اسما جی!'

اُس نے ناشتے کی میز پر بیٹھ کر سوچا۔

تُم نے بھی اتنا پڑھ لکھ کر وہی حماقت کی، جو دنیا کی سینکڑوں عورتیں کرتی ہیں اور عمر بھر روتی ہیں۔

تُو جانتی ہے۔ جوانی ایک بڑی طاقت ہے اور ڈھلتی عمر کا مرد کمزور ہوتا ہے۔

تُو جانتی ہے کہ پٹرول کو آگ کے قریب نہیں رکھتے۔

تُو جانتی ہے کہ جب غریب لڑکی کو کھانے پینے کو وافر ملنے لگتا ہے۔ تو وہ اخلاقیات کی ہر حد توڑ دیتی ہے۔

اور تُو یہ بھی جانتی ہے کہ فطرتاً انسان خود غرض ہے۔

پھر تُو نے کیوں آنکھیں موند لیں ——

اُف —— تو اتنا بھی اعتماد انسان کسی دوسرے انسان پر نہیں کر سکتا۔ میں اپنے شوہر کو اچھی طرح جانتی تھی —— ہماری کو میرج ہوئی۔ تب سے لے کر اب تک اس نے مجھے کسی شکایت کا موقع نہیں دیا۔ میں اس پر بھروسہ کرتی تھی، اور وہ مجھ پر —— اور زندگی یونہی گذر رہی تھی —— اور زندگی میں تُو نے خود زہر گھولنے کی کوشش کی ——

لیکن ضروری نہیں کہ یہ صحیح ہو —— یہ لڑکی اگر اپنے گھٹیا ہونے کا ثبوت دے رہی ہے تو ضروری نہیں کہ میرا شوہر بھی گھٹیا ثابت ہو ——

او پاگل عورت! شوہر کی صورت میں نہ سوچ —— ایک مرد کی فطرت سامنے رکھ کر سوچ ——'

اُف اللہ —— بیٹھے بٹھائے اُس کے ذہن میں بھونچال آگیا تھا۔ اُس سے ناشتہ بھی نہیں کیا جا رہا تھا۔ بس دکھاوے کو ایک پیالی چائے کی بنا کر سامنے رکھی ہوئی تھی۔ دراصل وہ اس موڑ میں شہلا کا سامنا نہ کرنا چاہتی تھی اپنی عادت کے مطابق ہر پہلو سے اس معاملے پر غور کرنا چاہتی تھی کچھ اور ثبوت بھی حاصل کرنا چاہتی تھی ——

پھر اسے گزرے ہوئے کچھ واقعات یاد آنے لگے —— ایک دن صبح ہی صبح شہلا جب اس کے کمرے میں داخل ہوئی تو اس کے گال پر چٹکی کا نشان تھا ——

"دولہا بھائی کو چائے دے آئی ہو ——"

"ابھی دے کر آ رہی ہوں ——" اس نے کہا۔

"اور یہ تمہارے گالوں پر کیا ہوا ہے ——؟"

"کیا ہوا ہے آپا ——؟" اُس نے گھبرا کر اپنے دائیں گال پر اپنا ہاتھ رکھ لیا۔

"کسی شے نے کاٹا تو نہیں۔ نیلا نشان پڑا ہے۔"

وہ بھاگ کر باہر نکل گئی تھی۔ جب واپس آئی تو اس پر کریم لگا رکھی تھی۔ بولی 'سوتے میں کسی شے نے کاٹ لیا ہے۔'

ایک دن وہ علی احمد کے کمرے سے ہنستی کھلکھلاتی باہر نکلی —— اور نکلتے ہوئے اسما سے ٹکر ہو گئی۔

"کیا ہوا ——؟"

"کچھ نہیں آپا —— کچھ بھی تو نہیں —— میں دولہا بھائی کو شیو کا پانی دینے گئی تھی۔ کہتے تھے اب اتنا گرم پانی لائیں تو تمہارے اوپر انڈیل دوں گا۔"

اسما نے علی احمد کے کمرے میں جھانک کر دیکھا۔ وہ شاید غسل خانے میں جا چکا تھا

یہ تو اسما نے اکثر محسوس کیا تھا۔ کہ شام کو علی احمد کی موٹر کا ہارن سُن کر شہلا سب کام چھوڑ کر باہر نکل جاتی تھی اور واپسی پر اُن کا بریف کیس تھامے ہنستی گنگناتی اندر آتی تھی —— اور پھر دھڑ دھڑ کر ان کے کام کرنے لگتی اور پھر کچھ دنوں بعد اسما نے محسوس کیا وہ ان کے کمرے میں بہت جانے لگی ہے کبھی ایک چیز لے کر —— کبھی دوسری لے کر ——

ایک دن جب وہ دس بجے تک وہاں رہی —— تو اسما نے پکار کر کہا —— "اندر کیا کر رہی ہو ——؟"

اس رات علی احمد کسی کھانے پر گیا ہوا تھا۔ اور اس نے دیر سے آنا تھا۔

شہلا بولی۔ "دُولہا بھائی کا سلیپنگ سوٹ نکال کر رکھ رہی تھی۔"

اسماء کو کچھ بُرا سا لگا کہ وہ اس کے شوہر کا سلیپنگ سوٹ کیوں نکالے۔ اس لئے بولی۔

"تم ساری ذمہ داریاں خود مت اٹھاؤ۔ بس منے کا کام ہی کیا کرو۔ سارا دن ادھر تھوڑے کام ہوتے ہیں۔"

"نہیں آپا ـــــ مجھے دُولہا بھائی کے کام کر کے بھی بڑی خوشی ہوتی ہے، جب تک آپ ٹھیک نہیں ہو جاتیں۔ سب کام میں کر دوں گی۔" اُس نے اسے بچگانہ ضد ہی سمجھا تھا۔

نہ صرف یہ کہ وہ بھاگ بھاگ کر علی احمد کے کمرے میں جاتی تھی، بلکہ اُس نے بناؤ سنگھار بھی کرنا شروع کر دیا تھا۔ اور اسی بات نے اسماء کو چونکا دیا تھا۔

اور اب میز پر اسماء بیٹھی خود کو ہی لعنت ملامت کر رہی تھی۔ کہ اگر لڑکی ذات کو گھر میں بلا لیا تھا تو اس پر کنٹرول کیوں نہ کیا۔

بہر حال یہ ایک ایسی بات تھی۔ جس کو وہ منہ سے نہ نکال سکتی تھی۔ اس نے سائیکالوجی میں ایم اے کر رکھا تھا۔ تیرہ سال سے ایک مرد کے ساتھ رہ رہی تھی۔ خوب جانتی تھی کہ بازپرس کا انجام کیا ہو گا؟ پھر بھی اُس نے سوچا ـــــ ابھی وہ حالات کا اور اچھی طرح جائزہ لے ممکن ہے اُسے غلط فہمی ہوئی ہو۔ اور پھر علی احمد کو بھی ٹٹولنے کی ضرورت تھی۔

رات آنے سے پہلے اس نے اپنا اور بچے کا بستر علی احمد کے کمرے میں لگا دیا۔ پانچ مہینے گذر گئے تھے اسے الگ کمرے میں سوتے ہوئے ـــــ اور یہ بھی اس نے محض علی احمد کے آرام کے لئے کیا تھا۔ مگر اب دُور رہنا خلافِ مصلحت تھا ـــــ اور شہلا کو اس نے بڑی نرمی سے سمجھا دیا تھا کہ وہ ان کے کمرے میں نہ آیا کرے۔ جب وہ بلائے تبھی آئے زیادہ تر لڑکیوں کے کمرے میں رہا کرے۔

پھر رفتہ رفتہ اس نے علی احمد کے سب کام اپنے ہاتھ میں لے لئے ـــــ یکایک اس کے اس رویے پر علی احمد بہت حیران ہوا۔ مگر اس نے اپنی حیرت کا اظہار

نہیں کیا۔

کمرے میں آ کر اسماء نے غور کیا۔ کہ علی احمد نے بھی کافی پرپُرزے نکالے ہوئے تھے پہلے تو بے ڈھنگے طریقے سے تیار ہو کر جاتا تھا۔ مگر اب صبح کو بڑے سلیقے سے تیار ہوتا۔ اور قرینے سے ٹائی لگاتا حالانکہ ٹائی سے وہ ہمیشہ چڑتا تھا۔ اگر کبھی لگا بھی لیتا تو اسماء کے مجبور کرنے پر ـــــ اس کا جسم اب کافی بے ڈول ہو گیا تھا۔ مگر آجکل بہت اسمارٹ نظر آ رہا تھا میز پر ولایتی قسم کی نئی خوشبوئیں اور آفٹر شیو لوشن آ گئے تھے ـــــ درازوں میں نئے دستی رومال ـــــ اور کف لنکس آئے پڑے تھے۔ یہ سب کچھ اس نے شادی کے شروع دنوں میں بھی کیا تھا لیکن ادھر کچھ سالوں سے اس پر عجیب سی سستی اتر آئی تھی۔ نہ نیا لباس بنوانے کا شوق رہا نہ خوشبوئیں چھڑکنے کا ـــــ

اس کا جسم بھی فربہی کی طرف مائل ہو گیا تھا بلکہ اچھی خاصی توند نکل آئی تھی۔ وہ کہہ کہہ کر ہار گئی تھی مگر سنتا ہی نہ تھا۔

اب علی احمد بیالیس سال کا تھا اور کہتا تھا کہ بیالیس سال کے مرد سے تم کیا توقع رکھتی ہو۔ اس ملک میں اس عمر کا مرد تو روزی کے چکروں میں ہی فنا ہو جاتا ہے ـــــ یہاں چالیس سال میں جوانی رخصت ہو جاتی ہے۔

خود وہ بھی تو سُست ہو گئی تھی اپنی پرواہ نہ کرتی تھی۔ نہ وہ لباس کا شوق رہا تھا۔ نہ وہ میک اپ کا ذوق رہا تھا۔ بس سارا وقت اپنی لڑکیوں کے بارے میں سوچتی رہتی تھی۔

گو وہ علی احمد سے دس سال چھوٹی تھی۔ مگر اب دونوں برابر کے لگتے تھے۔ وہ سمجھتی تھی زندگی میں الجھنے کا دور گزر گیا ہے اور خطرناک راستے وہ عبور کر آئے ہیں۔ اب اُن کے پیشِ نظر بچے ہیں۔ مگر یوں لگ رہا تھا جیسے سب سے خطرناک کھائی اب اس کے سامنے آئی ہے۔ جب رات کو اسماء نے علی احمد کے کمرے میں سونا شروع کر دیا تو علی احمد نے کسی قسم کے تعجب کا اظہار نہیں کیا جیسے کہ یہ معمول ہو۔ مگر اسماء کو یوں محسوس ہوا کہ اُس نے خوشی کا اظہار نہیں کیا تھا۔ بہر حال اب جب تک علی احمد گھر میں رہتا۔ وہ زیادہ تر اس کے

اِرد گرد منڈلاتی رہتی ـــــ کچھ دنوں بعد اس نے محسوس کیا جیسے شہلا کا موڈ بہت خراب رہتا ہے ـــــ اور سارے کام وہ پہلے کی سی دلجمعی کے ساتھ نہیں کرتی۔

'اچھا تو معاملہ یہاں تک آپہنچا ہے ـــــ'

ابھی وہ کوئی فیصلہ نہیں کر پائی تھی۔

ایک دن پھر عجیب بات ہوئی۔ صبح ناشتے کے بعد حسبِ معمول علی احمد اندر اسماء کو خدا حافظ کہہ کر باہر چلا گیا۔ اسماء نے شہلا کو بچّے کے کمرے میں بٹھا رکھا تھا ـــــ اس نے دیکھا کہ شہلا بڑی سرعت سے بچّے کے کمرے سے نکلی اور علی احمد کے پیچھے باہر کو لپکی ـــــ

علی احمد گیراج سے کار نکال رہا تھا۔ اسماء بھی پیچھے چلی گئی۔ دیوار کی جالی میں سے اس نے دیکھا۔ شہلا کھڑی زار و قطار رو رہی تھی اور علی احمد اس کے آنسو پونچھ رہا تھا ساتھ ساتھ اِدھر اُدھر بھی دیکھتا جاتا تھا۔ پھر اُس نے بچّوں کی طرح چمکار اس کے سر پر بوسہ دیا۔ اُدھر نہ جانے جُھک کر کیا کہا کہ شہلا ایک دم ہنس پڑی۔ ادا سے اسے ہاتھ ہلا کر خُدا حافظ کہا۔ علی احمد کار نکال کر لے گیا۔ اور وہ کافی دیر تک ہاتھ ہلاتی رہی۔ یہ دیکھ کر اسماء اندر آ گئی۔ مُنّا اکیلا لیٹا ہوا تھا۔ اسے غصّہ تو بہت آیا ـــــ مگر کچھ کہنا مناسب نہ سمجھا۔

بس اتنا بولی۔

"شہلا تم تیاری کرو۔ میں تمہیں اپنی ماں کے پاس چھوڑ آؤں۔ گھر سے آئے تمہیں چھ مہینے ہو گئے ہیں اور تم ایک بار بھی نہیں گئی ہو۔ یقیناً تم بھی اداس ہو گئی ہو گی۔ کیونکہ میں دیکھ رہی ہوں۔ آجکل تم کچھ کھچی کھچی رہتی ہو۔ اور کسی کام میں تمہارا دل نہیں لگتا۔۔۔۔"

"مگر آپا۔۔۔ وہ۔۔۔۔ صبا اور حنا ـــــ میرے بعد روئیں گی۔"

"میں انہیں منالوں گی ـــــ تم کچھ دن گھر رہ آؤ ـــــ پھر میں تمہیں بُلالوں گی۔"
اسماء نے اتنے کھردرے انداز میں کہا کہ شہلا آگے کچھ نہ کہہ سکی۔ بڑی بے دلی سے اپنا سامان سمیٹنے لگی۔

اسماء نے اُسے دو نئے جوڑے اور ایک سو روپیہ دیا۔ ساتھ میں ایک مٹھائی کا ڈبہ بھی دے دیا۔ اور بولی۔

"بھابی شمیم کا بہت بہت شکریہ ادا کرنا۔ میں خود تمہارے ساتھ چلتی مگر اس وقت میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ پھر کسی روز آکر ان کا شکریہ ادا کردوں گی۔" شہلا ابھی تک اپنی جگہ پر پتھر کا بُت بنی کھڑی تھی۔ جیسے کسی اور حکم کی منتظر ہو ـــ جیسے اسے آس ہو کہ اسماء اسے روک لے گی۔

اسماء کے تن میں آگ ہی تو لگ گئی۔

مگر بڑے پُرسکون لہجے میں بولی۔

"مجھے تو ہمیشہ تنہا رہنا ہے۔ تمہارے آنے سے میری عادتیں بھی خراب ہوگئی تھیں۔ کوئی ساری زندگی کے لئے تو کسی کے گھر نہیں بیٹھ سکتا ـــــ اس لئے اب تم جاؤ ـــــ اور ہاں ـــــ جب تک میں خود نہ بلاؤں۔ تم نہ آنا۔" اس آخری فقرے نے شہلا کو آگ بگولا کردیا۔

نفرت کا ایک زرد سانپ اس کے چہرے پر پھنکارا۔ اور پھر کہیں غائب ہوگیا۔

اس نے ڈرائیور کو کہا کہ شہلا کو چھوڑ کر جلد گھر آجائے۔

شام کے خلافِ معمول گھر میں کافی خاموشی تھی۔ ویسے علی احمد خاموش طبع آدمی تھا۔ پہلے بھی زیادہ باتیں نہیں کرتا تھا۔ نہ گھر کے ہنگاموں میں حصہ لیتا تھا۔ زیادہ تر اپنے کمرے میں ہی لیٹا رہتا تھا۔ آج بھی اپنے کمرے میں آکر لیٹ گیا۔ لیکن گھر کی یہ خاموشی اسے کچھ زیادہ کھل رہی تھی۔ بار بار نظر اٹھا کر دروازے کی طرف دیکھتا اور ہر بار اسماء اس کی نگاہوں کا تعاقب کرتی۔ مگر دونوں خاموش تھے۔ ایک دوسرے سے کچھ نہیں کہہ رہے تھے۔

پھر رات کو سونے وقت جب مُنا بہت زیادہ مچلنے لگا اور چلا چلا کر چھت سر پر

اٹھالی تو علی احمد سے نہ رہا گیا۔ بولا ـــ

"شہلا کو بُلا کے اس کے حوالے کردو۔ چُپ کرا لائے گی۔ خواہ مخواہ شور مچا رکھا ہے ـــــ"

اسماء نے غصّے سے پہلے علی احمد کی طرف دیکھا ـــــ پھر مُنے کو زور سے پلنگ پہ پٹخ دیا ـــــ

اور باوجود ضبط کے جانے کب کا رُکا ہوا غصّہ الفاظ میں ڈھل گیا۔

"اس بدبخت کو میں نے واپس بھیج دیا ہے ـــــ رزیل آخر رزیل ہوتا ہے۔ اسے سینے سے لگانے کی ضرورت نہیں ہوتی ـــــ موریوں کے کیڑے اپنی اوقات بھول جاتے ہیں ـــــ اور محلوں کی دیواروں سے لپٹنے لگتے ہیں۔"

"ہوں . . . تو یہ بات ہے ـــــ" علی احمد نے سوچا اور پھر کوئی جواب دیئے بغیر نیوز ویک کو ہاتھ میں پکڑا اور لیٹ کر پڑھنے لگا۔

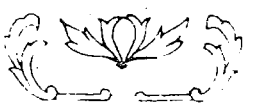

پھر اس کے بعد ان دونوں میں اس قسم کی کوئی بات نہیں ہوئی تھی اسماء جو نہ کہنا چاہتی تھی۔ غصّے میں کہہ گئی تھی اور علی احمد جو بظاہر بالکل انجان بنا ہوا تھا سب کچھ سمجھ چکا تھا ـــــ شہلا اس گھر سے چلی گئی تو گویا سبھوں کے دِل سے نکل گئی۔ نہ علی احمد نے کُریدا نہ اسماء نے ہوا دی۔

ہوا دینے سے چنگاریاں بھی شعلے بن سکتی ہیں۔ یہ اسماء خوب جانتی تھی۔ پھر اس کے پاس کوئی واضح ثبوت نہ تھا اور جو ثبوت تھے ان کو اس کا دل اور ذہن ہی مان رہا تھا نہ ؟ کسی اور سے کہہ دیتی تو شاید اسے وہمی کا خطاب مِلتا۔

زندگی کی گاڑی پھر چل پڑی ـــــ رفتہ رفتہ ہر بات معمول پر آگئی۔

دِن رات گزرنے لگے۔

جس طرح کہ پہلے گزر رہے تھے۔ بظاہر اسماء نے علی احمد کے ساتھ اپنا رویّہ بالکل بدل لیا تھا۔ اس بات کا بہت خیال رکھتی بلکہ ظاہر یہ کرتی جیسے اس کو اس کی ہر بات کی چِنتا لگی رہتی ہے۔

مگر اندر ہی اندر اسماء محسُوس کرتی تھی جیسے زندگی میں کوئی کمی واقع ہوئی ہے ایسے جیسے وہ دونوں پہلے والے نہیں ہیں۔ شاید اس لئے کہ اسے اب علی احمد پر ذرا بھی اعتبار نہ رہا تھا۔ وہ دفتر جاتا ـــــ تو کوئی واہمے اسکو ستاتے رہتے ـــــ ذرا دیر سے آتا

تو کئی خیال آتے ـــــ دن میں سو بار بدگمان ہوتی۔ سو بار اپنے دِل کو مناتی ـــــ کبھی کبھی اسے ایسے لگتا، علی احمد بھی سب کچھ اوپرے دل سے کر رہا ہے شاید اس کے دل میں بھی بدگمانی بیٹھ گئی ہے ـــــ ویسے بظاہر اس نے کبھی اسماء کو کسی قسم کی شکایت کا موقع نہ دیا تھا۔ نہ چڑچڑا پن کرتا نہ ذرا ذرا سا عذر دے کر اس میں عیب جوئی کرتا اور نہ گھر کے معمول میں فرق آنے دیتا۔ کوئی بات نہ تھی۔

پھر بھی جیسے اسماء کی زندگی بے سکون ہو گئی تھی۔ تاہم اُس نے اپنے دل کو خوب تسلّی دے لی۔ اور سوچ لیا کہ اس نے بروقت شہلا کو گھر سے نکال کر بڑی عقلمندی کا ثبوت دیا ہے۔ جوان لڑکی ہر دم ارد گرد منڈلاتی ہے تو مرد کو خود پر قابو پانا مشکل ہو جاتا ہے۔

کچھ دن اور گزریں گے تو علی احمد خُود بخود ٹھیک ہو جائے گا۔

وہ پھر اپنے منّے میں مگن ہو گئی۔

جس سے دَور چلی گئی تھی۔

اس طرح تین مہینے گزر گئے۔

رُت بدل رہی تھی۔ اور اب مُنّا پاؤں پاؤں چلنے لگا تھا۔ وہ بھی کچھ نئے کام کرنے کے بارے میں سوچ رہی تھی۔ کہ ایک دن خالہ بلقیس آگئیں۔

خالہ بلقیس اسماء کی دُور پار کی خالہ تھیں۔ اسماء کا اخلاق چونکہ بہت اچھا تھا۔ اس لئے سب رشتے دار اس سے ملنے آتے تھے۔ کبھی کبھار خالہ بھی آجاتی تھیں۔ بلقیس خالہ بہت ہی نیک خُو اور تہجد گزار تھیں۔ ان کی اپنی کوئی اولاد نہیں تھی۔ خاندان کے یتیموں یسیروں پر ہی ہمیشہ دستِ شفقت رکھتی رہی تھیں۔ ان کے مُنہ سے کسی نے کوئی نامناسب بات نہ سُنی تھی۔ کسی کی دلآزاری نہ کرتیں۔ جھوٹ نہ بولتیں۔ بہتان نہ باندھتیں اِس لئے سب ہی ان کی عزّت کرتے تھے۔ انہیں دیکھ کر اسماء احتراماً کھڑی ہوئی۔ واقعی اب کے وہ بہت دِنوں بعد آئی تھیں۔

"خالہ آپ کو دیکھے ہوئے صدیاں گزر گئیں"۔

اسماء نے ان کے سینے سے لگتے ہی کہا۔

"اور تو کون سا میری خبر لیتی ہے۔ آؤں تو میں ہی آؤں ـــ نہ آؤں تو کوئی پوچھتا بھی نہیں۔"

"ایسی بات نہیں خالہ۔ پچھلا ایک سال بس بیماری اور پریشانی میں ہی گزرا۔ اب ذرا منّا سنبھلنے لگا ہے تو مجھے کوئی سُدھ آئی ہے۔"

"خیر سے کہاں ہے چاند میرا ـــ اللہ نے تجھے مَن کی مراد دی ـــ دیکھا میں نہ کہتی تھی۔"

اور واقعی صرف بلقیس خالہ تھیں کہ جب بھی اسماء کو ملتیں ایک بیٹے کی نوید دیتیں جس کا اسماء کو کبھی یقین نہ آتا۔

وہ دَدڑ کر اندر گئی اور منّے کو اُٹھا لائی۔

"ماشاء اللہ کافی پیارا ہے ـــ سارا باپ پہ ہے میرے خیال میں تو ـــ ہے نا۔؟"

"جی ہاں ـــ اسماء نے ہنس کر کہا۔ لڑکے کو باپ پہ ہی ہونا چاہیئے۔"

"بچیاں کہاں ہیں ـــ" خالہ بولیں۔

"اندر بیٹھی سکول کا کام کر رہی ہیں۔"

"ارے، گھر میں سناٹا ہے۔ علی احمد کہاں ہے؟"

"وہ تو ابھی دفتر سے نہیں آتے ـــ"

"کیا آجکل دیر سے آتا ہے؟"

"نہیں کوئی خاص دیر بھی نہیں ہوتی۔ بس آ ہی جاتے ہیں۔"

"تیری صحت مجھے کچھ ٹھیک نہیں لگتی۔" کہاں خالہ اتنی موٹی تو ہو رہی ہوں۔"

"اری موٹاپا اگر صحت کی نشانی ہوتا ـــ تو ساری دنیا کے موٹے حسرت کی تصویر نہ ہوتے ـــ رنگت وہ پہلی سی نہیں رہی ـــ آنکھوں کے گرد حلقے پڑ گئے ہیں۔ کیا بات ہے ـــ؟"

بس آرام کرنے کا وقت نہیں ملتا ـــ آپ ذرا بیٹھیں میں منّے کو اندر لٹا آؤں

پھر اطمینان سے باتیں کریں گے۔"

واپسی پہ اسماء چائے کی ٹرے اُٹھائے اندر آئی۔

باتوں باتوں میں خالہ نے پوچھا۔

"سُنا تھا شہلا تمہارے پاس رہتی تھی۔ پھر تم نے کیوں بھیج دیا؟"

"بس خالہ! زمانہ کچھ ٹھیک نہیں۔ میں نے سوچا کسی کی جوان اولاد کو سنبھالنا مشکل کام ہوتا ہے ـــ اس لئے اسے بھیج دیا۔ ویسے بھی میں ٹھیک ہو گئی ہوں۔ آخر تو گھر مجھے ہی سنبھالنا تھا۔"

"ہاں ٹھیک ہے۔"

"کیوں آپ نے کیوں پوچھا ہے؟"

"ویسے ہی ـــ" پھر خالہ چائے پینے لگیں۔

اسماء نے محسوس کیا کہ خالہ کچھ کہنا چاہتی ہیں، مگر کہتے ہوئے جھجکتی ہیں۔ اس کا دِل دھڑکنے لگا۔ کہ جانے اب خالہ کیا کہیں گی ـــ؟ لیکن خالہ نے کچھ نہیں کہا تھوڑی دیر بیٹھی رہیں۔ پھر بولیں۔ "میں جا رہی ہوں۔"

"بیٹھئے نا! ابھی علی احمد آئیں گے تو ہم دونوں آپ کو چھوڑ آئیں گے۔"

"نہیں بیٹی میں تم لوگوں کو تکلیف نہیں دینا چاہتی۔"

لیکن وہ بیٹھ گئیں اور بولیں۔

"اے شہلا کے ہاں تو روز جاتی ہو۔ کبھی میرے ہاں بھی آجاؤ۔"

خالہ بلقیس کا گھر شہلا کے گھر کے بالکل نزدیک تھا۔

"نہیں خالہ ـــ" اسماء نے معذرت کرتے ہوئے کہا ـــ "میں تو کبھی شہلا کے ہاں نہیں گئی۔ حالانکہ میں نے اس سے وعدہ کیا تھا کہ اس کی ماں کا شکریہ ادا کرنے ضرور آؤں گی مگر ـــ فی الحال تو میرا دِل نہیں چاہتا جانے کو ـــ"

"اے بی ـــ جھوٹ مت بولو ـــ بیسیوں مرتبہ تو میں نے تمہاری موٹر گلی کے نکڑ پر کھڑی دیکھی ہے۔ ابھی کل میں گھر سے نکل رہی تھی تو علی احمد موٹر سے نکل

کر ان کے گھر کے اندر جا رہا تھا۔ میں پھر واپس گھر چلی گئی ـــــ میرا خیال تھا تم دونوں تھوڑی دیر بعد میرے گھر آؤ گے ـــــ مگر انتظار کرتے کرتے آنکھیں تھک گئیں۔ شام کو نوکر بھجوا کر پتہ کرایا تو تمہاری موٹر جا چکی تھی۔"

اسماء پھٹی پھٹی آنکھوں سے خالہ کی آنکھوں میں دیکھتی رہ گئی، حیرت اور صدمے کے مارے اس سے بالکل نہ بولا گیا ـــــ اس کی حالت سے خالہ گھبرا گئیں اور بولیں:

"اے دُلہن تجھے کیا ہوتا جا رہا ہے۔ کچھ تو بول ـــــ"

مگر اسماء کیا بولتی ـــــ اس کے ذہن میں تو الاؤ سُلگ رہے تھے۔

"اسماء ـــــ بیٹی اسماء ـــــ"

جب خالہ نے اُسے بُلایا تو ہوش آیا ـــــ چونک کر خالہ کو دیکھا۔ پھر نہ جانے اپنی بے بسی پر کیوں اس کا دِل بھر آیا ـــــ خالہ کے کندھے سے لگ گئی اور بلک بلک کر رونے لگی ـــــ

خالہ کی زمانہ بین نگاہیں جانتی تھیں کہ کیا ہُوا ہے۔

مگر وہ آہستہ آہستہ اُس کے کندھے تھپکتی رہیں۔

جب اسماء اچھی طرح رو چکی تو خود ہی اپنا سر اٹھا لیا۔ اپنا مُنہ صاف کیا اور خالہ کو اوّل سے لے کر آخر تک ساری بات بتا دی۔

خالہ نے کہا۔ "اندازہ تو مجھے کچھ ایسا ہی ہو گیا تھا۔ مگر میں تمہارے مُنہ سے سننا چاہتی تھی۔ تم جانتی ہو۔ میں دُنیا داری سے بہت دُور رہوں۔ پھر دوسروں کے بکھیڑوں میں پڑنے کی اجازت میری صحت بھی نہیں دیتی ـــــ مگر میں تمہارا گھر اجڑتا نہیں دیکھ سکتی تھی۔ آج اونگھ سونگھ لینے چلی آئی ـــــ کہ اس کو کھ جلی کو خبر بھی ہے یا نہیں۔ بیٹی! اِن لوگوں نے تو بڑی رذالت کا ثبوت دیا ہے۔ مگر اب تمہیں بڑی عقلمندی سے ہر قدم اٹھانا پڑے گا۔

"خالہ میں کیا کروں ـــــ میں نے تو اس بات پر پردہ ڈال لیا تھا۔ علی احمد کو بھی کچھ نہیں کہا تھا کہ مرد ہے کہیں بدک نہ جائے، سینے پر پتھر کی سِل

رکھ لی تھی ـــــ اب کیا کروں کدھر جاؤں۔ آپ ہی بتائیے۔" اسماء نے روتے ہوئے کہا ـــــ

"رو نہیں میری بچی! کوئی تدبیر نکالتے ہیں۔ علی احمد کو ان کے چنگل سے چھڑانے کی ـــــ مرد اگر بھٹک جائے تو اسے راہِ راست پر لانا بڑا مشکل ہو جاتا ہے۔"

"یہ تو میں جانتی ہوں خالہ ـــــ"

"میں ہی کوئی تدبیر کرتی ہوں تم ابھی چُپ رہنا۔"

خالہ نے اسماء کو بہت تسلیاں دیں اور پھر رخصت ہو گئیں۔ لیکن اماں کے جانے کے بعد اسماء کو بھلا کیسے چین آ سکتا تھا۔ کبھی تو علی احمد پر بے شمار غصہ آتا۔ کس قدر کمینہ ہوتا ہے یہ مرد ـــــ ایک معمولی سی چھوکری کے لئے آنکھیں پھیر لیتا ہے ـــــ اس کا دِل چاہتا علی احمد سامنے آتے تو اس کے بال نوچ لے ـــــ تھپڑوں سے مُنہ لال کر دے ـــــ اور ایسا انتقام لے ـــــ ایسا انتقام لے ـــــ کہ ساری عمر یاد رکھے۔

اور کبھی اسے شہلا اور اس کی ماں پر غصہ آتا ـــــ کمینے اور نمک حرام لوگ ـــــ ساری زندگی وہ ان کی غریبی پر ترس کھاتی رہی اور آخر وہ اسی کا گھر لوٹنے پر تیار ہو گئے چلو مانا کہ شہلا ناسمجھ ہے۔ مگر اس کی ماں تو زمانہ دیکھے ہوئے ہے۔ کیا اُسے اپنی لڑکی کے لئے اس شہر میں اور کوئی نہ ملا تھا ـــــ اس کا دِل چاہتا ـــــ ابھی اُٹھ کر ان کے گھر چل پڑے اور دونوں ماں بیٹیوں کی چُٹیا پکڑ کر گھسیٹ لائے ـــــ ان کے مُنہ پر تھوک دے ـــــ اور ساری دُنیا کو بتا دے کہ احسان فراموش لوگ ایسے ہوتے ہیں۔

لیکن وہ کچھ بھی نہ کر سکتی تھی ـــــ خالہ نے کہا تھا اسے بالکل خاموش رہنا چاہیئے ـــــ

خاموش رہنے سے کلیجہ جلتا تھا ـــــ

شام کو جب علی احمد گھر آیا ـــــ تو اُسے دیکھتے ہی اس کے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ تو یہ ہے مرد کا بہروپ!

یُوں چلا آتا ہے جیسے دنیا کا معصوم ترین آدمی ہو۔

اور مجھے اتنا احمق سمجھ رکھا ہے ـــــ یا بنا رکھا ہے۔

اسماء کا اس سے بولنے کو جی نہیں چاہا۔ لیکن اسے کونسی پرواہ تھی۔ اسماء نے جان بوجھ کر بات نہیں کی تو اس نے بھی کوئی توجہ نہ دی۔ حسبِ معمول کھانے کے بعد کتاب لے کر لیٹ گیا۔

اسماء بھی کتاب پڑھتی رہی۔ کئی بار اس کا دل چاہا وہ اسے بلائے ـــــ مگر غصہ جی میں اِتنا تھا کہ بلاتے ہوئے ڈرتی تھی۔ کہیں کوئی بات غلط نہ کہہ دے۔

اِسی طرح صبح ہوئی ـــــ اور بھی دو۔ چار دن گذر گئے۔

تب اسماء نے محسوس کیا کہ وہ غلطی پر تھی۔ جو سمجھ رہی تھی کہ حالات معمول پر آگئے ہیں۔

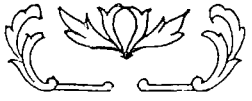

حالات معمول پر نہیں آئے تھے۔ علی احمد اب پہلے والا علی احمد ہی نہ تھا۔ بالکل بدلا ہوا ایک شخص تھا ـــــ اور اس کی تبدیلیاں اب اسماء کے مشاہدے میں آرہی تھیں۔ صبح کو خوب اچھی طرح بن ٹھن کے جاتا ـــــ جیسے کہ بروکھوے کے لئے جارہا ہو۔ خوب خوشبوئیں چھڑکتا۔ گھر سے نکلنے کی اسے جلدی ہوتی۔ ناشتے پر جھگڑا اس لئے نہ کرتا کہ دیر ہوجائے گی۔ اور شام کو بھی جلدی سو جاتا ـــــ پہلے تو بچیوں سے گپ شپ لگاتا تھا اب اسے پرواہ نہ تھی۔ جلدی سے بتی بجھائی اور بستر میں گھس گیا۔ اسماء سے رسمی بات ہوتی تھی اور ہر بات کا اتنا مختصر جواب دیتا۔ جیسے زیادہ بولنے سے بات بڑھنے کا اندیشہ ہو۔ کم گو تو وہ ہمیشہ سے تھا۔ مگر ایسا بھی نہیں کہ اسماء سے بات نہ کرے۔ میاں بیوی میں جتنی گفت و شنید ضروری تھی۔ وہ دونوں کر لیتے تھے۔ کئی دفعہ الجھ بھی پڑتے تھے ـــــ اونچا بھی بولتے تھے ـــــ مگر زیادہ تر سکون میں گزر رہی تھی ـــــ

اسماء کو اس سے پہلے بھی یہ شکوہ تھا کہ وہ کھل کر بات نہیں کرتا ـــــ دل کی بات نہیں کہتا۔

مگر اب تو کہنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ اسماء نے دو تین مرتبہ بچیوں کو سکھایا کہ رات کو ابو کے کمرے میں جا کر ہنسی مذاق کیا کرو۔ مگر علی احمد نے بچیوں کو

ہر بار یہ کہہ کر اپنے کمرے میں بھیج دیا۔

"آجکل دفتر میں کام زیادہ ہوتا ہے۔ مَیں تھک جاتا ہوں۔ اس لئے جا کر آرام کرو۔ اور

مجھے سونے دو ——!"

اسماء اندر ہی اندر جل رہی تھی۔ یہ خاموشی جو اُس نے مصلحتاً اختیار کر رکھی تھی ایک بڑا فاصلہ بنتی جا رہی تھی اور اس فاصلے سے اسے ڈر لگ رہا تھا —— فاصلے بہت جلد پیدا ہو جاتے ہیں۔

جس قدر بھی دُور لے جاؤ ——

لیکن اُن کا سمٹنا ایک کٹھن مرحلہ ہے ——

وقت لَوٹ کر نہیں آتا۔

تو بھلا فاصلے کس طرح سمٹ سکتے ہیں۔ بیٹھے بیٹھے اس کا دِل ہُول اٹھتا۔ گھر کھانے کو دوڑتا۔ بچے اچھے نہ لگتے تھے —— دنیا سے جی اُچاٹ ہو جاتا —— مگر وہ کیا کرے۔ سوچ سوچ کر تھک گئی تھی۔

خالہ بلقیس کے انتظار میں لب سیئے بیٹھی تھی۔

اس دن جو اس نے خالہ بلقیس کو دیکھا —— تو اسے وہ ایسا مسیحا معلوم ہوئیں جو پہلے نشتر لے کر جسم کو چاک کرتا ہے اور پھر زندگی کی نوید دیتا ہے۔ بہرحال اس کُلھاڑے سے تو اسے گزرنا ہی تھا —— خالہ نے جو کچھ بتایا —— وہ اس کے حوصلے پست کرنے کو کافی تھا۔

یعنی —— علی احمد اکثر اُن کے گھر میں پایا جاتا ہے۔ دفتر کے اوقات میں بھی اُٹھ کر وہاں چلا جاتا ہے۔ دوپہر کا کھانا وہاں کھاتا ہے —— اُن کے گھر کا نقشہ بدل گیا ہے —— پھلوں کے ٹوکرے —— سبزیاں —— گوشت —— کہاں تو شہلا کے بہن بھائی فاقے کرتے تھے۔ آجکل ان کے ہاں روز مرغیاں پکتی ہیں۔ بستروں پر نئی چاندنیاں بچھی رہتی ہیں۔ شہلا روز ایک جوڑا بدلتی ہے۔ اس کا جوبن

دیکھا نہیں جاتا —— ماں اس کے نخرے یوں اٹھاتی ہے —— جیسے نائکہ اپنی بیٹی کو پہلی مرتبہ کوٹھے پر بٹھا کر چراغاں کرتی ہے —— کئی بار سارا گھرانہ علی احمد کے ساتھ فلمیں بھی دیکھ چکا ہے ——

توبہ ہے —— اللہ معاف کرے —— علی احمد اُن کے گھر میں اس طرح رہتا ہے۔ جیسے گھر جوائی رہتے ہیں۔ محلے والے تو اور بھی بہت کچھ کہتے ہیں —— توبہ میری —— اندر وہ کنڈی بند کر کے بیٹھے رہتے ہیں۔ اور باہر حرافہ ماں پکوان تل تل کے اندر بھیجتی رہتی ہے ——!

"تو اس کا مطلب ہے۔ پانی سر سے اُونچا ہو چکا ہے"۔

"ہاں بیٹی"۔

"تو اب کیا کریں خالہ ——" اسماء پھر رونے لگی۔ میری تو وہ صورت سے بیزار ہے بات کرنے کا روادار نہیں۔ بچوں سے اُسے کوئی دلچسپی نہیں رہی۔ ایسے میں دو ٹوک بات کروں گی، تو وہ دامن چھڑا لے گا"۔

"ہاں مجھے بھی ڈر ہے۔ اس وقت بہت عقل مندی دکھانے کی ضرورت ہے"۔

"مگر خالہ ایسا نہ ہو ہم مصلحت کو دیکھتے رہ جائیں۔ ادھر معاملہ ہمارے ہاتھ سے نکل جائے۔ کیونکہ شادی شدہ مرد پھنستا بھی جلدی ہے اور اپنا ہر معاملہ بھی جلدی طے کر لیتا ہے"۔

"دیکھو بیٹی! اب میں شہلا سے دو ٹوک بات کروں گی اسے غیرت دلاؤں گی۔ اور خدا کا واسطہ بھی دوں گی۔ اگر ان میں ذرا بھی انسانیت ہوئی —— تو وہ راستے سے ہٹ جائیں گے۔ ورنہ تم علی احمد سے دو ٹوک بات کرنا"۔

"اچھا خالہ"

لیکن خالہ کے جانے کے بعد اسماء کو چین کہاں، یوں معلوم دے رہا تھا۔ انگاروں پر لوٹ رہی ہو —— آج تو اس کا ضبط جواب دے گیا تھا —— آج نہ جانے وہ غصے میں علی احمد کو کیا کہہ دے گی —— اسے خود بھی اندازہ نہ تھا —— اندر ہی اندر کھول

رہی تھی ـــــ اُبل رہی تھی ـــــ اور علی احمد تھا کہ آنے کا نام ہی نہیں لے رہا تھا۔

شام کے چھ بجے ـــــ سات ـــــ آٹھ ـــــ پھر نو بج گئے۔

آج اس نے ہمیشہ سے زیادہ دیر کر دی تھی ـــــ

اُس نے طوعاً و کرہاً بچّوں کو کھانا کھلایا ـــــ انہیں سُلایا ـــــ خود اُس سے کچھ بھی کھایا نہ جا سکا۔ وہ تو اس وقت صحیح انداز میں سوچنے کے قابل بھی نہ تھی ـــــ

ٹھیک دس بجے علی احمد کی کار کا ہارن سُنائی دیا۔ پھر وہ اندر آیا ـــــ

اسمأ نے دیکھا اس کے چہرے پر شرمندگی کے کوئی آثار نہ تھے ـــــ بہت ہشاش بشاش لگ رہا تھا۔ اس کا چہرہ دیکھتے ہی اسماء اپنی تمام قسمیں اور مصلحتیں بھُول گئی۔

اور بڑے تلخ لہجے میں بولی۔

"اتنی دیر آپ کہاں رہے؟"

علی احمد نے اسماء کے چہرے سے سب کچھ پڑھ لیا تھا۔ اس لئے اپنا چہرہ بھی کھُردرا بنا لیا اور بولا "میں جہاں بھی رہوں۔ یہ میرا ذاتی معاملہ ہے تُو کون ہوتی ہو پوچھنے والی۔؟"

"مَیں آپ کی بیوی ہوں۔"

"بیوی ہو تو بیوی بن کر رہو۔ اپنے کپڑوں سے نکلنے کی کوشش مت کرو۔"

"کپڑوں سے نکلنے کی کوشش تو آپ کر رہے ہیں۔"

بکواس بند کرو میں تھکا ہوا ہوں۔" جہاں اب سے کچھ دیر پہلے تھے ان کی بکواس تو بہت اچھی لگ رہی تھی۔ علی احمد نے کوئی جواب نہیں دیا۔ کپڑے بدلنے غسل خانے میں چلا گیا۔ اسمأ کے دل کی آگ دل میں دبی رہ گئی۔ نہ تو وہ ٹھیک طرح سے غصہ نکال سکی تھی اور نہ ہی کوئی اور بات بن سکی تھی۔ تقدیر بگڑ جائے تو کوئی تیر نشانے پر نہیں بیٹھتا۔ علی احمد کپڑے بدل کر آیا۔ اور اپنے بستر پر چُپ چاپ لیٹ گیا۔ شاید غلطی ہو گئی۔ اس نے دل میں سوچا۔ غصّے کے بجائے محبت جتانا چاہیئے تھی۔ مرد کو تو غصہ دکھانے سے فائدہ پہنچتا ہے ـــــ وہ اور بھی

دور ہو جاتا ہے ـــــ اپنے لہجے کو ٹھیک بنا کر بولی۔

"آپ کھانا کھائیں گے۔"

"نہیں" اُس نے خشک لہجے میں کہا۔ "کیوں ـــــ؟"

"بس کہہ دیا کہ نہیں ـــــ"

"بھوک نہیں یا کہیں کھا لیا تھا ـــــ" "جو بھی تم سمجھ لو"

"میں تو یہ سمجھ رہی ہوں کہ آپ نے کہیں کھا لیا ہو گا۔"

"تو پھر یہی ٹھیک ہو گا ـــــ" اسماء کو پھر غصہ آ گیا ـــــ وہ جتنے پردے ڈال رہی تھی۔ اتنا ہی وہ بدک رہا تھا۔ "آجکل آپ شہلا وغیرہ کے ہاں جاتے ہیں۔"

علی احمد خاموش رہا۔ اسمأ اس کے قریب جا کر کھڑی ہو گئی ـــــ

"میں پوچھ رہی ہوں آپ شہلا کے ہاں جاتے ہیں ـــــ"

"جب تمہیں پتہ چل گیا ہے تو اب تصدیق کیوں چاہتی ہو ـــــ" "آپ وہاں کیا لینے جاتے ہیں۔"

"غریب رشتہ دار کی خبر لینا کیا گناہ ہے؟"

"اس سے پیشتر تو آپ کو کبھی غریب رشتہ داروں کی خبر لینے کا خیال نہیں آیا تھا۔"

"جب بھی آ جائے اچھا ہے۔"

"رشتے دار تو میرے ہیں۔ آپ پر فرض نہیں۔"

"جس کو بھی خیال آ جائے۔ اُسی کا فرض ہے۔"

"صاف صاف کیوں نہیں کہہ دیتے کہ اس نمک حرام حرافہ کی زُلف کے اسیر ہو گئے ہیں۔" ـــــ علی احمد خاموش رہا۔

"آپ یہ نہ سمجھیں کہ دُنیا نہیں جانتی ـــــ سب آپ کے مُنہ پر تھوک رہے ہیں۔"

علی احمد غصّے سے اُٹھ کر بیٹھ گیا۔ "میں کسی کی پرواہ نہیں کرتا ـــــ مَیں کسی سے نہیں ڈرتا"

"ہاں آنکھوں پر حرام چڑھا ہو ـــــ صحیح و غلط کی تمیز مٹ جائے تو آدمی ایسا ہی کہتا ہے۔"

"ہاں ٹھیک ہے ـــــ بالکل ٹھیک ہے۔"

"یاد رکھو میں تمہیں ایسا ہرگز نہ کرنے دوں گی۔" "تم ہوتی کون ہو؟"

"مجھے کمزور نہ سمجھو ـــــ" "ابھی چٹیا سے پکڑ کر باہر نکال دوں گا۔"

"نکال کے تو دیکھو ـــــ میں تمہارے بچوں کی ماں ہوں۔"

"بہت دیکھیں تمہاری جیسی ـــــ بچے چھین لوں گا اور تمہیں گھر سے نکال دوں گا۔"

"اچھا تو نوبت یہاں تک پہنچ چکی ہے ـــــ تو یہ بڑھاپے کا عشق ہے ـــــ ایک عشق وہ بھی تھا جو تم نے جوانی میں مجھ سے کیا تھا ـــــ" "تب تو جھک مارا تھا۔"

"جھک اب مار رہے ہو۔ اور انشاء اللہ تعالےٰ ذلیل و خوار ہو گے اور وہ تمہاری معشوقہ بھی ـــــ اس کی تو ایسی خبر لوں گی کہ تم بھی یاد کرو گے۔"

"بڑی آئی خبر لینے والی ـــــ زندگی حرام کر دی میری۔"

"دو پیسے کی چھوکری نے تمہاری زندگی حرام کی ہے۔" "ذلیل عورت خاموش ہو جا۔"

"ذلیل وہ ہوتا ہے جو گندگی میں جا گرتا ہے ـــــ تم گھٹیا ہو ـــــ کمینے ہو ـــــ ذلیل ہو ـــــ"

علی احمد غصے سے اٹھا اور اس نے ایک زناٹے دار تھپڑ اسماء کے منہ پر مار دیا ـــــ یہ تھپڑ نہیں تھا۔ بم کا گولا تھا ـــــ قیامت تھی ـــــ حشر تھا۔ بھلا اسماء نے کبھی ایسا سوچا تھا۔ تیرہ سالہ ازدواجی زندگی میں کبھی ان باتوں کی نوبت نہ آئی تھی۔

شاید علی احمد کو بھی اس کے مارنے کے بعد خیال آیا ہو کہ اُس نے غلط حرکت کی ہے لیکن اس نے ایسا کوئی تاثر نہیں دیا ـــــ گاڑی کی چابی اٹھائی ـــــ اور گھر سے باہر نکل گیا۔

سب کچھ اسماء برداشت کر سکتی تھی ـــــ بے حسی ـــــ سنگدلی، تھپڑ ـــــ گالیاں۔

مگر رات کو آدمی گھر سے باہر نکل جائے۔ یہ سب ناقابلِ برداشت تھا۔ وہ چلا چلا کر روتی ـــــ اس کا دل چاہا کہ وہ اس کے پاؤں پڑ کر اسے روک لے ـــــ لیکن پاؤں پڑنے کا مطلب تھا ـــــ کہ وہ ہار گئی ہے اور علی احمد صلح کے بہانے اپنا ہر مطالبہ منوا

سکتا ہے۔ اتنی گئی گزری وہ نہیں تھی۔

روتی رہی ـــــ چلاتی رہی ـــــ تمام رات فریاد کرتی رہی ـــــ مگر کوئی سننے والا نہ تھا۔ اسے سمجھ آ گئی کہ زندگی کا کرب انگیز ـــــ سنسان سفر شروع ہو چکا ہے ـــــ پا پیادہ چلنا ہو گا ـــــ آبلہ پائی مقدر ہو گا۔ ـــــ ٹھوکریں زادِ راہ ہوں گی اور بہر حال یہی زندگی ہو گی ـــــ

شادی کے بعد پہلی بار وہ تنہا تھی۔ اس اتنے بڑے گھر میں تنہا ـــــ ایک شوہر کے گھر نہ ہونے سے یوں لگ رہا تھا۔ جیسے چھت گر پڑی ہے ـــــ اور سایہ کہیں نہیں ـــــ اسے ڈر لگ رہا تھا ـــــ وحشت محسوس ہو رہی تھی ـــــ گھر پر ایک قبرستان کا گمان ہو رہا تھا ـــــ خاوند روٹھ کر چلا جائے تو عورت کا سر ننگا ہو جاتا ہے ـــــ در و دیوار کی بھی آنکھیں نکل آتی ہیں ـــــ کیا قیامت کی رات تھی؟

مگر رات آخر گزر گئی۔ صبح کو کون اس کی سوجی ہوئی آنکھیں۔ دیکھ کر اس کی رات کی کہانی پوچھتا ـــــ ویران راتوں میں سلگنے والی شمع اور شمع محفل میں بہت فرق ہوتا ہے۔ ڈھلتی عمر کی عورت بے روشنی کی شمع ہوتی ہے ـــــ

اس کو جل ہی جانا چاہیئے۔

دوسرے دن خالہ بلقیس آ گئیں ـــــ اسماء نے رات کی لڑائی کی داستان سنائی ـــــ انہوں نے کہا

اس طرح لڑ کر اسماء نے اچھا نہیں کیا۔ جب وہ خود ہی گھر سے بھاگ جانے کا بہانہ ڈھونڈ رہا تھا تو اسے یہ موقع نہیں دینا چاہیئے تھا۔" پھر مجھے بتائیں خالہ میں کس طرح رہوں کس طرح جیوں؟"

"اب تو یوں ہے بیٹی ـــــ" خالہ نے بردباری سے کہا۔ "بدترین حالات کے لئے اپنے آپ کو تیار کر لو۔"

"کیوں خالہ؟"

"ہاں میں شمیم کے گھر گئی تھی ـــــ آجکل اس کے غرور کا ٹھکانہ نہیں ـــــ جیسے اس

کے گھر میں لکشمی اُتر آئی ہو ـــــ پہلے تو سیدھے منہ بولی نہیں ـــــ پھر جب میں نے ذرا کرخت لہجہ اختیار کیا ـــــ تو میری بات سننے پر آمادہ ہوئی ـــــ"

"آپ نے کیا کہا خالہ ـــــ؟"

"میں نے تو صاف صاف کہہ دیا کہ دیکھو بی بی ـــــ جو کچھ تم کر رہی ہو ـــــ اندھیر ہے ـــــ ظلم ہے۔ علی احمد کا اس طرح بیوی سے چھُپ چھُپ کر تمہارے ہاں آنا کسی طرح بھی جائز نہیں ـــــ" بولی

"لوگ تو جلتے ہیں۔ کسی کو کھاتا پیتا نہیں دیکھ سکتے۔ اب اگر کوئی ہمدردی کے مارے ہماری مدد کرے تو کیا ہم اُسے گھر سے نکال دیں ـــــ" مَیں نے کہا۔

"بی بی، یہ مدد نہیں ہے۔ صریحاً دھاندلی ہے ـــــ مدد اپنے گھر میں بیٹھ کر کی جاتی ہے ـــــ جو کچھ تمہارے گھر کا نقشہ ہے۔ وہ کچھ اور بتاتا ہے ـــــ" بولی:

"اب کسی کے آنے جانے پر پہرے تو نہیں بٹھا سکتی ـــــ مَیں نے کہا

"تم جانتی ہو علی احمد شادی شدہ بال بچّوں والا ہے اور پھر اسماء نے تمہارا کیا بگاڑا ہے اس نے ترس کھا کے تمہاری بیٹی کو پاس رکھا۔ تمہاری ہر موقعہ پہ مدد کی ـــــ یہ اس کا صلہ دے رہی ہو ـــــ" کہنے لگی۔

"یہ تو پسند کی بات ہے خالہ ـــــ اگر علی احمد کو شہلا پسند آئی ہے تو ہم کیا کہہ سکتے ہیں ـــــ" میں بولی:

"پسند کی بات نہیں ـــــ مرد کا کیا ہے۔ اسے تو گدھی بھی اشارہ کرے تو اس کے قریب چلا جائے گا۔ اپنی لونڈیا کی لگام کھینچو، اس شہر میں اور بھی بہت رئیس ہیں۔ انکو پھانس لے ـــــ اور اسما جیسی گرہستن کا گھر ویران نہ کرے ـــــ"

"واہ خالہ ـــــ" وہ اور بگڑنے لگی۔

"تم میری بیٹی پر الزام لگا رہی ہو ـــــ اس کا کیا قصور ہے ـــــ اگر اس میں اسما سے زیادہ خوبیاں نہ ہوتیں تو علی احمد یوں فدا ہوتا ـــــ؟ پھر دوسری شادی گناہ نہیں۔ مرد کو حق پہنچتا ہے جب چاہے دوسری شادی کر لے ـــــ

"اگر ایسا ہے تو پھر تمہاری دلاری پر بھی سوکن پڑ سکتی ہے" مَیں نے جواب دیا۔

ناک چڑھا کر بولی ـــــ "جب وقت آئے گا دیکھا جائے گا ـــــ پھر ہم بھی ایسے کچّے نہیں ہیں۔ بال بال باندھ لیں گے۔ اُس کا"

مَیں ذرا نرم پڑ گئی اور کہا

"اس وقت تو بی بی خدا کا خوف کرو۔ میں تمہاری بیٹی کے لئے کوئی اچھا سا رشتہ لا دونگی اگر سوکن پہ ہی دینی ہے تو اور بہت سے شوقین لوگ ہیں ـــــ علی احمد کا پیچھا چھوڑ دو ـــــ" ہنس کر بولی۔

"لو اور سنو ـــــ جیسے ہم نے علی احمد کو پکڑا ہُوا ہے ـــــ خالہ کیا تمہاری آنکھیں نہیں ہیں ـــــ وہ ہماری چوکھٹ نہیں چھوڑتا۔ ایسے ہی ذرا دُنیا کے دکھاوے کو اسما کے ہاں چلا جاتا ہے ـــــ" میں نے پوچھا۔

"تو پھر تم نے شہلا کی شادی اس سے کرنے کا تہیہ کر لیا ہے ـــــ" بولی۔

"مَیں کون ہوں ـــــ جب میاں بیوی راضی تو کیا کرے گا قاضی" میں نے کہا

"اسماء نے تمہارے ساتھ اتنی نیکیاں کیں۔ کیا تمہیں اس کا بھی خیال نہیں ـــــ" ہاتھ نچا کر بولی۔

"بس خالہ بس ـــــ تقدیر کے لکھے کو کون مٹا سکتا ہے ـــــ اسماء کے مقدر میں اتنی ہی خوشیاں ہوں گی۔ اور پھر وقت آئے گا تو ہم بھی اس کے احسانوں کا بدلہ چُکا دیں گے ـــــ" مجھے غصّہ آگیا ـــــ مَیں نے کہا

"شمیم بیگم مجھے معلوم نہیں تھا۔ تم اتنی گھٹیا عورت ہو ـــــ سچ کہتے ہیں۔ بیج آخر بیج ہوتا ہے۔ جب آفتاب مرحوم نے تمہارے ساتھ شادی کی تھی تو سارا خاندان اس بات پہ برہم ہو گیا تھا کہ تم نیچ خاندان سے ہو" مگر ہم نے سوچا تھا، لڑکی اچھی ہو تو خاندان سے کیا فرق پڑتا ہے ـــــ مگر آج معلوم ہو گیا کہ شریف اور رذیل میں کیا فرق ہوتا ہے؟"

اس بات پر وہ سخت برہم ہوئی ـــــ اور بولی

"جس شخص کو تم خاندان کا سب سے اعلیٰ فرد کہتی ہو اگر وہ میری بیٹی کی جوتیاں چاٹ

رہا ہے ـــــ اِنشاءاللہ تم سب کو اپنے قدموں میں جُھکا کر دِکھاؤں گی۔ گن گن کے سب سے بدلے لُوں گی ـــــ میرا جادُو سر چڑھ کر بولا کرتا ہے ـــــ وہ اور وقت تھا جب تم سب مجھے دھتکارا کرتی تھیں۔"

مَیں نے برقعہ اُٹھا لیا اور بولی۔

"ہر فرعون کے لئے خُدا تعالیٰ نے موسیٰ پیدا کیا ہے۔ انشاءاللہ تم کبھی اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہو سکو گی۔" پھر کہہ بولی

"چل مکّار بُڑھیا ـــــ آئی چاپلوسی کرنے ـــــ پھر اس گھر میں قدم رکھا تو یہ لرزتی ہوئی ٹانگیں توڑ دوں گی ـــــ" بیٹی مَیں تو روتی ہوئی گھر سے نکل آئی

"اب کیا ہوگا۔ خالہ جی ـــــ"

بس بیٹی مجھے تو خود کسی کل چین نہیں کہ اب کیا ہوگا ـــــ اس حرافہ نے دُور تک پنجے گاڑ رکھے ہیں۔ عورت جب کمینگی پر اُتر آئے تو کوئی اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ اب تو بہت سوچ سمجھ کر قدم اٹھانا ہوگا۔ اور میرے خیال میں تو اس وقت سختی کرنا کچھ مناسب نہیں اگر کسی بزرگ کو درمیان میں لے آؤ تو اچھا ہوگا۔"

"کس کو لاؤں خالہ جی ـــــ" اسما رونے لگی۔ میرے والدین تو جب میں چھوٹی تھی فوت ہو گئے تھے، ایک بھائی تھا۔ اسی نے پالا پوسا ـــــ اب وہ پردیس چلا گیا ہے۔ دُور کے عزیزوں کو بلاؤں؟ انہیں مجھ سے کیا ہمدردی ہوگی اور میرا تماشا زیادہ دیکھنا چاہیں گے۔ اور پھر کہانیاں نکل کر گھر گھر پھیلیں گی ـــــ"

"علی احمد کے بزرگوں میں سے کسی کو بلاؤ۔"

"ایک والد سے ذرا دبتے تھے، وہ بھی پچھلے سال اللہ کو پیارے ہو گئے ـــــ باقی کسی سے نہیں دبتے ـــــ بلکہ وہی ان سے دبتے ہیں۔"

ایسا کرو ـــــ خالہ نے کہا بالکل نرم پڑ جاؤ۔ قدموں سے لپٹ جاؤ۔ خدا کا واسطہ دو ـــــ بچّوں کا واسطہ دو ـــــ اس کی سب خطائیں معاف کر دو ـــــ"

خالہ جی سمجھاتی رہیں اور اسما مسلسل روتی رہی اور اپنا دامن بھگوتی رہی۔

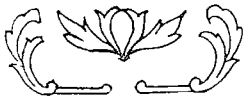

تقدیر یوں بھی وار کرتی ہے۔ اسے اندازہ نہ تھا ـــــ کل تک وہ بیاہتا عورت تھی اس کا غرور اس کا شوہر تھا ـــــ شوہر ہی کے دم سے گھر ہوتا ہے ـــــ شوہر کے دم سے اولاد ہوتی ہے ـــــ شوہر ہی کے دم سے یہ دنیا ہوتی ہے۔ شوہر تخت و تاج ہوتا ہے ـــــ شوہر ایک مکمل راجدھانی ہے ـــــ سلطنت ہے ـــــ وقار ہے۔ عزت ہے۔ آبرو ہے ـــــ اور زندگی کی سب سے سچّی خوشی ہے ـــــ شوہر اپنا نہ ہو تو پھر کیا رہ جاتا ہے ـــــ گھر ویرانہ نظر آتا ہے ـــــ بچّے بوجھ بن جاتے ہیں۔ دنیا ایک تماشا گاہ لگتی ہے ـــــ جہاں ہر کوئی ایک نیا چولا پہنے نظر آتا ہے ـــــ پھر کیا رہ جاتا ہے زندگی میں باقی۔ اس ایک خوشی کے لئے اپنی انا ـــــ اپنی خودی ـــــ اپنا پندار سب داؤ پر لگانا پڑتا ہے ـــــ

پگلی تو ہار گئی ـــــ اب اس کمبخت انا کو بچا کر کیا کرنا ـــــ؟ اس کے قدموں میں گر جا ـــــ کیا قدموں میں گرنے کے بعد محبت کی جا سکے گی ـــــ؟

محبت جائے بھاڑ میں ـــــ گھر تو بچ جائے گا ـــــ آن تو رہ جائے گی۔ بچّوں کا مستقبل تو محفوظ ہو جائے گا ـــــ اور تو جگ ہنسائی سے بچ جائے گی۔ ہاں ٹھیک ہے! ـــــ

ایک بار اپنا آپ مجروح کرنا ہوگا اور ضرور کرنا ہوگا۔ دوسرے دن دفتر ختم ہونے

کے بعد علی احمد خود ہی گھر آ گیا۔ شاید اسے اپنی زیادتی کا خیال آ گیا تھا ــــ یا وہ دنیا سے ڈرتا تھا مگر پہلے کی طرح اس نے اپنی زیادتی کی معافی نہیں مانگی۔ نہ صبح کی طرف ہاتھ بڑھایا چپ چاپ کھانا کھا کر لیٹ گیا۔

اسماء نے بہت کوشش کی۔ اُٹھ کر اسے بُلائے۔ مگر بلا یا نہ جا سکا ایسا لگتا تھا۔ اس کا دِل چُور چُور ہو گیا ہے۔ اور اس چُور چُور دل سے نہ وہ ایک قدم چل سکتی ہے نہ ایک لفظ بول سکتی ہے ــــ

دِل میں کوئی امنگ ہو تو آدمی بات بھی کرے ــــ

تھوڑی دیر بعد علی احمد کے خراٹے سنائی دینے لگے ــــ اور وہ بھی روتے روتے جانے کب سو گئی ــــ سارا دن وہ اپنے آپ کو ملامت کرتی رہی۔ اور اس بات کے لئے تیار کرتی رہی کہ وہ علی احمد کو منا لے گی ــــ رات کو پھر جب علی احمد بستر پر لیٹ گیا ــــ تو وہ اپنے دِل پر جبر کر کے اٹھی ــــ اور جا کر اس کے بستر پر بیٹھ گئی۔ علی احمد نے چونک کر اس کو دیکھا اور پھر منہ پھیر لیا۔ "علی اب تم مجھ سے بات کرنا بھی گوارا نہیں کرتے" اس نے بڑے پیار سے کہا۔ "کہو کیا بات ہے"۔ اس کا لہجہ سپاٹ تھا ــــ

"تم مجھ سے خفا کیوں رہتے ہو؟" "یہ تم اپنے دل سے پوچھو"۔

"میرے دل کے پاس اس کا جواب ہوتا تو آج بے غیرتوں کی طرح تمہیں کیوں پوچھ رہی ہوتی"۔

"جا دَاب سو جاؤ مجھے تنگ نہ کرو"۔ اس نے کروٹ بدل کر کہا۔

"اس سے پہلے تو تم نے مجھے ایسا کبھی نہیں کہا تھا"۔ "اس سے پہلے کی اور بات تھی" ــــ "اب کیا بات ہو گئی"۔ "تم ایک تنگ نظر اور حاسد عورت ہو"۔

"اپنی جائیداد چھنتی دیکھ کر شور مچانا حاسد ہونا نہیں ہوتا"۔

"یہی تو تم عورتوں کی غلطی ہے کہ مرد کو اپنی جائیداد سمجھ لیتی ہو"۔

"تو پھر ہماری جائیداد کیا ہے"۔ "بچے ــ گھر ــ روٹی، کپڑا ــ زیور ــ آسائش"

"یہ جھوٹ ہے علی ــــ یہ جھوٹ ہے ــــ" "تو پھر بکواس نہ کرو یہاں سے اُٹھ

جاؤ ــــ"

"اسماء کا دِل چاہا ــــ کہ وہ علی کا منہ نوچ لے۔ مگر ضبط کر گئی اور بولی۔

"آخر تم کیا چاہتے ہو"۔

"اگر تم صاف صاف سُننا چاہتی ہو تو سُن لو میں شہلا سے شادی کرنا چاہتا ہوں"۔

"آخر کیوں ــــ؟ کونسا سُکھ ہے جو تمہیں اس گھر سے نہیں مِل رہا ہے ــــ شادی کرنے کی وجہ تو معلوم ہو ــــ" "بس ــــ وہ رُک گیا ــــ پھر بولا ــــ "تم اب بچوں کی ماں بن گئی ہو۔ میرا ساتھ نہیں دے سکتیں"۔ یہ تو صرف تمہارا خیال ہے۔ میں بچوں کو ہوسٹل میں بھجوا دوں گی ــــ مگر جس عورت سے تم شادی کرو گے بچے تو اس کے بھی ہوں گے"۔

"تم میں اب کوئی دلکشی نہیں رہی"۔ "وقت کے ساتھ ہر عورت کی دلکشی ختم ہو جاتی ہے" پھر خود ہی بولی۔ "علی میں نے تمہیں زندگی کا ہر سکھ دے رکھا ہے۔ تمہارے ننھے مُنے پیارے پیارے بچے ہیں۔ گھر میں کیا نہیں۔ ہماری یا اپنی زندگی جہنم نہ بناؤ۔ مَیں تمہاری ساری خطائیں مُعاف کر دوں گی۔ اور بھُول جاؤں گی کہ تم کبھی راہ سے بھٹک گئے تھے"۔

"اچھا اب زیادہ بک بک نہ کرو علی احمد کو غصہ آ گیا ــــ "بڑی آئی معاف کرنے والی اور کون سی خطا میں نے کی ہے ــــ مجھے اپنی مرضی کے مطابق زندہ رہنے کا حق ہے"۔

"اُٹھ جاؤ یہاں سے ــــ" علی احمد نے اتنے غصّے سے کہا کہ اسماء فوراً اٹھ گئی شاید اُس کے مُنہ سے کوئی غلط بات نکل گئی تھی۔ ورنہ اسے تو ایسے محسوس ہو رہا تھا۔ جیسے اس کی باتیں آج اثر کر رہی ہیں ــــ خیر ــــ

اس نے سوچا وہ کوشش جاری رکھے گی ــــ صبح اسماء کو علی احمد کا رویہ ــــ کچھ ذرا سا بدلا ہوا سا محسوس ہوا۔ یہ نہیں کہ اس کے ساتھ ہنس ہنس کر باتیں کر رہا تھا ــــ مگر ایسی کوئی بات تھی کہ وہ کچھ پہلے والا علی احمد لگ رہا تھا ــــ اس لئے اسماء کو تسلی ہو گئی ــــ مرد کی اچھی یا بُری تبدیلی صرف بیوی ہی محسوس کر سکتی ہے ــــ

دوسرے دن وہ ٹھیک وقت پر دفتر سے آ گیا ــــ بچوں سے بھی کھیلتا

کو روز اسما چپ چاپ اس کے پاس جا بیٹھتی اور بغیر وجہ کے اس کے ساتھ گفتگو کرتی رہتی ـــــ گویا اسے منانے کے سارے جتن کرتی ـــــ

ایک ہفتے بعد ـــــ علی احمد پھر رات کو دیر سے آیا، مگر اسما نے سوچ لیا تھا لڑائی نہیں کرے گی ـــــ آج قدموں میں گر جائے گی۔ اس لئے چپ چاپ اس کے کپڑے بدلنے کا انتظار کرتی رہی جب وہ کپڑے بدل چکا ـــــ تو ـــــ اپنے بستر آ کر بیٹھ گیا۔ پھر خود ہی بولا۔

"میں تم سے ایک ضروری بات کہنا چاہتا ہوں"۔ اسما نے اس کی طرف دیکھا۔

"بات بے حد اہم ہے۔ اب اگر تم عورت ہونے کے ناطے خواہ مخواہ واویلا کرو تو تمہاری بے وقوفی ہے"۔

"جی بتایئے"۔ اسما نے اطاعت شعاری سے کہا۔ "بات یہ ہے کہ میں نے شہلا سے شادی کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے ـــــ اور اب شادی جلدی کرنا پڑ گئی ہے ـــــ یعنی بہت جلدی آج کل میں ـــــ"

اسما چپ رہی ـــــ "سچی بات تو یہ ہے کہ پچھلے دو چار دنوں سے میں بالکل اس کے بارے نہیں سوچ رہا تھا۔ مگر اب حالات کسی اور موڑ پہ آ گئے ہیں۔ یہ ٹھیک ہے کہ لغزش میری تھی ـــــ مگر ہو چکی ہے ـــــ یعنی شہلا میرے بچے کی ماں بننے والی ہے"۔

"جی ـــــ؟" اسما نے حیران ہو کر پوچھا۔ "ہاں ـــــ اور میں اب اسے بدنامی سے بچانا چاہتا ہوں ـــــ مرد سے ایسی غلطی ہو سکتی ہے۔ اور مرد کو ہی اس کی تلافی بھی کرنی چاہیئے ـــــ"

اسما سوچ میں پڑ گئی کہ کیا کہے ـــــ خدا معلوم یہ شہلا کی ماں کا چکر تھا یا واقعی علی احمد دیوانہ ہو گیا تھا۔

مگر اب اس کی نفی یا مذمت کرنے کا وقت نہیں تھا۔ اس لئے اسما بڑے سکون سے بولی۔

"اس قسم کے گناہ میں دونوں فریق برابر شامل ہوتے ہیں۔ میں سارا قصور آپ کا نہیں

کہتی ـــــ چلو جو ہوا سو ہوا ـــــ مگر اس کی تلافی کے کئی اور طریقے ہیں"۔ "مثلاً"، "مثلاً یہ کہ ان کو بھاری رقم دے کر اُن کا مُنہ بند کر دو۔ شہلا کی ماں لالچی عورت ہے بیس پچیس ہزار لے کر سب بھول جائے گی ـــــ"، کیا تمہارا خیال ہے کہ پیسوں سے کسی کی زندگی خریدی جا سکتی ہے۔ اس کی زندگی اور عزت پیسوں سے زیادہ قیمتی ہے"۔

"جانِ من اسما، نے کہا۔" جو لڑکیاں شادی سے پہلے اپنی عزت کا سودا کر لیتی ہیں۔ انہیں بھلا اپنی عزت کا کیا پاس ہوتا ہے سوچو تو ـــــ ایک ایسی لڑکی سے تم شادی کر رہے ہو جس پر تمہیں کبھی بھروسا نہ ہو گا۔ شادی سے پہلے اگر مرد عورت کا جسم حاصل کر لے تو پھر تمام زندگی کبھی اسے اعتماد کے قابل نہیں سمجھتا ـــــ اور دونوں کی زندگی جہنم بن جاتی ہے"۔

"میں ان مردوں میں سے نہیں ہوں۔ میں جانتا ہوں۔ شہلا معصوم تھی"۔

"میں تو کہتی ہوں تمہارا بھی کوئی دوش نہیں تھا اگر عورت حد کو نہ توڑے تو مرد ایک قدم بھی آگے نہیں بڑھتا۔ اسما نے اور طرح پینترا بدلا۔" تم کسی طرح مصالحت کی کوشش کرو۔ میں تمہارا ہر طرح ساتھ دوں گی۔ شہلا کی ماں کے قدموں پر اپنا سر رکھ دوں گی۔ اچھا سا لڑکا ڈھونڈ کر اس کی شادی کرا دوں گی"۔

"اب ان باتوں کا وقت نکل چکا ہے"۔ علی احمد نے جھلا کر کہا۔" مجھے عدالت میں گھسیٹنے کی دھمکیاں دے رہے ہیں اور میں ان سے شادی کا وعدہ کر چکا ہوں" ـــــ"اسی بات سے سمجھ لو کہ وہ کتنے کمینے لوگ ہیں۔ انہوں نے سوچ سمجھ کر جال بچھایا اور تمہیں پھنسا لیا ـــــ" "اب میں پھنس چکا ہوں نکل نہیں سکتا"۔

"میں تمہیں نکال لاؤں گی"۔" جب میں خود نہیں نکلنا چاہتا تو تم کون ہو نکالنے والی"۔

"علی ـــــ علی ـــــ خدا کے واسطے سوچو تم کیا کرنے جا رہے ہو۔ اگر تمہیں میری ضرورت نہیں رہی ـــــ اور دوسری شادی کرنا چاہتے ہو تو اس شہر میں اور بھی اچھی لڑکیاں ہیں۔ وہاں کر لو شہلا کو میری سوکن بنا کر نہ لاؤ"۔

"تو سیدھی طرح کہو تم اس سے حسد کرتی ہو"۔

"حسد کیا ہوتا ہے میں نہیں جانتی۔ اگر ایسی ہوتی تو اتنی بڑی قربانی تمہارے لئے نہ دیتی۔"

"یہ نہ بھولو کہ میں شہلا سے محبت کرتا ہوں اور اس کے بغیر نہیں رہ سکتا۔"

"ایک دن تم نے یہ مجھ سے بھی کہا تھا۔" "ہاں ـــــ مگر اب اپنی صورت آئینے میں دیکھو تم اپنے بچوں کا دھیان رکھو اور اللہ اللہ کرو ـــــ"

"علی ـــــ میں تمہیں شادی کی اجازت نہیں دوں گی۔" اسما نے اپنا آخری حق استعمال کیا۔

"اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا ـــــ جب طلاق نامہ تمہارے ہاتھ میں آئے گا تو پھر اجازت نامے کی ضرورت نہیں پڑے گی۔" یہ کہہ کر علی احمد باہر نکل گیا۔

"تو یہ ظلم بھی ہو سکتا ہے ـــــ اسما بیٹھی سوچتی رہی ـــــ اس نے تو کبھی بھی نہ سوچا تھا ـــــ کہ ایسا ہوگا ـــــ کیا علی احمد اتنا اندھا ہو چکا ہے۔ کیا اس کو احساس نہیں کہ میرا اس دنیا میں کوئی نہیں ـــــ کیا اس کو احساس نہیں کہ اس کی تین بیٹیاں ہیں ـــــ اور کیا وہ ہمیشہ جوان رہے گا ـــــ تاہم وہ اس کو ایک دھمکی ہی سمجھتی رہی۔ پھر اس نے خالہ کو بلا بھیجا ـــــ خالہ نے بھی مشورہ دیا کہ ـــــ "اس کو شادی کی اجازت دے دو

جب مرد ضد پر آجاتا ہے تو اپنی کر دکھاتا ہے ـــــ ادھر ان لوگوں نے پوری تیاریاں کر رکھی ہیں، بلکہ علی احمد نے ان کو گلبرگ میں ایک خوب صورت کوٹھی کرائے پر لیکر دی ہے۔ محلے والے باتیں بناتے تھے ـــــ اس لئے وہ لوگ وہاں چلے گئے ہیں۔ علی احمد وہاں روز جاتا ہے۔ شادی کا سارا بندوبست ہو چکا ہے۔ بلکہ پوری شاپنگ شہلا نے خود اپنی مرضی سے کی ہے۔"

"بیٹی! تم بیٹیوں والی ہو۔ طلاق ہو گئی تو بڑی مشکل ہوگی ـــــ اس لئے اسے شادی کی خوشی خوشی اجازت دے دو ـــــ اللہ نے چاہا تو جلد تمہارے پاس لوٹ آئے گا جب مرد کا نشہ اتر جائے تو اپنی زیادتی کا خیال آتا ہے۔ پھر وہ پہلی بیوی کے پاس لوٹ آتا ہے۔ جب صبر کی سل سینے پر رکھی ہے ـــــ تو اندر سے اس عورت کو بھی مارتا ہے جو کسی کی بیوی

ہے ـــــ صرف یہ سوچو تم چار بچوں کی ماں ہو ـــــ"

"ہاں!" خالہ نے ٹھیک کہا تھا۔

اسما سارا دن سوچتی رہی کہ اب کون سا علی احمد اس کے پاس رہتا ہے۔ نہ گھر میں کھانا کھاتا ہے ـــــ نہ اس سے ٹھیک سے بات کرتا ہے۔ وہ تو اپنی دنیا باہر بسا بیٹھا ہے۔ اگر اس کس مپرسی میں اتنے دن گزر گئے ہیں تو زندگی بھی گزر جائے گی۔ یہ سوکن والا صدمہ بھی اسے جھیل لینا چاہیئے۔ رات کو علی احمد آیا۔

تو وہ اسے اجازت دینے کو تیار بیٹھی تھی۔

مگر علی احمد نے ایک لفافہ اس کے ہاتھ میں تھما دیا اور بولا ـــــ "میں تمہیں طلاق دیتا ہوں۔"

"علی ـــ علی ـــــ" اسما زور زور سے چلانے لگی۔ "خدا کے لئے ایسا نہ کہو، یہ ظلم نہ کرو ـــــ خدا کے واسطے ـــــ ایسا نہ کرو میں تمہیں شہلا سے شادی کرنے کی اجازت دیتی ہوں ـــــ"

"اب اس کی ضرورت نہیں رہی" علی احمد نے بے بسی سے کہا ـــــ "اس کی ایک نقل میں نے چیئرمین کو بھجوا دی ہے۔ اس پر گواہوں کے دستخط ہیں۔ اب یہ واپس نہیں لی جا سکتی ـــــ"

"علی ـــــ علی" اسما اس کے قدموں میں گر گئی۔ اور آنسوؤں سے اس کے جوتے تر کر دیئے۔ ان تین لڑکیوں پر رحم کرو۔ کل جن کا کوئی ڈولا اس لئے نہیں اٹھائے گا ـــــ کہ ان کی ماں کو طلاق ہو گئی تھی۔ اس بچے پر رحم کرو ـــــ جسے ہوش سنبھالتے ہی باپ نظر نہیں آئے گا ـــــ علی ـــــ میں تمہاری خادمہ بن کر رہوں گی۔ میں شہلا کی نوکرانی بن جاؤں گی ـــــ خدا کے واسطے ـــــ رسول کے واسطے ـــــ مجھے یوں بے موت نہ مارو۔ میرا کوئی قصور بتاؤ ـــــ بیوی ہونے کی اتنی بڑی سزا نہ دو ـــــ تم میرے پاس کبھی نہ آنا ـــــ میں شکوہ نہیں کروں گی ـــــ مگر مجھے طلاق نہ دو۔"

"بس طلاق ہو چکی ہے، علی احمد نے پاؤں سے اسے ٹھوکر ماری ـــــ اور وہ دور

جاگری۔" میں طلاق واپس نہیں لے سکتا ـــــ"

"شہلا نے شرط یہ رکھی ہے کہ میں پہلے تمہیں طلاق دوں اور پھر وہ مجھ سے شادی کرے گی"

"نہیں نہیں ـــــ علی ـــــ تم اتنے بے درد نہیں ہو سکتے، یہ تمہارا فیصلہ نہیں ہے۔ میں جانتی ہوں یہ تمہارا فیصلہ نہیں ہے۔ تم کو بچوں سے محبت تھی ـــــ مجھ سے محبت تھی ـــــ علی ـــــ او میرے خدا ـــــ"

اسماء بلک بلک کر رو رہی تھی ـــــ اس کو روتا دیکھ کر سب بچے اٹھ کر آ گئے تھے۔ اور وہیں فرش پر بیٹھ کر ماں کے ساتھ رو رہے تھے ـــــ علی احمد نے نفرت سے مڑ کر ان کی طرف دیکھا اور پھر جلدی جلدی اپنا ضروری سامان اکٹھا کرنے لگا ـــــ جب اسماء کو ہوش آیا ـــــ تو اس نے بڑی لڑکی حنا سے کہا۔

"جاؤ بیٹی، اپنے ابو کو روک لو ـــــ ان کے پاؤں پڑ جاؤ ـــــ" حنا اٹھی تو اس کے ساتھ صبا بھی اٹھ گئی۔

دونوں جا کر باپ کی ٹانگوں سے لپٹ گئیں ـــــ "پرے ہٹ جاؤ ـــــ"

اس نے بے دردی سے دونوں کو ہٹا دیا۔ اور اسماء کی طرف دیکھ کر بولا۔ "یہ ڈرامہ میرے ساتھ نہ کرنا۔ میرا فیصلہ بدل نہیں سکتا۔" اسماء کے آنسو ہی نہ رک رہے تھے ـــــ وہ کیا جواب دیتی ـــــ اس نے اپنے سارے سامان سے دو اٹیچی کیس بھر لئے، کتابوں سے ایک تھیلا بھرا ـــــ ایک ایک کر کے سامان موٹر میں رکھ آیا ـــــ اور پھر کمرے میں آ کر ذرا دیر کو رکا اور بولا۔ "میں نے کوئی بے انصافی نہیں کی ـــــ یہ گھر جس میں تم رہتی ہو، تمہارے نام لکھ دیا ہے ـــــ جو زیور، کپڑے اور گھر کے اندر سامان ہے۔ وہ بھی تم رکھو۔ اس کے علاوہ بچوں کے لئے ایک ہزار روپیہ مہینہ تمہیں باقاعدہ ملتا رہے گا۔ میں اللہ کے سامنے شرمسار نہیں ہوں ـــــ اور میں نے بہت سوچ سمجھ کر فیصلہ کیا ہے۔"

وہ چلا گیا ـــــ جیسے تن سے رُوح نکل جاتی ہے ـــــ کار سٹارٹ ہونے کی آواز آئی ـــــ اب اس آواز پر کبھی دل نہ دھڑکے گا ـــــ کار گیٹ سے باہر نکل گئی ـــــ جیسے دل سے آخری آرزو نکل گئی۔ اس نے سڑک پر ایک ہارن دیا ـــــ اب یہ ہارن سن کر وہ سڑک کی طرف دیوانہ وار نہ دوڑے گی ـــــ اب صبح کو جاتے وقت لب پر دعائیں نہ ہوں گی ـــــ شام کو خوش آمدید کہنے کی سب ادائیں نہ ہوں گی ـــــ رات قیامت کی آئے گی ـــــ اور صبح ـــــ حشر کے بعد کی صبح کیسی ہوتی ہے ـــــ؟ کس نے دیکھی ـــــ؟ اور کون جانے ـــــ؟

بارہ سالہ حنا نے سفید لفافہ زمین سے اُٹھا کر میز پر رکھ دیا اور بولی۔

"امی اس میں کیا ہے ـــــ" اسماء ایسے بیٹھی تھی جیسے سکتہ ہو گیا ہو ـــــ پھر وہ جھنجلا کر رو پڑی ـــــ امی آپ کو کیا ہوا ہے۔ امی ابو کیوں چلے گئے۔ اور پھر تینوں بیٹیاں ماں کا چہرہ دیکھ کر رو پڑیں۔ اسماء کو ہوش آ گیا۔ ـــــ جینا تو پڑے گا ـــــ چاہے مر مر کر چاہے جل جل کر ـــــ اس نے تو بچوں کو ٹھکرا دیا ـــــ مجھے تو انہیں سینے سے لگانا ہے ـــــ اس نے بچوں کو چمکارا، انہیں پیار کیا ـــــ پھر انہیں ان کے بستروں میں لٹایا ـــــ تھپک کر سُلایا ـــــ سوتی سوتی بچیاں دیکھتی رہیں کہ آج لوری کی جگہ ـــــ ماں کی آنکھوں سے مسلسل آنسو ٹپک رہے ہیں ـــــ

پھر اسما۔ وہ لفافہ تھام کر اپنے بستر پر آ بیٹھی ـــــ ہاں تو یہ انجام تھا اس ارمانوں بھری زندگی کا ـــــ کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ ساربان سارے قافلے کو چھوڑ کر ایک مخالف سمت کو مڑ جاتا ہے ـــــ

جب قافلے کا ساربان نہ ہو تو قافلہ کدھر جائے ـــــ وہ راہ میں ہی کھڑا ہو جاتا ہے بے شمار راستے ـــ بے شمار شکلیں ـــــ اور لگام تھامنے والا کوئی نہیں ـــــ ! والدین اور بزرگ شادی کے وقت کتنی دُعائیں دیتے ہیں۔ اور اس وثوق سے رخصت کرتے ہیں جیسے اب اس کی زندگی تو مکمل ہو گئی ـــــ

عورت کو گھر مل گیا ـــــ سہارا مل گیا ـــــ محبت مل گئی ـــــ کسی شے کو بقا نہیں ـــــ محبت ہو ـــــ سہارا ہو یا حُسن ہو! ہاں کل تک وہ حسین تھی، خوبصورت تھی، جواں تھی۔ وقت نے یہ سب کچھ چھین لیا ـــــ اس نے سامنے ڈریسنگ ٹیبل کے آئینے میں اپنی شکل دیکھی۔ کیسا بھیانک چہرہ ہو رہا تھا۔ نہ رنگ نہ رُوپ ـــــ اس بچے کے بعد تو اس کے رُخساروں پر جھائیاں پڑ گئی تھیں۔ جسم موٹا ہو کر بے ڈول ہو گیا تھا ـــــ رنگ سیاہ ہو گیا تھا ـــــ اور پھر پے در پے صدموں نے اور بھی ادھ موا کر دیا تھا۔ کیا دنیا میں حُسن ہی سب کچھ ہے۔ وہ جو اندر سے ایک خوبصورت عورت بن گئی تھی۔ اس میں نسوانیت کی سب خوبیاں آ گئی تھیں۔ شوہر کی مزاج داں بن گئی تھی ـــــ بچوں کی ـــــ شناس تھی ـــــ

وقت کی تبدیلیوں کو کہاں روک سکتی تھی ـــــ اس کی خوبیوں کو سراہا نہ گیا ـــــ بغیر قصور کے اسے سزائیں دی گئیں ـــــ کیوں آخر؟ پھر ساتھ لیٹے بچے پر اس کی نظر پڑ گئی ـــــ

یہ سب اس کے کارن ہوا ـــــ بہت شوق تھا اسے بیٹے کا ـــــ ہر موقعہ پر ہر جا دعائیں مانگتی، منتیں مانگتی ـــــ وہ سمجھتی اگر اس نے علی احمد کو ایک بیٹا نہ دیا تو اس کی زندگی میں کمی رہ جائے گی۔

واہ خدایا! ایک خوشی دیتا ہے، تو دوسری چھین لیتا ہے۔ بیٹا دیا اور شوہر چھین لیا

اس سے تو اچھا تھا بیٹا نہ دیا ہوتا۔ عورت کا تخت و تاج تو اس کا شوہر ہوتا ہے۔ بیٹا محض ایک خوشی ہوتا ہے۔ اس بیٹے کی وجہ سے اس نے شہلا کو بُلا بھیجا ـــــ اور تقدیر یوں آنکھیں پھیر گئی ـــــ کیا یہ بچہ منحوس ہے ـــــ ؟ نہیں نہیں ـــــ اس نے سوتے ہوئے منے کو کلیجے سے لگا لیا ـــــ کوئی منحوس نہیں ہوتا ـــــ ساری مقدر کی کرامات ہیں۔ اس ننھے سے بچے کا کیا قصور! اس نے تو ابھی آنکھ کھول کے ٹھیک طرح سے اپنے باپ کو دیکھا بھی نہیں ـــــ اور باپ مُنہ موڑ کر چل دیا ـــــ بارالہا ـــــ !

کیا ہے یہ زندگی بھی ـــــ اس نے ٹھنڈی آہ کھینچ کر کہا ـــــ

کیا ہے یہ زندگی تو ہی بتا ـــــ ؟ جوانی کے ڈھل جانے کے بعد عورت استعمال شدہ جوتی یا جھوٹے برتن کی طرح کیوں ٹھکرا دی جاتی ہے۔ اور اگر عورت کا روپ اور جوانی ہی دو طاقتیں تھیں، تو پھر تو اُس سے یہ کیوں چھینتا ہے؟ یہ مرد صورت سے کیوں پیار کرتا ہے جسم کا کیوں پروانہ ہے؟۔

وقت ہاتھ سے کیوں نکل جاتا ہے ـــــ ستارے چال کیوں بدل جاتے ہیں ـــــ دنیا میں کیوں سکون نہیں ملتا ـــــ مرنے سے پہلے آدمی سو بار کیوں مرتا ہے ـــــ اور اتنے بے شمار ناطے اور بندھن ہونے کے باوجود ہر شخص دنیا میں تنہا کیوں ہے ـــــ ؟

یہ زندگی کیا ہے ـــــ ؟

جب مرنے کو جی چاہے تو۔ تو جینے پر مجبور کرتا ہے۔ بچوں کا چہرہ سامنے لے آتا ہے۔ ایک ہرجائی مرد تو بچوں کو ٹھکرا کر دوسری زندگی اپنا لیتا ہے ـــــ مگر ایک وفا شعار عورت بچوں کے لئے حسین سے حسین جنت بھی ٹھکرا دیتی ہے۔

اے کاتبِ تقدیر ـــــ !

دو انسانوں کی تقدیر الگ الگ قلم سے کیوں لکھتا ہے۔

ایک کو حاکم بنا دیتا ہے۔ دوسرے کو محکوم ـــــ ایک کو جابر، دوسرے کو مظلوم ـــــ ایک کو سب اختیار سونپ دیتا ہے اور دوسرے کو مرنے کا اختیار بھی نہیں دیتا ـــــ

واہ ـــــ

عجیب کھیل ہیں تیری قدرت کے ـــــ پھر ہم میں اتنی مجال کہاں ـــ کہ تجھ سے شکوہ کریں۔ تو کہتا ہے چل پڑو ـــــ کہ زمانہ چل رہا ہے ـــــ ٹھہرنے والوں کو زمانہ پسند نہیں کرتا ـــــ ٹھہرنے والے کا زمانہ ساتھ نہیں دیتا۔ ٹھہرنے والوں کے لئے زمانہ نہیں ہے ـــــ یہ زمانہ ہے ـــــ یا زنداں ـــــ جہاں ہم اپنی مرضی سے سانس بھی نہیں لے سکتے۔

اور تو کہتا ہے ـــــ زمانے کو بُرا نہ کہو ـــــ زمانے کو گالی مت دو ـــــ زمانہ تو مَیں ہوں ـــــ میں دن رات کا الٹ پھیر کرتا ہوں ـــــ میں سردی گرمی لاتا ہوں۔ میں دکھ سکھ لاتا ہوں ـــــ تو لے ـــــ تیرے دکھ سکھ بھی کلیجے سے لگا لیتے ہیں ـــــ

جس طرح تو کہتا ہے جی لیتے ہیں۔

علی احمد اپنی نئی نویلی ـــــ شوخ و چنچل۔ دِل آرا و دِل نواز ـــــ نو عمر دُلہن کو لیکر ایبٹ آباد، سوات، کاغان اور جانے کہاں کہاں کی سیر کر کے لوٹ آیا تھا۔ دفتر سے اُس نے تین مہینے کی چھٹی لے رکھی تھی۔ اس سے پہلے تو اُس نے کبھی چھٹی نہیں لی تھی اس لئے اس کی بہت چھٹیاں جمع ہو چکی تھیں۔ گلبرگ کے نئے گھر میں آسائش کا سب سامان آ گیا تھا۔

گھر کی کرتا دھرتا شہلا کی ماں شمیم تھی۔ اور اُس کے آٹھ بچے جو کل تک گلیوں کے کیڑے تھے آج شاہانہ انداز میں رہ رہے تھے۔ بہترین لباس پہنتے تھے۔ بہترین اسکولوں میں داخل ہو گئے۔ شمیم بیگم تو اپنی دوسری بیٹی راحیلہ کے بارے میں بھی اب بڑے بڑے خواب دیکھنے لگی تھی۔ راحیلہ بارہ برس کی تھی۔ مگر شہلا سے کہیں اچھی تھی۔ اب تو شمیم بانہوں میں سونے کی چوڑیاں پہن کر بازو نچا نچا کر خاندان والوں کو صلواتیں سناتی تھی ـــــ اور جو کوئی اسماء کا نام لے دیتا تو اس کے پیچھے پنجے جھاڑ کر پڑ جاتی۔

اسماء کا تو وہ نام بھی سُننا نہیں چاہتی تھی ـــــ

دِن رات علی احمد کے صدقے اُتارتی رہتی تھی ـــــ اٹھتے بیٹھتے اس کو دعائیں دیتی رہتی ـــــ چاپلوسی کرتی ـــــ اور ایسا ظاہر کرتی جیسے علی احمد کوئی اوتار ہو ـــــ بچے الگ دُولہا بھائی دُولہا بھائی کہتے ساتھ لگے رہتے۔ آج سائیکل لے دیں۔ کل

گھڑی لے دیں۔ بین لے دیں۔ بالیاں لے دیں۔ فرمائشیں تھیں کہ ختم ہونے میں نہ آتی تھیں۔

علی احمد کی تنخواہ خاصی معقول تھی۔ اسما کے ساتھ رہتے ہوئے تو اُسے کبھی کاخانوں کی رقم یوں خرچ کرنے کی نوبت نہ آئی تھی، مگر اب تنخواہ تو ہفتے میں ہی ختم ہو جاتی پھر اُسے اپنے بھائیوں سے حساب مانگنا پڑا۔ بلکہ اپنا حصہ الگ کرنا پڑا۔

پہلے تو وہ سوچتا تھا کہ رقم پڑی رہے۔ بچیوں کی شادی کے وقت کام آئے گی۔ مگر اسے اپنی شادی بھی تو نبھانی تھی۔

لیکن دن اور رات ـــــ کیسے پُرکیف ہو گئے تھے ـــــ ایک نوجوان لڑکی کا ساتھ تھا عشوے و غمزے ہوتے ـــــ ناز و نخرے ہوتے ـــــ علی احمد تو اس پر نثار ہوا جاتا۔ اُسے ایسے لگتا کہ وہ نئے سرے سے جوان ہو گیا ہے۔ اسما کے ساتھ رہتے رہتے۔ وہ جمود کا شکار ہو گیا تھا ـــــ اپنے آپ کو بوڑھا سمجھنے لگ گیا تھا۔ نکما اور ناکارہ ہو گیا تھا۔

لیکن اب وہ تنومند تھا ـــــ تازہ دم تھا ـــــ اس میں جوانی کی امنگیں تھیں۔ اور ایک جوان بیوی کو ہر طرح سے خوش رکھے ہوئے تھا۔

تین مہینے تو ہنی مُون میں ہی بیت گئے ـــــ چھٹیاں ختم ہوئیں تو اس نے دفتر جانے کا تہیہ کر لیا۔ وہ سمجھتا تھا کہ بے مقصد جینا کوئی جینا نہیں۔ اور پھر کام کرنا تو بہت ضروری تھا۔

لیکن اس دفتر جانے کے خیال کو شہلا نے پسند نہیں کیا۔

"دیکھو ڈارلنگ دفتر نہ گیا تو کھائیں گے۔ کہاں سے۔؟"

"چلیئے اب باتیں نہ بنائیں ـــــ مجھے معلوم ہے آپ پیسے والے ہیں۔" شہلا اٹھلا کر کہتی۔

"پیسے والا آدمی تب تک رہتا ہے۔ جب تک کماتا ہے۔ اگر نہ کمائے تو پیسہ اُڑ جاتا ہے ـــــ"

علی احمد نے دفتر جانا شروع کر دیا۔

دفتر میں ہر کام میں اس کا دل بہت خوش رہتا۔ شاید یہ زندگی کی تبدیلی کا اثر تھا۔

پہلے پہل اسے گھر جانے کی جلدی ہوتی، جہاں شہلا سولہ سنگھار کئے اس کی منتظر ہوتی۔ ذرا دیر ہو جاتی ـــــ یا راستے میں ٹریفک کی وجہ سے گاڑی رک جاتی تو منہ پھُلا لیتی ـــــ بات نہ کرتی ـــــ سو سو قسمیں لیتی کہ آپ کہاں رہ گئے تھے۔

دِن میں کئی بار قسمیں لیتی کہ آپ اسما کے ہاں تو نہیں گئے تھے ـــــ

"ڈارلنگ اب اُس کے ہاں جا کر مجھے کیا کرنا ہے۔ میرا اس کا کیا ناطہ ہے۔ ہر رشتہ تو تم نے تڑوا دیا تھا۔"

مگر وہ مانتی ہی نہ تھی۔

ساری شام اس کو منانے میں گزر جاتی۔ پھر جو وقت بچتا اس کو گھمانے کے لئے جانا ہوتا ـــــ روز پکچر دیکھنے کی وہ شوقین تھی۔ ہوٹل میں کھانا کھانے کا اسے جنُون تھا اگر کسی شام ایسا نہ ہوتا تو وہ لڑتی جھگڑتی رہتی ـــــ روتی رہتی ـــــ اور علی احمد اس کی خوشامدیں کرتا رہتا۔

کبھی کبھی تو وہ ـــــ سب بہن بھائیوں کو ساتھ لے کر پکچر دیکھنے چل دیتی۔ علی احمد اس ہجوم سے بہت گھبراتا تھا۔ اور کبھی مائے شوق کے اس کی ماں بھی ساتھ چلنے کا ارادہ ظاہر کرتی تو علی احمد کا دم ہی نکل جاتا، بہت بدتمیز عورت تھی۔ ہر جگہ اونچی اونچی آواز میں باتیں کرتی۔ گویا ساری دنیا کو سنا رہی ہو۔ کہ علی احمد ان کا رشتہ دار ہے۔

شہلا کے ملنے اسے سب گوارا تھا۔ شہلا کے لئے تو اس نے اپنے بیوی بچے بھی چھوڑ دیئے تھے ـــــ

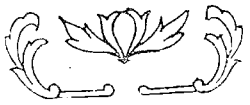

تین مہینے اور گزر گئے ——

تو علی احمد کو محسوس ہوا —— موجودہ صورتِ حال نے اسے تھکا دیا ہے۔ نڈھال کر دیا ہے۔ وہ جو زندگی بسر کر رہا ہے مصنوعی ہے —— پہلے بھی وہ تھک جایا کرتا تھا۔ مگر صرف جسمانی طور پر —— مگر اب ذہنی طور پر مضمحل رہتا ہے —— ایسا نہیں کہ وہ پچھتا رہا تھا، بلکہ چھ مہینے ان لوگوں کے ساتھ رہ کر جو کچھ اس نے دیکھا تھا وہ اس کا پختہ ذہن قبول نہیں کر رہا تھا ——

کبھی کبھی وہ سوچتا —— کہ یہ جال جو اس نے خوشی خوشی بچھایا تھا۔ اس میں پھڑکتا رہے گا۔ ایک دو بار اس نے شہلا کو بڑے پیار سے سمجھایا کہ ہم الگ گھر لے کر رہتے ہیں تو وہ بگڑ گئی۔

"کیا ہم امی اور بچوں کو تنہا چھوڑ دیں۔ میں تو کبھی نہ جانتی تھی۔ آپ اتنے خود غرض ہوں گے۔ وہ لوگ کہاں رہیں گے"

"اُن سے کہو اپنے اسی پرانے گھر میں چلے جائیں۔ میں انہیں وہاں خرچ دیتا رہوں گا"

"اُف اللہ —— اور میں یہاں اکیلی رہوں —— مجھے تو ڈر لگے گا"

"ہر لڑکی کو اپنے گھر میں تنہا رہنا پڑتا ہے۔ اگر زیادہ مجبوری ہوتی تو ایک بہن کو اپنے پاس رکھ لیتا"

"یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں —— کیا آج آپ کو میرے رشتے دار بُرے لگنے لگے ——

"ہائے اللہ"

اور وہ زار و قطار رونے لگی —— اس کی ماں کی موجودگی میں وہ شہلا کو کچھ بھی نہیں کہہ سکتا تھا۔ حالانکہ وہ شوہر تھا اور اسے حق پہنچتا تھا۔ بعض باتوں کے متعلق اسے سختی سے سمجھاتے۔ مثلاً ہر روز صبح جب وہ دفتر جاتا —— اس کے کپڑے نکالے —— ناشتہ کراتے ——

مگر وہ اٹھ کر ایک ایک چیز کے لئے چلاتا رہتا —— اور شہلا پلنگ پر یوں بے سدھ سوتی رہتی —— جیسے سونے کے علاوہ اس کا اور کوئی کام نہیں۔

ناشتہ بھی ہر روز مختلف انداز میں نیا ہوتا۔ انہیں ابھی تک سمجھ نہیں آئی تھی کہ انڈا کیسے فرائی کریں —— توس کس حد تک سینکیں —— نہ چائے میں مزہ —— نہ کافی میں۔ وہ حیران ہوتا کہ کس طرح وہ چھ ماہ تک یہ سب کچھ کھاتا پیتا رہا ہے —— نہ جانے کس عالم اور کس نشے میں —— ورنہ تو اسماء کے گھر میں، ذرا کسی شے میں انیس بیس کا فرق پڑتا تھا —— اٹھا کر دیوار پر دے مارتا تھا —— اپنے جذبات کو دبا دبا کر اس کے سر میں درد رہنے لگا تھا۔ بہت علاج کروایا —— بہت سے ڈاکٹروں کو دکھایا —— مگر کوئی سمجھ نہ سکا کہ اس درد کی وجہ کیا ہے۔ ہاں وہ جانتا تھا۔ جس روز گھر میں اس کی مرضی کے خلاف کچھ ہوتا۔ اس کے سر میں مسلسل درد ہونے لگتا تھا۔

وہ چاہتا تھا سکون سے کمرہ بند کر کے اس میں سو جائے۔ مگر سکون اس کے گھر میں کہاں تھا —— ؟ یہاں تو بدتمیز بچوں کی ایک فوج ہر وقت ہلڑ مچائے رکھتی، تب وہ اُٹھ کر بچوں پر خوب بگڑا کرتا۔ شہلا کی ماں فٹ چٹریل کی طرح آمنے دار ہوتی —— "بچے ہیں، پیار سے سمجھاؤ تو چلے جائیں گے۔ جاؤ بھئی اس طرف جا کر کھیلو۔ تمہارے دُولہا بھائی آرام کرنا چاہتے ہیں"

کبھی صبح صبح جب وہ شہلا پر بگڑتا کہ وہ انتہائی غیر ذمہ دار عورت ہے —— رات کو جو کپڑے کہے تھے وہ نکال کر نہیں رکھے تو جھٹ اس کی ماں بوتل کے بند کی طرح بیڈ روم

میں آمنو دار ہوتی۔

"کیوں بگڑ رہے ہو اُس پر ـــــ ابھی بچی ہے سمجھ جائے گی۔" "شادی کے فوراً بعد عورت کو اپنے شوہر کا مزاج سمجھنا چاہیئے، ورنہ گزارہ نہیں ہو سکتا ـــــ"

"ارے کیوں گھبراتے ہو۔ ذرا اپنی اور اس کی عمر کا مقابلہ کرو۔ رفتہ رفتہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ سال دو سال تو لگیں گے ـــــ"

جب وہ عمر کا طعنہ دیتی اور خوب سوچ سمجھ کر دیتی تو وہ پنا غصہ دبا کر باہر نکل جاتا۔

پھر وہ کھانے کی میز پر آدھمکتی ـــــ

ساتھ ساتھ ناشتہ کرواتی جاتی اور ساتھ ساتھ چاپلوسانہ باتیں کرتی جاتی۔ "تمہارے بغیر اس کا ذرا بھی دل نہیں لگتا۔ سارا سارا دن اداس رہتی ہے۔ بار بار دروازے کی طرف دیکھتی ہے۔ دوپہر کا کھانا نہیں کھاتی۔ تمہارے آنے کا وقت ہو تو پھول کی طرح کھِل اٹھتی ہے۔ ذرا جوڑا بدل، سنگھار کر کے گیٹ پر نظریں جما دیتی ہے۔"

علی احمد کو ان باتوں سے دلچسپی نہ تھی وہ گھر میں عورت کو محض بیوی دیکھنے کا عادی تھا اور یہ شمیم بیگم اسے نائکہ لگتی ـــــ کٹنی لگتی ـــــ

عاشق اور شوہر میں بہت فرق ہوتا ہے ـــــ وہ سوچتا، اور یہ کمبخت مجھے ابھی تک عاشق ہی جانتی ہے ـــــ شوہر کو تو وہی عورت خوش رکھ سکتی ہے۔ جس میں بیوی والی تمام تر خوبیاں ہوں ـــــ

باورچی خانے میں وہ اچھا خانسامہ ہو ـــــ

ڈرائینگ روم میں بہترین میزبان ـــــ بیڈ روم میں وہ نفیس ترین دلربا ـــــ

بیماری میں اعلیٰ پائے کی نرس ـــــ پریشانی میں غمگسار دوست ـــــ

کام کے وقت بہترین اسسٹنٹ ـــــ ہاں! یہ سب خوبیاں اسماء میں تھیں ـــــ تمہیں یا اس نے پیدا کیں۔ اب علی احمد اعتراف کرتا تھا اسے اس کی اک اک بات یاد آتی تھی۔ جو عیش وہ اس ڈھلتی عمر میں شہلا کو کرا رہا تھا۔ وہ عیش اس نے پہلی شادی ـــــ جوانی کے عالم میں اسماء کو بھی نہیں کرائے تھے۔ گو اسماء سے محبت کر کے اس نے شادی کی تھی۔

مگر اُس کے ساتھ شروع میں بڑا سخت برتاؤ کیا تھا۔

اسماء کی کیا مجال تھی کہ ہنی مون کے زمانے میں وہ نخرہ کرے یا اس کی بات ٹالے۔ وہ پہلے دن ہی سمجھ گئی تھی کہ علی احمد گھر میں شوہر بن کر رہنا چاہتا ہے ـــــ شادی کو ابھی چند دن گزرے تھے کہ اس نے اپنے فرائض کو پہچان لیا تھا۔ علی الصبح اُٹھ کر پانی گرم کر کے غسلخانے میں رکھتی۔ علی احمد کو جگاتی۔ ناشتہ بناتی۔ اس کے کپڑے نکالتی، استری کرتی رومال کو خوشبو لگاتی۔ کاج میں پھول لگاتی۔ اور پھر ہنس کر خدا حافظ کہتی۔ اس کے جانے کے بعد خود ناشتہ کرتی۔ یہ معمول اس کی زندگی میں ہمیشہ رہا۔ اور وقت کے ساتھ ساتھ وہ اس کے کپڑوں کی پسند بھی جان گئی تھی ـــــ اندازے سے وہی سوٹ نکال کر رکھتی جو اسے پہننا ہوتا ـــــ پھر موسموں کے تغیر و تبدل کے ساتھ کپڑے نکالنے لگی ـــــ چاروں طرف مختلف موسموں کے کپڑے اس نے مختلف خانوں میں رکھے ہوئے تھے اُس کی ہر شے ہمیشہ اپنی جگہ پر ملتی ـــــ کبھی صبح کو اُسے کسی چیز کے لئے نہیں چلانا پڑا ـــــ حتیٰ کہ انڈا بھی ہر روز ایک ہی صوت کا تلا ہوا ہوتا۔ اس بات پر اُسے ضرور تعجب ہوتا ـــــ ایک بار اُس نے پوچھ ہی لیا کہ "تم کئی سال سے ایک ہی طرح کا انڈا کیسے تل رہی ہو؟" ہنس کر بولی۔ "کسی کسی روز خراب بھی ہو جاتا ہے۔ میں دوسرا انڈا بنا لیتی ہوں تیسرا انڈا بنا لیتی ہوں۔ جب تک اسی طرح کا نہ ہو۔ میز پہ نہیں لاتی۔ آپ کے لئے صبح کو دو۔ تین انڈے ضائع بھی تو کئے جا سکتے ہیں۔" اس پر علی احمد سارا دن مسرور رہا تھا۔

اور یہاں علی احمد شہلا کو ہاف بوائل ـــــ اور فرائی کرنے کا طریقہ سمجھا سمجھا کر تھک گیا تھا۔ ہر روز ایسی بُری شکل کا انڈا میز پر ہوتا کہ وہ کھائے بغیر چلا جاتا ـــــ

اور ایک دن تو شہلا نے صاف کہہ دیا تھا "آپ خواہ مخواہ نخرے کرتے ہیں اتنا تو اچھا انڈا میری امی بناتی ہیں۔" "تم خود کیوں کوشش نہیں کرتی؟" "کیا میں امی سے اچھا بنا لونگی۔ مجھے تو کوئی تجربہ ہی نہیں ـــــ"

اسے یاد آیا۔ ایک دن اُس کی طبیعت ذرا ناساز تھی اور وہ صرف چائے کی ایک پیالی پی کر دفتر چلا گیا تھا ـــــ لنچ ٹائم ہوا تو اس کا چپراسی ہاٹ کیس لے کر آ گیا۔ کھول کر

دیکھا تو اسمیں ہری مونگ کی کھچڑی تھی ـــــ وہی تھا ـــــ انار دانہ کی چٹنی تھی ـــــ اور شامی کباب تھے ـــــ

واللہ اسے کھانے کا لطف آگیا۔ واقعی اس کے پیٹ میں کچھ گڑبڑ تھی۔ اس وقت چٹنی کے ساتھ کھچڑی کھانے کو دل چاہ رہا تھا۔

واہ ـــــ بیوی ہو تو ایسی ـــــ ابھی سوچ رہا تھا کہ فون کی گھنٹی بجی۔ اٹھایا اسما تھی۔ بولی ـــــ "آپ ٹھیک تو ہیں۔ آج صبح آپ ہیو کے گئے تھے۔ میں نے پرہیزی کھانا بنا کر بھیج دیا تھا۔ تھوڑا بہت کھا لیجئے۔ ورنہ طبیعت خراب ہو جائے گی۔

"تم تھوڑا بہت کی بات کرتی ہو۔ ذرا برتن دیکھنا میں سارا چٹ کر گیا ہوں۔ اور کھچڑی کے بعد شامی کبابوں نے خوب لطف دیا ـــــ اصل داد تو میں گھر آ کے دوں گا"

ہنستے ہوئے اسما نے فون بند کر دیا۔

اور یہاں کئی روز سے اس کا پیٹ خراب تھا۔ ہوٹلوں کا کھانا اسے کبھی ہضم نہیں ہوتا تھا۔ مگر ہر شام کھانا پڑتا تھا ـــــ پھر وہ اپنی خوش دامن کو کہہ کہہ کر تھک گیا کہ ہری دال کی کھچڑی پکا دیں۔ کبھی دال کچی رہ جاتی ـــــ کبھی چاول ملیدہ ہو جاتے ـــــ پھر یہ لوگ کہتے کہ بیمار کو ایسی کھچڑی کھانی چاہیئے۔

توبہ ـــــ! کچھ روز اس نے دفتر میں کھانا منگوایا۔ کیونکہ اسے دفتر میں کھانے کی عادت تھی۔ مگر اتنا گندا کھانا ہوتا ـــــ اتنے گندے برتن ہوتے کہ اسے اپنے عملے کے سامنے کھولتے ہوئے شرم آتی۔

کہاں وہ نفاست کہ اسما چمچم کرتے برتن بھیجتی۔

چھری کانٹے ـــــ نیپکن ـــــ سب ایک خوبصورت سی ٹوکری میں ڈال کے الگ رکھتی حتیٰ کہ پھل بھی کاٹ کر ساتھ رکھ دیتی ـــــ یہاں پر اس نے کھانا گھر سے منگوانا بند کر دیا تھا ـــــ

یہی نہیں اسما اس کے چہرے کی ایک شکن سے اس کے موڈ کا اندازہ کر لیتی تھی۔ ایک بار وہ بڑا پریشان تھا۔ چند منٹوں کے لئے گھر گیا۔ چائے پی اور بولا۔ "میں ذرا دیر

سے آؤں گا"

اسما نے کچھ نہیں کہا۔

دفتر میں حساب کتاب کرتے کافی دیر ہو گئی۔ رات کے گیارہ بجے تھکا ہارا گھر آیا اسما کھانا لئے بیٹھی تھی۔ کھانا کھلانے کے بعد بولی۔

"کیا آپ کی پریشانی دور ہو گئی ـــــ؟"

"تمہیں کیسے پتہ چلا ـــــ؟" ـــــ "میں نے آپ کے چہرے سے جانا"

علی احمد نے محبت بھری نظروں سے اسکی طرف دیکھ کر کہا۔

"مجھے تم پر فخر ہے اسما، کوئی اور عورت ہوتی تو اس وقت نامعقول سوال کر کے میری زندگی حرام کر دیتی۔ واقعی میں بڑا پریشان تھا ـــــ اب شکر ہے پریشانی دور ہو گئی ـــــ"

یہاں بھی کوئی دفتری پریشانی آپڑی تھی۔ ان دنوں وہ زیادہ وقت دفتر میں لگاتا تھا۔ پہلے تو گھر جاتے ہی ماں بیٹیوں کی تقریر سننی پڑتی سو سو قسمیں کھانی پڑتیں کہ دفتر ہی میں تھا ـــــ پھر شہلا صاحبہ بہ نفس نفیس دفتر میں تشریف لے آتیں اور باہر کار میں بیٹھی رہتیں کہ جب صاحب کا کام ختم ہو جائے تو میں ساتھ لے کر جاؤں گی ـــــ

بیوی شوہر پر اعتبار نہ کرے تو شوہر اپنے تئیں ایک گھٹیا مخلوق سمجھنے لگتا ہے اسی لئے اس نے شہلا کے ساتھ ذرا سختی شروع کر دی تھی۔

سختی سے دونوں ماں بیٹیاں بدک گئی تھیں۔

ماں کو تو سخت فکر لاحق ہو گئی تھی۔ اُس کا خیال تھا چونکہ ابھی تک شہلا کے بچہ نہیں ہوا تھا۔ اس لئے علی احمد ٹھیک طرح پھنسا نہیں۔

سارا دن اسے ڈاکٹروں کے پاس لئے پھرتی ـــــ ٹیسٹ ہوتے رہتے۔

بات یوں ہوئی تھی کہ علی احمد کو اچھی طرح پھنسانے کے لئے شمیم بیگم نے بیٹی کو مکمل ڈھیل دے دی تھی، بلکہ اس قسم کا ماحول پیدا کر دیا کہ علی احمد ہر حد توڑ دے۔ اس کا وہی انجام ہونا تھا ـــــ جو ہوا۔ جب شہلا بی کو حمل ٹھہر گیا تو شمیم بیگم نے بیٹی کی لگامیں کھینچ لیں۔ اور علی احمد پر دباؤ ڈالنا شروع کر دیا۔ ادھر تو یہ ڈرامہ کرتی رہی اور

دوسری طرف بیٹی کا بچہ ضائع کروانے کی تدبیریں کرتی رہی۔ اس کو معلوم تھا کہ ایسا بچہ بدنامی کا باعث بن سکتا ہے۔ اُسے کوئی قبول نہیں کرے گا۔

سو دونوں کام بطریق احسن انجام پاتے۔

لیکن اب جب انہیں بچے کی آرزو تھی تو قدرت ان کی راہ میں حائل ہو گئی تھی۔ ڈاکٹروں سے مایوس ہو کر اب وہ لوگ پیروں فقیروں تعویذ گنڈوں کے چکر میں پھرتے رہتے تھے۔

کوئی دن نہ جاتا جب شمیم، شہلا کو کسی نئے اشتہاری حکیم کے پاس نہ لے جاتی۔ یا کسی نئے پیر سے تعویذ نہ لاتی ـــــ وہ دونوں ماں بیٹیاں اپنی ادھیڑ بن میں لگی ہوتی تھیں۔ جبکہ علی احمد اور ہی قسم کی الجھنوں کا شکار ہو چکا تھا۔ زندگی سے وہ اتنی جلد بے زار ہو جائے گا ـــــ اسے کیا پتہ تھا۔

ایک ذرا سی عیش کے لئے اس نے زندگی کا سارا چلن بدل لیا تھا ـــــ مگر زندگی تھی کہ اس کے ہاتھ میں نہیں آ رہی تھی۔

ادھر شہلا بیگم سمجھ رہی تھی کہ بچہ نہ ہونے کی وجہ سے علی احمد اس طرح بجھا رہتا ہے۔ حالانکہ ابھی تو ایک ہی سال گزرا تھا۔ کوئی ایسے زمانے بھی نہ ہوئے تھے۔

مگر اس کو یہ جنت چھن جانے کا ہمیشہ غم رہتا ـــــ کئی بار وہ رات کو علی احمد سے اُلجھ پڑی تھی۔ اور لڑتے وقت ادب تمیز سب کچھ بھول جاتی تھی ـــــ

"اب آپ کو مجھ سے دلچسپی نہیں رہی ـــــ" "بڈھے سے شادی کر کے تو میرے نصیب پھوٹ گئے ـــــ آپ تو زندگی کی ہر خوشی لوٹ چکے تھے۔ میرے تو ارمان ویسے ہی دھرے ہیں۔"

"شادی ہمیشہ اپنی عمر کے آدمی سے کرنی چاہیئے ـــــ"

"آپ تو تفریح سے بھی تھک جاتے ہیں ـــــ ایسی عمر میں کیا ایسا ہوتا ہے ـــــ"

"اگر آپ جوان ہوتے تو ہر شے میں آپ کو لطف آتا ـــــ ہاں یہ بات آپ کو کیوں اچھی لگے گی ـــــ آپ کی اور میری عمر میں اتنا فرق جو ہے ـــــ ایسا ہی فرق

سوچنے اور سمجھنے میں آ جاتا ہے۔"

"بڈھے سے سر کھپا کے تو میں عاجز آ گئی۔" وغیرہ وغیرہ

کبھی تو علی احمد سُن کر چپ ہو جاتا اور کبھی بُری طرح ڈانٹ دیتا ـــــ ڈانٹنے کے بعد گھر میں وہ طوفان اُٹھتا کہ خود اس کو سب کی منت کر کے دبانا پڑتا ـــــ

لعنت ہے میری عقل پر ـــــ وہ کبھی کبھی سوچتا۔

ایک پڑھی لکھی مہذب اور محترم خاتون کے ساتھ زندگی گزر رہی تھی ـــــ کیسی مزاج دان تھی۔ اور کتنا ادب کرتی تھی ـــــ مجھے کیا ہو گیا تھا ـــــ جو میں اس بیہودہ لڑکی کو پسند کر بیٹھا۔

شہلا کو کسی بات کا قرینہ نہ تھا۔ نہ اٹھنے بیٹھنے کا۔ نہ اوڑھنے پہننے کا ـــــ نہ بات کرنے کا ـــــ بات تو وہ بہت واہیات انداز میں کرتی تھی ـــــ جب بے پھاڑ پھاڑ کر ـــــ اگر اس کا کوئی دوست ملنے آ جاتا تو بڑے بُرے انداز سے ڈرائنگ روم میں آتی ـــــ مسلسل باتیں کئے جاتی ـــــ تنگ قمیض پہنتی اور اپنے جسم کو نمایاں کر کے بیٹھتی اور جب کوئی کہتا وہ علی احمد سے عمر میں بہت چھوٹی ہے تو پھولی نہ سماتی ـــــ اور بھی فضول حرکتیں کرنے لگتی ـــــ

علی احمد نے دوستوں کو گھر بُلانا چھوڑ دیا تھا۔

گھر کے ماحول سے وہ بیزار رہتا تھا۔ دفتر میں اس کا جی نہ لگتا تھا ـــــ وہ کہاں جائے ـــــ؟ سوچ سوچ کے تھک گیا تھا۔ پیچھے جانے کا کوئی راستہ نہ تھا۔ کسی کمزور لمحے میں شہلا نے اس سے قسم لے لی تھی کہ وہ اپنے بچوں سے ملنے بھی اس گھر میں نہیں جائے گا۔

ایک سال ہو گیا تھا اور وہ اپنے بچوں سے نہیں ملا تھا۔ ہاں کبھی کبھی اسے دفتر میں حنا کا فون آ جاتا تھا۔ بڑے پیار سے اس کا حال پوچھ کر اپنی خیریت بتاتی تھی اور یہ بھی کہتی تھی کہ ہر ماہ ان کی ارسال کردہ رقم مل رہی ہے۔ شکریہ ـــــ

وہ کبھی نہ کہتا تھا کہ میں تم لوگوں سے ملنا چاہتا ہوں اور نہ وہ اصرار کرتی تھی اُس

کا اپنے مُنے کو دیکھنے کا دل چاہتا۔ جسے اس نے بیدردی سے ٹھکرا دیا تھا وہ کیا سوچے گا۔ اپنے باپ کے متعلق ـــــ گو اُس کی ماں اپنے سلیقے سے اُسے کچھ نہ کچھ تو بتا دے گی۔ مگر پھر بھی ـــــ

بہت سی پریشانیوں سے گھبرا کر اُس نے کلب جانا شروع کر دیا ـــــ

کلب جانے سے بھی بات نہ بنی تو پینا شروع کر دیا ـــــ

جب پینے لگا تو پچھلی باتیں شدت سے یاد آنے لگیں۔ وہاں تنہا ایک کونے والی میز پر بیٹھا وہ سوچا کرتا۔ یہ کلب کی دنیا باہر سے کتنی چکاچوند ہے۔ مگر اندر سے خالی ـــــ جس طرح شراب پینے کا یہ جام ہوتا ہے ـــــ جب تک اس میں شراب ہو اس کی وقعت ہے ـــــ شراب پی لی جائے تو یہ بے مصرف ہے۔ یہاں کیوں لوگ دل کی لگی بجھانے آتے ہیں؟۔

اس سے گھر کی وہ پُرسکون زندگی بہت اچھی تھی۔ جہاں ایک بیوی اپنے تمام تر خلوص سے آپ کا انتظار کرتی ہے اور رات بھر کے لئے اپنی زلفوں کا سایہ اس طرح تان دیتی ہے کہ دنیا کی دوڑ میں تھکا ہارا مرد دوسرے دن کی تگ و دو کے لئے تازہ دم ہو جاتا ہے۔

وہ معمولی سا گھر ـــــ

وہ معمولی عورت ـــــ چند بچے ـــــ دنیا کی سب سے بڑی نعمت اور سب سے سچی خوشی ہیں۔ باقی سب بہلاوے ہیں ـــــ ٹوٹ پھوٹ جانے والے بہلاوے۔

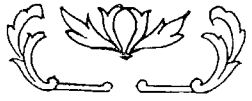

اس روز وہ ہمیشہ سے زیادہ بے چین تھا۔ سُلگ رہا تھا۔ ایک دم اپنے پیارے بچوں کی یاد ستانے لگی تھی ـــــ اس لئے ساری قسمیں توڑ کر اپنے پرانے گھر کی سمت روانہ ہو گیا۔ شام کے پانچ بج رہے تھے۔ اس کی رفتار دھیمی تھی۔ جیسے ابھی سوچ رہا تھا۔ جانا چاہیئے یا نہیں ـــــ لیکن موٹر جیسے اپنی مرضی سے رینگتی چلی گئی ـــــ اسی شاہراہ سڑک پر پچھلے تیرہ سال وہ ہر قسم کے موڈ میں چلتی رہی تھی۔

گھر کے قریب جو بس اسٹاپ تھا۔ اس پر ایک بس آ کھڑی ہوئی۔ اس نے دیکھا اُس سے ایک عورت اور ایک بچی اتری، بچی یقیناً اس کی تھی۔ اُس نے پہچان لیا۔ ہاں خاتون کو پہچاننے میں ضرور دقت ہوئی۔ یہ اگر اس کی ماں تھی تو کتنی بدل گئی تھی۔ ایک دبلی پتلی عورت جس نے لمبے بالوں کی چوٹی باندھ رکھی تھی۔ پھول دار ساڑھی پہنی ہوئی تھی۔ ہاتھ میں شاپنگ کا بیگ تھا۔ لڑکی کے ہاتھوں میں بھی کچھ ڈبے تھے اور دونوں آہستہ آہستہ چلی جا رہی تھیں۔

دُور سے چلتی ہوئی اسما، بالکل وہی پرانی اسما، لگ رہی تھی۔ جب علی احمد اس کی چال پہ اور لمبے بالوں پر مرمٹتا تھا۔ بال بھی ویسے ہی تھے اور چال بھی وہی تھی۔

پھر یہ بیچ میں دیوار کیسی آ گئی تھی۔

اُس نے موٹر ایک جگہ روک لی۔ جب دونوں ماں بیٹیا گھر کے اندر چلی گئیں تو یہ بھی

پیچھے روانہ ہوا ـــــ اُن کی ایک جھلک دیکھنے کے بعد تو اس سے رہا نہ گیا۔ کار گیٹ میں داخل ہوئی ـــــ مگر یہ تو کسی اور کا گیٹ تھا ـــــ

نہیں تھا تو اپنا، لیکن اب کوٹھی میں تبدیلی آ گئی تھی۔ یہ بات جہانے اُسے فون پر بتائی تھی کہ اپنی ساری کوٹھی انہوں نے کرائے پر دے دی تھی۔ اوپر تین کمرے ڈلوا کے وہ لوگ اوپر چلے گئے تھے۔

علی احمد نے کار نیچے کھڑی کر دی۔ سیڑھیاں تلاش کیں اور اوپر چڑھنے لگا ـــــ اوپر کون تھا اس کا ـــــ اس نے دروازہ کھٹکھٹایا ـــــ کھٹ سے کھل گیا ـــــ

سامنے اسماء کھڑی تھی ـــــ اسماء جو کبھی اُس کی تھی ـــــ یوں پھٹی پھٹی آنکھوں سے اس کو دیکھ رہی تھی، جیسے دن دھاڑے بھوت دیکھ لیا ہو ـــــ اور جیسے اسے آنکھوں میں جذب کر لینا چاہتا ہو ـــــ بہت بدل گئی تھی اسماء ـــــ بہت دُبلی ہو گئی تھی۔ چہرے کا رنگ بھی صاف ہو گیا تھا۔ گو چہرہ اب بجھا بجھا تھا۔ مگر وہ اس طرح بھی بہت اچھی لگ رہی تھی ـــــ پھر وہ ایک دم دروازے سے ہٹ گئی۔ اور بچوں کے کمرے میں جا کر بولی ـــــ

"آپ کے ابُو آئے ہیں ـــــ ان سے آ کر ملو" ـــــ "ابُو آئے ـــــ ابُو آئے" سب بچے اس طرح سیڑھیوں کی جانب دوڑے جیسے عید کا چاند نکل آیا ہو۔ جہانے بالکل بچوں کی طرح ابُو کے گلے میں بانہیں ڈال دیں اور اس کے رخسار پر پیار کیا ـــــ پھر صبا اور دعا چمٹ گئیں۔ مُنّا دور کھڑا دیکھتا رہا۔

"اندر آئیں ابُو" جہانا سے کھینچ کر لائی اور ڈرائینگ روم میں بٹھا دیا۔ ڈرائینگ اور ڈائننگ ملحقہ تھا۔ بس ضرورت کے مطابق ـــــ سجاوٹ کا کوئی سامان نہ تھا ـــــ کھانے کے کمرے میں میز کرسیاں اور فرج پڑا تھا ـــــ اور ڈرائنگ روم میں ایک کونے میں اسماء اور علی احمد کی شادی کی تصویر پڑی تھی۔

یہ نشانی کیوں رہ گئی ـــــ وہ سوچنے لگا۔

بچیاں اسے چمٹ گئیں۔ طرح طرح کے سوالات کرنے لگیں۔ وہ ان کے لئے بے شمار تحائف لایا تھا۔ کچھ دیر تو خوب ہنگامہ اور شور و غُل رہا پھر سب سکون میں آ گئے۔ مُنّا ابھی تک دور کھڑا تھا۔

"آؤ بیٹے ہمارے قریب آؤ"۔ مگر وہ کھڑا رہا۔ "منے آؤ ـــــ یہ ہمارے ابُو ہیں"۔ یہ کہہ کر جہانا اُسے بازوؤں سے گھسیٹ کر لے آئی۔ وہ شرماتا ہوا آیا اور اس کے قریب کھڑا ہو گیا۔ خوب صحت مند اور پیارا بچہ تھا۔ علی احمد نے اسے سینے سے لگا لیا۔ "بیٹے اپنا نام بتائیں ـــــ ہم آپ کو اتنا بڑا جہاز دیں گے"۔

علی احمد نے ڈبے میں سے جہاز نکالا۔ مُنّا ایک دم کھِل اٹھا۔ بولا۔

"میلا نام ہے ـــــ احمد علی"

"احمد علی ـــــ جیسے نام علی احمد کے حلق میں اٹک گیا۔ اُس نے مُنّے کو جہاز پکڑا دیا۔ اُسے خوب یاد تھا مُنّے کی پیدائش پر اسماء نے کہا تھا ـــــ "دیکھیں تو یہ ہو بہو آپ کی تصویر ہے"۔

"پیارا ہے نا میرا مُنّا ـــــ" "پتہ ہے مَیں نے اُس کا کیا نام رکھا ہے"۔

"کیا ـــــ؟" "احمد علی ـــــ!"

"یہ کیا نام ہوا۔ تم نے میرا نام ہی الٹ دیا ہے"۔ "میرے لئے تو دنیا میں علی احمد سے اہم کوئی نام ہی نہیں ہے اور یہی نام مجھے اچھا لگتا ہے۔ اس لئے میں نے بیٹے کا نام احمد علی رکھ دیا ہے۔ آپ کو لوگ علی بلاتے ہیں۔ ہم اسے احمد بلائیں گے۔ لیکن احمد اور علی ہر دم میری جان کے ساتھ رہیں گے ـــــ میری زندگی اسی محور کے گرد گھومتی رہے گی"۔

تو یہ احمد علی تھا جس کا اسماء کو بہت ارمان تھا اور جس نے آ کر اس کا علی اُس سے چھین لیا تھا۔ برتن بجنے کی آواز آئی تو اُس نے نظر اٹھا کر دیکھا۔ اسماء میز پر چائے کے برتن لگا رہی تھی۔ وہ اسے دیکھتا رہا۔ وہ مغموم عورت کتنی اچھی لگ رہی تھی۔ وہ نظر اٹھا کر بالکل نہیں دیکھ رہی تھی۔ جیسے یہ ظاہر کرنا چاہتی ہو کہ اسے اس کی مدد کی کوئی پرواہ نہیں ہے۔ یا وہ ہر تمنا اور خواہش سے بالا ہو چکی ہے۔

وہ اس کے چہرے کو پڑھنے لگا۔

پختہ عمر کی عورت ایک ایسی کتاب کی مانند ہے۔ جس کو پڑھتے جاؤ تو تنہائی سنورتی جاتی ہے۔ اس نے دوسرے کمرے میں جاکر حنا کو پکارا۔ اور بولی۔ "ابو کو چائے پلاؤ"

حنا چائے بنا کر لائی۔ ساتھ کیک اور بسکٹ بھی تھے۔ کتنا لطف آیا تھا یہ چائے پی کر شاید اسماء باورچی خانے میں برتن دھو رہی تھی۔ کوئی نوکر بھی نہیں تھا اُن کے ہاں وہ اٹھ کر گھر دیکھنے لگا۔ دو چھوٹے چھوٹے بیڈ روم تھے۔ ایک بچوں کا، ایک اسماء کا

اسماء کے بیڈ روم میں وہی ڈبل بیڈ پڑا تھا۔ ساتھ مُنّے کی کاٹ لگی ہوئی تھی سائیڈ ٹیبلوں پر ویسے ہی ایک طرف علی احمد کی تصویر پڑی تھی۔ دوسری طرف اسماء کی ——

وہ بے اختیار اس پلنگ پر لیٹ گیا۔ آنکھیں موندے سو رہا تھا یا رو رہا تھا جب اسماء نے دھیرے سے حنا کو پکارا۔ اور بولی۔ "ابو کے جوتے کھول کر اُن پر کمبل ڈال دو۔ اُن کو سونے دو۔ شور نہ مچاؤ —— میں ذرا زرینہ کے ہاں جا رہی ہوں"

علی احمد نے سب سُن لیا تھا۔ عورت کی وفا شعاری کا یہ نیا روپ سامنے تھا۔ وہ پہلے بھی دفتر سے آکر اس طرح سو جایا کرتا تھا اور اسماء ہمیشہ اس کے جوتے کھول کر اس پر کمبل ڈال جایا کرتی تھی ——

اس نے سر اٹھا کر دیکھا اسماء دروازے میں کھڑی تھی۔ اس نے رحم طلب نظروں سے اسماء کو دیکھا۔ وہ جلدی سے منہ پھیر کر چل دی اُس کا دل چاہا اُٹھ کر دنیا کی اس خوبصورت ترین ہستی کو سینے سے لگا لے۔ مگر واہ رے قسمت —— ! اتنی ننھی سی خواہش کی راہ میں قانون و شریعت کی آہنی دیوار کھڑی ہو گئی۔ اسماء نے تو بہت منت کی تھی۔ یہ آخری دھاگا اُس نے خود توڑا تھا۔

دُور تو نہ تھی اسماء —— چند قدموں کے فاصلے پر تھی۔ پھر وہاں سے چلی گئی۔ اُس نے تھوڑی دیر بعد سیڑھیوں پر سے حنا کو آواز دی، حنا دوڑ کر گئی، تو وہ اپنے آنسو پونچھ رہی تھی بولی۔

"بیٹی میں ذرا نیچے آنٹی زرینہ کے ہاں جا رہی ہوں تم اپنے ابو سے کہہ دینا کہ وہ تم لوگوں سے ملنے یہاں نہ آیا کریں، بلکہ کہیں اور بُلا کر تم سے مل لیا کریں ——"

"امی آپ کیوں رو رہی ہیں ——؟" "بس تم جاؤ" حنا وہاں سے بھاگ آئی —— واپس آئی تو علی احمد کے آنسو تکیے پر گر رہے تھے۔

"ابو آپ رو رہے ہیں؟" اس نے حیرت سے پوچھا۔ اُدھر امی رو رہی ہیں۔ اِدھر آپ رو رہے ہیں۔ آپ دونوں کو کیا ہُوا ہے؟" "بیٹا مجھے تمہاری امی یاد آتی ہیں تو میں روتا ہوں"

"مگر امی دُور تو نہیں ہیں۔ آپ ان کو اپنے پاس لے جائیں"۔ تمہاری ماں سے دُور رہنے کی سزا اپنے آپ کو میں نے خود ہی دی ہے بیٹا! اس میں کسی کا قصور نہیں"۔

دروازے کی اوٹ میں سے صرف اسماء نے اتنا سنا۔ آنسوؤں کا ایک نیا دھارا پھوٹا اور اس کے رخسار بھگو گیا۔ وہ سنبھال سنبھال کر قدم رکھتی —— نیچے اُترنے لگی —— آنسوؤں سے آنکھیں دھندلا رہی تھیں۔

غم سے کلیجہ پھٹ رہا تھا۔ مگر ایک لذت بھی حاصل ہو رہی تھی —— عجیب سی روحانی لذت —— علی احمد بھی بے سکون تھا —— وہ بھی تباہ حال تھا —— ویران تھا ——

او ساربان —— تُو نے خود اونٹوں کی مہار چھوڑ دی —— او ساربان، —— تُو نے خود قافلے کو بھٹکنے کے لئے چھوڑ دیا۔ —— او ساربان —— جلتی سلگتی ریت میں تیرے قدموں کے نشاں بھی مٹ گئے —— میں بس گھنٹیاں بجاتے قافلے کو لیکر باؤلی باؤلی ہر رہگذر پہ دیپ جلاتی رہی —— او ساربان —— تو نے یہ کیا کر دیا۔؟ او ساربان —— تو نے یہ کیا کر دیا ——؟ آنسو پونچھتی وہ جلدی سے زرینہ کے کمرے میں گھس گئی اور اندر سے کنڈی چڑھا لی۔

"ابو امی کہتی ہیں —— آپ یہاں نہ آیا کریں ——" حنا لہک لہک کر علی احمد کو اسماء کا پیغام دے رہی تھی۔

"آپ کی امّی نے ایسا کیوں کہا بیٹیا ـــــ ؟" "اس لئے کہ ـــ بتا دوں ـــ"
ہاں ہاں بتا دو ـــــ"

"اس لئے کہ امّی نے تو یہاں سب سے کہہ رکھا ہے کہ آپ سعودی عرب چلے گئے ہیں اور وہاں سے خوب ڈھیر سارا روپیہ بھیجا کرتے ہیں ؟"

"آپ کی امّی نے ایسا کیوں کیا ـــ" امّی کہتی ہیں کسی کو یہ مت بتانا کہ آپ کے ابّو نے مجھے طلاق دے دی ہے۔ لوگ ہماری عزت کرنا چھوڑ دیں گے۔ اور پھر جن لڑکیوں کو باپ چھوڑ کر چلا جائے ـــ اُن کی ـــ اُن کو ـــــ بھتی ان کو کوئی نہیں پوچھتا۔"

"اور پھر حنا بولی۔ "ہم کسی کو نہیں بتاتے کہ ہمارے ابّو اس شہر میں رہ کر ہم سے نہیں ملتے۔ ہم کہتے ہیں۔ وہ سعودی عرب چلے گئے ہیں۔ اگر آپ یہاں آنے لگے تو ہمارا بھانڈہ پھوٹ جائے گا۔"

علی احمد جانتا تھا کہ بھانڈہ پھوٹنے کے ڈر سے نہیں، دل کی جولانیوں سے مجبور ہو کر اسماء نے اسے یہاں آنے سے منع کیا ہے۔"

"آپ کی امّی کہاں گئی ہیں"۔ "زرینہ آنٹی کے ہاں گئی ہیں"۔ "کون زرینہ آنٹی"۔
"یہ جو نیچے ہمارے کرایہ دار ہیں۔ بہت اچھے لوگ ہیں۔ ہمارا بہت دھیان رکھتے ہیں ـــــ"

"آپ نے اپنا مکان کرائے پر کیوں دے دیا"۔ "امّی کہتی تھیں مجھے اس گھر میں رہنے سے وحشت ہوتی ہے۔ پھر ایک ہزار روپے میں ہمارا گزارہ بھی نہیں ہوتا تھا۔ اس لئے اوپر انیکسی بنوا کر ہم اوپر آ گئے اور نچلے حصّے کو دو ہزار روپیہ ماہانہ پر دے دیا ہے۔"

"اور وہ آپ کے ایئر کنڈیشنر وغیرہ کیا ہوئے"۔ علی احمد نے کمرے میں چاروں طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"وہ بھی زرینہ آنٹی نے خرید لئے تھے۔ امّی کہتی ہیں۔ جن بچّوں کو بچپن سے ناز نخروں کی عادت پڑ جاتے۔ وہ بڑے آدمی کبھی نہیں بن سکتے۔ اس لئے زندگی بہادروں کی طرح گزارنی چاہیئے۔"

"اچھا بھتی تم بڑی ہو کر کیا بننا چاہتی ہو"۔ علی احمد نے حنا سے پوچھا۔

امّی کہتی ہیں تم بڑی ہو کر وکیل بننا تاکہ عورتوں کے حقوق کے لئے لڑ سکو۔"

"اور تم" اس نے صبا کی طرف دیکھا۔

"میں ڈاکٹر بنوں گی۔ امّی کہتی ہیں۔ اس طرح انسانیت کی خدمت کرنے کا موقع ملے گا۔"

"اور وفا تم" اس نے وفا کی طرف دیکھا۔ "میں پروفیسر بنوں گی۔ امّی کہتی ہیں۔ عورتوں کو اپنا بوجھ اٹھانے کے قابل ہونا چاہیئے۔"

یہ اس اسماء کے خیالات تھے۔ جس نے ایم۔ اے کر کے شادی کر لی تھی اور جو کہتی تھی لڑکی کی معراج اس کا گھر ہے۔ اور جب سے لڑکیاں پیدا ہوئی تھیں۔ وہ برابر کہے جا رہی تھی کہ میٹرک کرتے ہی وہ ان کی شادیاں کر دے گی۔

زیادہ پڑھا کر ان کی عمر برباد نہیں کرے گی۔

اس نے اپنے طرزِ عمل سے اسماء کا فلسفۂ حیات ہی بدل دیا تھا۔

"اور یہ صاحب کیا بنیں گے"۔ اس نے مُنّے کو پیار کرتے ہوئے کہا۔ "میں" مُنّا کھڑا ہو گیا ـــــ "وکیل بنوں گا ـــــ" اور سب ہنس پڑے ـــــ

"پتہ ہے ابّو یہ کہہ رہا ہے میں جج بنوں گا۔ کیونکہ امّی کہتی ہیں ـــ میں اپنے مُنّے کو جج بناؤں گی۔ تاکہ دنیا میں انصاف کا بول بالا ہو" ـــــ آہ اسماء۔

میں نے تمہارے نازک سے دل سے کیا کر دیا ہے ـــــ ؟ مگر اب کیا ہو سکتا ہے؟

آپ کی امّی کیا کرتی ہیں بیٹیا ـــــ ؟

"ابّو انہوں نے بینک میں نوکری کر لی ہے وہ کہتی ہیں۔ میرا دل بھی لگا رہتا ہے۔ اور گزارہ بھی اچھا ہو جاتا ہے۔

"آپ لوگ سکول کیسے جاتے ہیں"۔

"صبح بس میں جاتے ہیں۔ پہلے پہلے تو تکلیف ہوتی تھی۔ پھر امّی نے کہا ـــ بسوں میں سکول جانے والے بچّے۔ ان بچّوں سے اچھے ہوتے ہیں۔ جو موٹروں میں جاتے ہیں۔ کیوں کہ ہمیں مشاہدہ کرنے کو بہت کچھ ملتا ہے ـــــ اس لئے ہم زیادہ ذہین ہیں۔"

علی احمد سوگواری سے ہنسا۔

بڑی عظیم عورت ہے۔ اسماء ـــــ وہ کبھی بچّوں کے ذہن میں غلط بات نہیں ڈالے گی ـــــ رسمِ وفا نبھائے گی۔ آخر تک ـــــ "بیٹا اب میں جاؤں ـــــ" وہ کھڑے ہو کر بولا ـــــ

"آپ پھر کب آئیں گے ابو ـــــ؟" "ہمارا دل بہت اداس ہوتا ہے۔" وفا نے کہا ویسے امّی نے کہا تھا۔ ابّو سے ایسی کوئی بات نہ کرنا۔ مجبور کر کے کوئی بات نہیں منوانی چاہیئے۔ علی احمد نے تینوں بچّیوں کو ایک ساتھ سینے سے لگا لیا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے ـــــ اس کا دل چاہا ـــــ اسماء سامنے ہو تو آج وہ اس کے قدموں سے لپٹ جائے۔ بلک بلک کر روئے۔ بالکل اس طرح جس طرح وہ سال پہلے اس کے قدموں پر گر رہی تھی۔ اپنے گناہوں کی معافی مانگ لے۔ مگر اسے معلوم تھا کہ اسماء اس بات کا بھی موقع نہیں دے گی ـــــ اسماء بڑی غیرت مند عورت تھی۔ غیرت مند عورتیں وفا شعار بھی ہوتی ہیں ـــــ"

یہ سزا کیا کم ہے ـــــ کہ وہ میرے نام پر اپنی ساری زندگی گزار دے گی ـــــ میں نے اسے کیا دیا ـــــ تنہائی، کرب ـــــ بے وفائی کا چرکہ ـــــ اور ہجر کی طویل رات ـــــ

ایک رات خالہ بلقیس ہانپتی کانپتی آ گئیں اور بولیں۔ بیٹا کچھ اور سنا ـــــ" اسماء بالکل سننے کے موڈ میں نہیں تھی۔ پھر بھی ادب سے بولی۔ "سنائیے خالہ۔"

"علی احمد کہیں روپوش ہو گیا ہے ـــــ"

"روپوش ـــــ؟ کہاں ـــــ؟" اسماء نے کلیجے پر ہاتھ رکھ لیا۔ اس کے بچّوں کا باپ جہاں ہو سلامت ہو ـــــ

"بھئی میں نے تو آج ہی یہ قصّہ سنا ہے۔ علی احمد کہیں چلا گیا ہے اور جاتے جاتے شہلا کو طلاق دے گیا ہے" اسماء سوچنے لگی۔ وہ کہاں گیا ہے؟"

لیکن اس کو اب کیا حق پہنچتا ہے۔ وہ اس کے بارے میں باز پُرس کرے یا اس کے رشتہ داروں سے پتہ کروائے ـــــ اُس کی خبر کس نے لی تھی۔

اس کی بربادی کی خبر سنی تو سب نے تھی۔ مگر کون آیا تھا زخموں پر مرہم رکھنے ـــــ؟

ٹھیک پندرہ دن کے بعد حِنا کے نام ایک خط آیا۔

"بیٹی حِنا۔

میں نے خود اپنے لئے ایک سزا تجویز کی اور تم سب سے دور چلا آیا ـــــ میں نے تمہاری ماں کی کسی خواہش کا احترام نہ کیا تھا۔ اس لئے اب سعودی عرب چلا آیا ہوں۔ میں یہاں بیٹھ کر ساری زندگی تم لوگوں کی خدمت کروں گا ـــــ اور تم لوگوں کو بھی

زمانے سے جھوٹ نہیں بولنا پڑے گا بیٹا۔!
مَیں آتے ہوتے کار در گشاپ میں دے آیا تھا۔ جب ٹھیک ہو جائے گی۔ تو
تمہارے پاس پہنچ جائے گی ـــــ بلاشبہ تم سب بہت ذہین اور انوکھے بچے ہو۔
مگر اب کار پر اسکول جایا کرنا ـــــ

صبا۔ وفا اور احمد علی کو میرا پیار دیں۔
تمہارا ابُو"

... شکستِ عہدِ وفا!

"مَیں پیا کے من بانی نہ مانی، پیا میرے من مانا ہے
لوک کہے میں بَوری بَوری، میں بھائے لوک دِوانا ہے
لِکھ لِکھ چیریاں شوہ پے بھیجاں، رو رو حرف پچھانا ہے
کہے حُسین فقیر سائیں دا، جنگل جائے سمانا ہے"

(شاہ حُسین رحمۃ اللہ علیہ)

ایک ننھا سا فقرہ انسان کی زندگی میں کتنا زہر گھول سکتا ہے۔ اس کا فری کو کیا اندازہ ہو سکتا تھا۔ جب کہ اس غریب نے یہ فقرہ کہا بھی نہیں تھا بلکہ سُن کر بھی ایک بچگانہ سی خوشی محسوس کر کے خاموش ہو گئی تھی۔

پانچ سال پیشتر جب ہر نوجوان لڑکی کی مانند اپنی آرزوؤں اور اپنے ارمانوں کی پالکی سجا کر وہ جمال کی دلہن بنی تھی تو سب لوگ اسے دلہن بنا دیکھ کر عش عش کر اٹھے تھے۔ وہ سادہ سی بے پرواسی نازک اندام لڑکی اتنا روپ کہاں سے چرا لائی ہے؟ مگر اس نے تو جیسے سارا روپ مہندی اور ابٹن میں چھپا رکھا تھا۔ اُدھر ابٹن کی رسم شروع ہوئی اور اُسے مائیوں بٹھایا گیا، ادھر اس کا رُوپ روز بروز سنورنے لگا نکھرنے لگا جس روز وہ دلہن بنی تھی، کوئی آنکھ نہ تھی جو اس کی بلائیں نہ لے رہی ہو اور کوئی دل نہ تھا۔ جو رشک سے سرشار نہ تھا۔ سب ہی جمال کی خوش بختی کا تذکرہ کر رہے تھے اور فری کو خوش و خُرم رہنے کی لاتعداد دعائیں دے رہے تھے۔ واقعی جب جمال نے اس کا گھونگھٹ اٹھایا تو بس دیکھتا ہی رہ گیا۔ جیسے کہ خدائے لازوال نے فرصت کے کسی خوبصورت لمحے میں اسے بڑی محبّت سے بنا سنوار کر بھیجا ہو۔ ہر نقش اپنی جگہ درست اور موزوں نکھار ایسا کہ دل مستی میں ڈوب ڈوب جائے۔ مسکراہٹ ایسی کہ بار بار نثار ہونے کو جی چاہے یہی وجہ تھی کہ پہلی رات جمال کی زبان گنگ ہو گئی۔ اس نے بہت کم باتیں کیں۔ بہت

کم سنا اور کہا۔ . . . اپنی قسمت پہ نازاں رہا۔ اس کی دلہن اس کے ہر تصوّر سے زیادہ حسین تھی۔ وہ شرم و حیا کے بندھن میں ایسی بندھی تھی کہ کہہ نہ سکی کہ اس والہانہ پن کو زبان تو دو۔ بس یوں جیسے خاموشی ہی خاموشی میں اُن کہے الفاظ کے ساتھ دونوں میں ایک سمجھوتہ ہوگیا۔

ایک دِل مدّت سے منتظر تھا۔ حنائی ہاتھوں اور کیف آگیں آنکھوں کا — دوسرا دِل انتظار کی اس چوکھٹ میں بالکل فٹ ہوگیا، سماگیا۔ پھر کسی اقرارنامے کی ضرورت ہی نہ رہی، ایک ہی تو رات گزری تھی۔

اُف اللہ، صبح جب دھنگھار کر کے اور خوشبوؤں میں نہا کر اپنے کمرے سے نکلی تو ایسا نکھار تھا اُس پہ، ایسا جوبن تھا کہ آنکھ نہ ٹکتی تھی۔ وہ یوں لگ رہی تھی۔ جیسے کلی چٹک کر پھول بن گئی ہو، پھول بھی ایسا کہ گلشن میں ہر ایک کی توجہ کا مرکز۔

مہمانوں کے رخصت ہو جانے کے بعد جب وہ اپنی ایک سہیلی کا سہارا لئے اپنے کمرے میں جا رہی تھی تو اس کی سہیلی رشک کے مارے اس کے بے پناہ روپ کا تذکرہ بار بار کر رہی تھی۔ رُوپ کی طرح اُس کی مُسکراہٹ بھی نہ سنبھالی جا رہی تھی۔ وہ کیا کہتی بھلا؟ اُسے تو اب تک جی بھر کر آئینہ دیکھنے کی فرصت بھی نہ ملی تھی اس نے اپنا جو کچھ بھی دیکھا تھا بس جمال کی آنکھوں میں ہی دیکھا تھا وہ آنکھیں جو اس کو دیکھ کر پھیل جاتیں، مُسکرا اٹھتیں نثار ہونے لگتیں اور پھر بے تابی کی سُرخی انہیں دیوانگی کی اسٹیج پر لے آتی تھی۔ دیوانگی۔ جس کے بعد وہ آنکھیں موند لیتی اور سانس روک لیتی تھی۔

"ہائے فری، تمہارا شوہر تو تمہارے سامنے کچھ بھی نہیں ہے۔ شکل سے نرا احمق لگتا ہے۔ ویسے تمہیں پا کر کچھ اور پاگل ہوگیا ہے۔ دیکھنا ساری زندگی تمہارے پاؤں دھو دھو کر پیئے گا۔"

بظاہر یہ فقرہ کوئی ایسا زہر ملا بھی نہ تھا۔ ایک معصوم سی سہیلی خوشی کے ان آفاقی لمحوں میں دوسری سہیلی کے حضور محبت اور خلوص کا نذرانہ پیش کر رہی تھی۔ کسی کی تضحیک منظور نہ تھی۔ نہ ہی طعنے کا موقع تھا۔ پھر اس عمر میں بچیاں ناتجربہ کار ہوتی ہیں۔ الفاظ کے

صحیح و غلط استعمال کے اثرات سے بالکل بے خبر — مگر نہ معلوم اس گھڑی کس موڈ میں تھا۔ وہ اپنے کمرے میں بیٹھا فری کا انتظار کر رہا تھا۔

انتظار اور بے تابی . . . . وہ والہانہ پن جس کو اس نے تہذیب کے پردوں میں چھپا رکھا تھا، یہ سب جانے ایک دم کہاں چلا گیا۔ اُسے ایسے لگا۔ جیسے فری کی سہیلی کھلم کھلا اس پہ چوٹ کر رہی ہے اور کہہ رہی ہے تم اتنی خوب صورت بیوی کے اہل ہی نہ تھے۔ دوسرے لفظوں میں وہ اس کی بیوی کو ورغلا رہی تھی تاکہ وہ اپنے شوہر کے ساتھ کتوں والا سلوک کرنا شروع کر دے۔

نہ جانے اس نے ایسے قصّے سُن رکھے تھے یا اس کے لاشعور میں کوئی احساسِ کمتری تھا ورنہ جہاں تک شکل و صورت اور شخصیت کا تعلق ہے وہ بہت جاذبِ نظر اور اسمارٹ آدمی تھا۔ فری نے اس کو دیکھتے ہی بہت پسند کیا تھا۔ اس میں مردانہ وجاہت بہت زیادہ تھی۔ یوں رنگ اس کا پکا سانولا تھا اور فری کو ہمیشہ سانولے رنگ کے آدمی بھاتے تھے۔ نمکین نمکین اور دل میں اُتر جانے والے گورے چٹے اور بہت خوبصورت مردوں سے اُسے ہمیشہ چڑ تھی۔ مرد کی شخصیت میں وقار اور وجاہت ہونی چاہیئے اور بس — اور جمال اس کے خیال پر پورا اُترتا تھا۔ اس لئے وہ اُسے پا کر بہت سرشار تھی۔ اس پر اپنی جوانی کی تمام رعنائیاں اور محبتیں نچھاور کر دینا چاہتی تھی اور اس کی تمام تر توجہ کو حاصلِ زندگی بنا لینا چاہتی تھی۔

دونوں سہیلیاں ہنستی ہوئی جب بیڈ روم میں داخل ہوئیں تو جمال احتراماً کھڑا ہو گیا۔ فری نے شرما کر نظریں چرالیں اور سہیلی نے تیکھی نظروں سے جمال کی جانب دیکھا ایک عام اور پیاری سی حرکت تھی یہ بھی ۔۔۔ لیکن اس ایک لمحے میں جمال نے فری کی خوبصورت اور معصوم آنکھوں میں رعونت اور بے نیازی کی بجلیاں کوندتی ہوئی محسوس کر لیں اور اس کی سہیلی کی شریر نظر اُسے ایک تازیانہ بن کر لگی۔

وقت تو گزر گیا مگر ایک زہریلا ناگ پہلو سے اُٹھا اور چپکے سے جمال کے لاشعور میں گھس گیا۔ جس کا خود اسے بھی علم نہ ہوا۔ اس کے بعد بے شمار دن مہمانوں کے ساتھ، دعوتوں میں اِدھر اُدھر گھومتے ہوتے گزر گئے۔ ان دونوں کو رات کے سوا بہت کم باتیں کرنے کا موقع ملتا۔ رات کو بھی بارہ ایک بجے جان چھوٹتی جب دونوں بے حد تھکے ہوتے۔

یہاں پر شادیاں کس قدر تھکا دینے والی ہوتی ہیں۔ فری سوچتی، اور دلہا دُلہن کو تو بالکل انسان نہیں سمجھا جاتا۔ جس کی دعوت رد کر دو، وہ خفا اور جس سے خوش گپیاں کرو وہ غلط تاثر پھیلانے میں آگے۔

تاہم رفتہ رفتہ حالات معمول پر آ گئے۔ شور و غل، گہما گہمی، آؤ بھگت کے دن بیتے تو وہ جمال سے اجازت لے کر اپنی امّی کے یہاں رہنے آ گئی اس سے پیشتر صرف ایک مرتبہ

رشما ایک رات کے لئے آئی تھی اور وہ ایک رات بھی ہنگاموں کی نذر ہو گئی تھی۔ اب وہ یہاں ایک مہینہ رہنے کا پروگرام بنا کر آئی تھی۔ جمال سے اس نے کہا کہ وہ بھی ساتھ چلے مگر اس کی چھٹیاں ختم ہو چکی تھیں اس نے کہا "میں شام کو آ جایا کروں گا۔ وہاں رہ نہیں سکتا۔"

فری نے مجبور نہ کیا یہ سوچ کر کہ ملازمت پیشہ مرد کو اس کی مرضی کے خلاف مجبور نہیں کرنا چاہیئے۔ اگر جا سکتا تو ضرور چلا جاتا۔ نئی نئی شادی میں بھی کہیں مرد نے بہانہ گھڑا ہے۔ مگر جمال شاید یہ چاہتا تھا کہ وہ تھوڑا سا منہ پھلائے، خفا ہو اسے ساتھ چلنے کے لئے اپنی جان کی قسم دے تو وہ راضی ہو جائے۔ دفتر تو وہاں سے بھی جایا جا سکتا تھا۔ سادہ لوح فری کی تربیت اس ڈھنگ سے نہیں ہوئی تھی۔ سچ کو سچ کہتی اور جھوٹ کو جھوٹ، فریب اور مکاری اس کے قریب سے نہیں گزرے تھے۔ لاگ لپٹ اس کو نہ آتی تھی اور پھر اُس کی عمر ہی کیا تھی؛ بیس سال، وہ بھی گھر کی چار دیواری میں بیتے ہوئے، یوں بھی شوہر کو آقا سمجھتی تھی اور اس زمانے میں حجاب اور بے زبانی کی روایات برقرار رکھے ہوئے تھی دھڑکتے دل کی قسم کھا کر نہ کہہ سکی کہ اب تمہارے بنا ایک رات بھی نہ بیت سکے گی وہ خاموش ہو رہی، اور جمال کے ذہنی ناگ نے پھن اُٹھا کر کہا۔

"خوبصورت لڑکیاں بہت مغرور ہوتی ہیں اسے تو تیری پروا بھی نہیں ۔۔۔ جانتی ہے کچے دھاگے سے بندھے چلے آؤ گے" یہی وجہ تھی کہ وہ پہلے دن شام کو فری سے ملنے نہیں گیا۔

توبہ وہ شام اور وہ رات فری نے کس قدر کرب میں گزاری؛ کوئی کال بیل بجاتا تو اس کا دل اچھل کر حلق تک آ جاتا۔ تڑپ کر یوں دروازے کی طرف دیکھتی، جیسے ابھی محبت کی خوگر وہ نگاہیں، جو اس کے دل میں اُتریں گی، تو وہ بے اختیار ان میں سما جائے گی اس نے اتنی بار بار باہر دروازے کی جانب دیکھا کہ اس کی بڑی بہنوں اور بہنوئیوں نے باقاعدہ اسے تنگ کرنا شروع کر دیا ۔۔۔ ابھی یہ حال ہے ۔۔۔ لیلیٰ کی جگہ مجنوں بنی بیٹھی ہو۔" مگر اسے ان کی یہ چھیڑ چھاڑ ذرا بھی بُری نہیں لگ رہی تھی۔ حقیقت تو حقیقت ہوتی ہے نا؛

اور پھر شوہر سے پیار کرنا معیوب بھی نہیں۔ مگر وہ دشمن جاں نہ آیا۔ گھر پر فون نہیں تھا۔ جو اُسے کر لیتی۔ بدگمان ہونا اسے آتا نہیں تھا یہ سوچ کر کہ کوئی بہت بڑی مجبوری ہو گئی ہوگی، چپ ہو رہی، مگر تمام رات انگاروں پر بیت گئی اور خود پر خود ہی حیران ہوتی رہی کہ ایک اجنبی صرف ایک مہینے کے اندر اندر اُس کا سب کچھ کیسے بن گیا۔ واقعی یہ شادی کتنی عجیب شے ہے۔ سالوں کے رشتے ایک دم توڑ ڈالتی ہے۔ اب اُسے سمجھ آ رہی تھی کہ اس کی سہیلیاں اور بہنیں اور کزنز وغیرہ شادی کے بعد زیادہ عرصہ اکیلے کیوں نہیں ٹھہرتی تھیں۔ کبھی بچّوں کے دل نہ لگنے کا اور کبھی میاں کی تکلیف کا بہانہ کر کے کیوں چل دیتی تھیں — وہ اپنے دل ناصبور کو سمجھاتی رہی اور ذہن میں ان نہایت خوبصورت باتوں کو جمع کرتی رہی جو وہ جمال سے کہنے والی تھی۔ اس کرب انگیز بے خواب رات کے لمحے لمحے کا حساب وہ اسے بتانا چاہتی تھی۔ رات گئے تک اُس کی آہٹوں کی منتظر رہی جیسے الف لیلوی شہزادہ خیالوں کی ہر کمند پھلانگ کر اس کے بستر پر پھول سجانے آ جائے گا — جانے کب کروٹیں بدل بدل کر وہ نور کے تڑکے سو گئی۔

لیکن اگلی شام جب وہ دِل میں انتظار کے دیپ جلائے بیٹھی تھی۔ اس کی کچھ سہیلیاں آ گئیں۔ سہیلیاں بھی کالج کے زمانے کی — بے تکلف اور نڈر — پھر تو ڈرائینگ روم میں وہ قہقہے بلند ہوئے کہ اللہ کی پناہ — چائے کی پیالیاں کھنکنے لگیں، شور و غل بپا ہوا اور پھر اچھا خاصا ڈرائینگ روم، کلاس روم بن گیا۔ ان کے بیساختہ ریمارکس اور چست فقروں پر وہ تحاشا ہنس رہی تھی۔ جب ڈرائینگ رُوم کے دروازے میں جمال نمودار ہوا۔ سنجیدہ اور چپ چپ، لمحہ بھر کو کلاس رُوم پھر ڈرائینگ روم بن گیا۔ خاموشی چھا گئی۔ وہ جہاں بیٹھی تھی، وہیں بیٹھی رہ گئی۔

ہائے وہ تو دوپہر سے روٹھی رانی بنی، اس کے پسندیدہ کپڑے پہنے بیڈ روم میں بیٹھی تھی۔ اس نے سوچا تھا آج شام تک وہ باہر نکلے گی۔ کیونکہ جمال کے آنے پر وہ دوڑ کر اس کے سینے سے لپٹ جانا چاہتی تھی اپنے چہرے کو اس کی گردن میں چھپا کر اپنے بازوؤں کے ہالے سے واضح کر دینا چاہتی تھی کہ رات اس نے کس طرح بسر کی مگر وہ

کب اور کس طرح آ گیا وہ سہیلیوں کے سامنے جھوٹ موٹ روٹھ کر اس کے کل کی بیدردی کی سزا بھی نہ دے سکی۔ بس پیالی تپائی پر رکھ کر مسکراتی ہوئی اُٹھی اور اپنی سہیلیوں سے اس کا تعارف کرانے لگی۔

اس وقت بھی سہیلیوں کا خلوص اس کی زندگی کے آڑے آنے لگا۔ جب سب سہیلیوں نے باری باری اُس کے حسن اور اس کے خلوص کے گن گانے شروع کر دیئے۔ "جمال بھائی آپ بڑے خوش قسمت ہیں آپ کو اتنی پیاری دُلہن ملی ہے"۔ "جمال بھائی، واقعی آپ بڑے لکی ہیں یہ ہمارے کالج کی بیسٹ گرل ہوتی تھی"۔ "جمال بھائی، آپ پر رشک آتا ہے خدا کی قسم بڑی ہی خوش اخلاق اور ذہین لڑکی ہے"۔

"جمال بھائی، آپ کو تو اس کی پوجا کرنی چاہیئے"۔

"اور کیا خراب بھی کرتے ہوں" ایک شرارت سے بولی۔

"اگر پوجا نہیں کرتے تو کیا یونہی باولے بنے پھرتے ہیں۔ پیچھے پیچھے"۔ ایک اور شوخی سے بولی۔

اور جمال بھائی۔ . . .

اور جمال بھائی۔ . . .

اور بیٹھے بیٹھے جمال کے ذہن کا ناگ سرسرانے لگا۔

"ہوں اگر میں خوش قسمت ہوں تو اس لونڈیا کی وجہ سے، اور میرے اندر کوئی خوبی نہیں"

"اور میری پیدائش کا مقصد صرف اس کے تلوے چاٹنا رہ گیا اونہہ"۔ اس نے کھوری نظروں سے فری کی طرف دیکھا وہ شرما کر اپنے سرخ ناخنوں سے پیالی کے کنارے پکچریں بنا رہی تھی۔

"تبھی یہ اس قدر مغرور اور بے نیاز ہے"۔

جب مجمع چھٹا تو وہ کمرے میں آئے وہ دھڑکتے دل کے ساتھ ابتداء کا انتظار کرتی رہی تاکہ پھر وہ بھی اپنے دل کا غبار ہلکا کرے۔ مگر ادھر سے ابتداء ہی نہ ہوئی جیسے جمال کے ذہن میں کوئی کشمکش ہو رہی تھی۔ ویسے تو وہ بے تاب تھا اور آج رات یہاں رہنے

کا تہیہ کر کے آیا تھا۔ مگر اب اس کا دل چاہ رہا تھا وہ اس لڑکی کو سزا دے۔ خوبصورت اور معزز ہونے کی سزا جو اس کا انتظار کرنے کی بجائے سہیلیوں کے ساتھ قہقہے لگا رہی تھی۔ منہ پھلا کے نہیں بلکہ سنگار کر کے بیٹھی ہوئی تھی جیسے اس نے میرے کل نہ آنے کی پروا ہی نہیں کی یہ سمجھتی ہے میں اس کا بندۂ بے دام بن چکا ہوں اور لوہے کی طرح مقناطیس کی جانب کھنچا چلا آؤں گا۔۔۔ اور۔۔۔ "آپ کل کیوں نہیں آئے؟" جب اس نے نرم انگلیوں سے اس کا چہرہ چھو کر پوچھا تو وہ چونک اٹھا۔ بدگمان سی نظر اٹھا کر اس کے چہرے کی طرف دیکھا، تر و تازہ، خوبصورت اور سچا چہرہ سامنے تھا وہ بہک گیا۔

کل کے شکوے درمیان میں رہے اور دل خود بخود صاف ہو گئے ــــ "آپ یہاں رہیں گے نا؟"

"نہیں" کافی دیر سوچ کر جمال نے جواب دیا۔ حالانکہ وہ یہاں سے جانا نہیں چاہتا تھا۔ یہ ریشم اور گلاب سے گندھی ہوئی لڑکی اس کے پاؤں کی زنجیر بن رہی تھی ــــ مگر وہ ایک جھٹکے سے اُٹھ کھڑا ہوا۔ "ایک بہت ضروری کام پڑ گیا ہے۔ آج رات نہیں ٹھہر سکتا۔" فری کا دل ڈوب گیا۔ کیا شب وصل سے ضروری بھی کوئی کام ہو سکتا ہے۔ اس کا دل چاہا رو دے اور کہے۔ جمال خدا کے لئے نہ جاؤ۔ ان راتوں کو روشن کر دو میں تمہارے بغیر ایک پل نہیں سو سکتی خدا کے لئے۔۔۔ مگر یہ سب کہنے کا اس میں حوصلہ نہ تھا۔

اس نے تو سُن رکھا تھا کہ شوہر کی ہر بات پر ایمان لانا چاہیئے اسے شک کی نگاہ سے نہیں دیکھنا چاہیئے ــــ ہوگا کوئی ایسا ہی کام ــــ جو ان سہاگن راتوں پر غالب آ گیا ہے ــــ ورنہ کون کافر صبر کر سکتا ہے۔

جمال چلا گیا ــــ اور بس پھر وہ اسے لینے ہی آیا وہ اپنے ذہن کو کوئی تلخ بات سوچنے کی اجازت نہیں دینا چاہتی تھی اور پھر جمال کے پیار میں تو کوئی فرق نہیں آیا تھا، بس یونہی ذرا اکھڑا اکھڑا لگتا تھا۔

ایک مہینے بعد وہ اُس کے ساتھ واپس آ گئی اور یہاں سے جاتے ہوئے جو وہ بہت سی کہانیاں ذہن میں لے کر گئی تھی ساتھ ہی واپس لے آئی کہ وہ اپنے اس کمرے میں لیٹ کر جمال کو بتائے گی۔ اپنے بچپن کے متعلق، امّاں کے متعلق۔ ابّا کے متعلق، پھر ابّا کے فوت ہونے کے بعد گھر کے حالات دگرگوں ہونے لگے تو اماں نے دوبارہ میڈیکل کالج میں داخلہ لے لیا اپنی ڈاکٹری کا کورس مکمل کر کے ایک کلینک کھول لیا۔ دن کو نوکری کرتیں، شام کو کلینک میں بیٹھتیں، ہم سب کو اچھے اسکولوں اور اچھے کالجوں میں پڑھایا۔ بڑی دو بہنوں کی شادیاں دھوم دھام سے کیں وہ خود ایم۔ اے کرنا چاہتی تھی۔ مگر ایک دن جمال کی آپا اسے دیکھنے آ گئیں یوں تو روز اور بھی بہت سے رشتے اور تصویریں آتی تھیں۔ مگر اسے جمال کی آپا پسند آ گئیں، ایسی من موہنی شکلیں اُسے بہت بھاتی تھیں اور جو بھائی بھی بہن کا ہم شکل ہوا تو بس مراد بر آئے گی۔ اس نے سوچا۔

یہاں پر وہ چپ ہو جائے گی۔ تب جمال بار بار پوچھے گا۔ اُس نے اسے کیسا پایا جب اُسے اچھی طرح تڑپا لے گی۔ تب بتائے گی کہ ــــ وہ اُسے آپا سے کہیں سندر کہیں اچھا، کہیں پیارا لگا۔

مگر وہ یہ کیسے کہہ سکے گی اس طرح ــــ نہیں اس طرح' نہیں یوں ــــ تاکہ اسے یقین ہو جائے کہ وہ واقعی میرے مَن کا اُجالا اور تن کا سنگھار بن چکا ہے۔ مگر

ساری باتیں جی میں رہیں اور وہ سسرال میں صرف آپا ہی تھیں، گھر بار اُس کے حوالے کرکے کویت سدھاریں کیونکہ وہ دو سال سے وہیں مقیم تھیں اور اب صرف بھائی کی شادی کرنے آئی تھی ـــــ اور اس کی زندگی کا نیا دور شروع ہوا۔

اپنا گھر۔۔۔ جو ہر لڑکی کا پہلا اور آخری خواب ہوتا ہے اور اب اس گھر کو ہر طرح سے اسے بنانا سجانا تھا۔ جنت بنانا تھا۔

ہر لڑکی کی طرح اسے بھی گھرداری کا کوئی تجربہ نہیں تھا اپنی ماں کے گھر چند ذمے داریوں کو سنبھال لینا یا گاہے گاہے باورچی خانے میں گھس کر اپنی پسند کی کوئی چیز پکا لینا اور بات ہے لیکن ایک پورے گھرانے کی ذمے داری سنبھالنا اور بات ہے اسے تو نمک مرچ کا حساب رکھنا بھی نہیں آتا تھا۔ ابھی وہ صرف نئی نویلی دُلہن رہنا چاہتی تھی جسے جمال کی تھپکیاں سُلاتی رہیں اور جمال کی سرگوشیاں اٹھاتی رہیں۔ مگر ایسا نہیں ہوا۔

جمال نے ذرا کرخت لہجے میں واضح کردیا کہ "وہ اس کو ایک مکمل گھریلو عورت کے روپ میں دیکھنا چاہتا ہے۔ کافی عرصہ وہ نوکروں اور ہوٹلوں کے رحم و کرم پر رہا ہے اب وہ چاہتا ہے کہ بیڈ ٹی اُسے بستر میں نور کے تڑکے ملے، کھانا اُس کے لیے وہ خود پکایا کرے۔ اگر اسے دلچسپی نہ ہو تب بھی وہ خانہ داری کے تمام اسرار و رموز سیکھے اور گھر کی ہر چھوٹی سے چھوٹی چیز کا بھی خیال رکھے۔

اگرچہ جمال کا لہجہ بہت تند اور کھردا تھا۔ مگر اس کو بُرا نہیں لگا یہی تصور کس قدر خوش کن تھا کہ یہ اس کا گھر ہے اس کا اپنا گھر ـــــ اور اب اس میں کسی کی دخل در معقولات نہیں چلے گی۔ وہ ہوگی اور جمال ہوگا۔

اس کی نازک اندامی جن کاموں کی متحمل نہیں ہوسکتی تھی اُس نے خوشی خوشی وہ بھی سنبھال لیے تھے۔

ایک تھکا دینے والی رات کے پُل صراط سے گزر کر جب وہ صبح پانچ بجے اٹھتی تو اُسے جھنجلاہٹ ہوتی جب کہ جمال فرسے سے پڑا سوتا رہتا اس وقت جمال اسے

بڑا بے درد لگتا۔ باورچی خانے میں جاکر وہ چائے بناتی اور ٹرے میں رکھ کر مسکراتی ہوئی جمال کو جگانے آجاتی بالکل ایسے جیسے جمال کو ہر صبح اس کے بالوں میں انگلیاں پھیر کر یا ہلکی ہلکی گدگدی کرکے اسے جگانا چاہیئے تھا اور جمال بھی سو نخرے کرکے اٹھتا تو دوڑ کر کُلّی کے لئے پانی لاتی۔ جب تک وہ چائے پیتا وہ اس کے نہانے کے لئے پانی گرم کرکے غسل خانے میں رکھ دیتی اور جب وہ غسل خانے میں چلا جاتا تو جلدی جلدی ناشتہ بنانے میں لگ جاتی۔ جب تک وہ تیار ہو کر آتا ناشتہ میز پر لگ جاتا۔ وہاں دو چار باتیں کرلیتے پھر جمال اپنی چھوٹی سی کار میں بیٹھ کر دفتر چلا جاتا، اور وہ روزمرہ کے کاموں میں مگن ہو جاتی۔

سارا گھر صاف کرنا، بیڈ روم کو نئے سرے سے سجانا، سودا سلف منگوانا، کھانا پکانا پھر شام ڈھلے بن سنور کر جمال کا انتظار کرنا، بظاہر اس نے خود کو بالکل جمال کی مرضی کے مطابق ڈھال لیا تھا۔ اگر وہ شام کو کہیں لے جاتا تو چلی جاتی ورنہ اس کی شامیں ایسی تھیں کہ بغیر کسی بیرونی تفریح کے ہی کیف آگیں ہوتیں مگر ـــ کبھی کبھی وہ محسوس کرتی کہ جمال اچانک پینترا بدل لیتا ہے اور اس کا لہجہ بڑا ہتک آمیز ہو جاتا ہے اس وقت جمال اسے بڑا ہی خونخوار قسم کا آدمی لگتا اور کبھی کبھی زبان بھی بڑی غیر مہذب استعمال کرتا، اس قدر زہریلا طعنہ دیتا کہ وہ گھنٹوں گم صُم بیٹھی رہتی۔ پھر شاید اسے اپنی غلطی کا احساس ہو جاتا اور تھوڑی دیر تک روٹھے رہنا اس کے اختیار میں نہیں تھا۔

تلخ سی یہ گفتگو بھی اکثر ہونے لگی۔ جمال اُس کی ذرا ذرا سی غلطی کو پکڑ لیتا اور دنوں اس کو طعنے دیا کرتا۔ وہ بہت سٹپٹاتی اور اسے سمجھ نہ آتا کہ سرزنش کا یہ کون سا انداز ہے یہ تو ضرور ہے کہ وہ فرشتہ نہیں ہے اور یہ بھی صحیح ہے کہ گھرداری کے معاملے میں وہ تجربہ کار نہیں ہے کوئی نہ کوئی غلطی مینو بنانے یا کھانا پکانے میں ہو جاتی ہے پھر اس کی پسند ناپسند جاننے کے لئے بھی وقت درکار تھا ایسے میں اسے نہایت بدسلیقہ اور پھوہڑ عورت ثابت کرنے میں وہ کس قدر حق بجانب ہے اور پھر تعلیم یافتہ لوگوں کا یہ طرز گفتگو بھی نہیں ہوتا

فطرتاً وہ کم گو اور حساس تھی۔ طبیعت پر ان باتوں کا اثر لیتی مگر یہ سوچ کر کہ جمال کو گھریلو ماحول کبھی نہیں ملا۔ تنہا رہ کر چڑچڑا ہو گیا ہے، رفتہ رفتہ ٹھیک ہو جائے گا۔ وہ خاموش ہو جاتی اس پر اس نے سن رکھا تھا کہ شادی کے ابتدائی دور میں میاں بیوی کے طرزِ عمل اور اختلافات کی نوعیت پر ہی آئندہ زندگی کی بنیاد کھڑی ہوتی ہے۔ اچھی بیوی کی طرح تحمل سے کام لینا چاہیئے ایسا نہ ہو کہ ذرا سی چوک معاملے کو بگاڑ دے۔

لیکن دن بدن جُوں جوں اس کا حسن نکھرتا گیا، جمال کا لہجہ مزید جارحانہ ہوتا گیا تو وہ جھلا گئی۔ خاص طور پر وہ محسوس کرنے لگی تھی کہ جب بھی وہ خوبصورت کپڑے پہن کر، اچھی طرح بن سنور کر اس کے ساتھ کہیں جانے کو تیار ہوتی تو وہ ناقدانہ اس کا جائزہ لیتا۔ ہر روز اس کے کپڑوں، میک اَپ یا ہیر اسٹائل پر ضرور تنقید کرتا۔ یہ تنقید اسے عجیب ہی نہیں بے تکی بھی معلوم ہوتی کیونکہ وہ میک اَپ یا لباس کے معاملے میں خود ہی بہت محتاط تھی۔ وہ یونہی برائے نام سا میک اپ کرتی مگر اس کے ساتھ ہی وہ خوب چمکنے دمکنے لگتی اور اسی وقت جمال کڑوا سا جُملہ کہہ دیتا اس کا دل چاہتا سب کچھ نوچ کھسوٹ کر پھینک دے اور اندر بند ہو کر دروازے کی کنڈیاں چڑھا لے اور چیخے چلائے، مگر وہ بڑے ضبط کا ثبوت دیتے ہوئے خاموش رہتی۔ ایک بار اس کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو ہی گیا۔ ان تینوں مہینوں میں جمال نے اس پر اتنی تنقید اور تنقیص کی تھی کہ وہ تنگ آ گئی تھی اُس روز وہ دونوں پکچر دیکھنے جا رہے تھے۔ اس نے اپنا چوڑی دار پاجامہ نکالا اور اس کے ساتھ گوٹے والا کرتہ پہنا جب وہ بڑا سا جوڑا بنا کر تیار ہو گئی اور اپنی دانست میں غضب کی لگنے لگی تو جمال نے اسے دیکھتے ہی کہا۔

"یہ کیا واہیات سا لباس تم نے پہن لیا ہے"؟

"یہ تو مَیں نے پہلے بھی کئی بار پہنا ہے مگر پہلے آپ نے اسے کبھی واہیات نہیں کہا"۔

"اگر پہلے نہیں کہا تو اب کہہ دیا ہے"۔ جمال نے رُکھائی سے کہا۔

"اچھا آئندہ نہیں پہنوں گی"۔ اس نے افسردگی سے کہا۔ "اب اسی طرح جانے دیں۔ وقت بہت کم ہے اور کپڑے بدلنے میں دیر لگے گی"۔ جمال اسی بات پر بپھر گیا۔

"انسان کو وہی لباس پہننا چاہیئے جو اس کو زیب دے، ذرا اپنی ٹانگیں ملاحظہ فرمائو"۔

فری کو بھی غصہ آ گیا یہ کیا تنبیہہ کا انداز ہے پھر بھی اس نے نرمی سے کہا "آپ کو ویسے ہی پسند نہیں ہو گا یہ پاجامہ، ورنہ کالج میں تو جب بھی میں ایسا لباس پہن کر جاتی تھی تو لڑکیاں میری تعریف ہی کرتی تھیں"۔

ہاں یہ سب انہی سہیلیوں کا ہی کیا دھرا ہے۔ دو دو پیسے کی ان لڑکیوں نے ہی تمہارا دماغ آسمان پر چڑھا دیا ہے اور تم بھی اپنے آپ کو کچھ زیادہ ہی حسین سمجھنے لگی ہو، ذرا مزاج کو ٹھکانے رکھو ایسا نہ ہو کہ یہاں تمہیں اپنی حقیقت نظر آ جائے"۔

"افوہ!" فری تو دنگ رہ گئی۔ "کیا یہ جمال بول رہا ہے اور اس قدر گرم لہجے میں" فری کو بھی طیش آ گیا بولی۔ "مہربانی فرما کر میری سہیلیوں کو بُرا بھلا نہ کہیئے۔ انہوں نے آپ کا کچھ نہیں بگاڑا رہی مَیں — تو آپ کے گھر آ کر اپنی ہی نہیں آپ کی حقیقت بھی مجھ پر روشن ہو گئی ہے"۔ یہ کہہ کر وہ روتی ہوئی غسل خانے میں گھس گئی اس نے کپڑے بدل لئے جُوڑا نوچ پھینکا۔ رو رو کر چہرہ خراب کر لیا اور باہر جانے سے صاف انکار کر دیا۔

اُس کو روتا دیکھ کر جمال کو جلد ہی اپنی غلطی کا احساس ہو گیا۔ ناحق چھوٹی سی بات کو اتنا طول دیا۔ واقعی ان کپڑوں میں وہ بہت خوب صُورت لگ رہی تھی اور جمال نہیں چاہتا تھا کہ سب کی نظر اس پر پڑے۔ یہ بات تو وہ اسے کسی اور طریقے سے بھی سمجھا سکتا تھا مثلاً —

بھئی جب میرے ساتھ باہر جایا کرو تو بالکل سادے کپڑے پہنا کرو۔ جب تم بن سنور کر نکلتی ہو تو غضب ڈھاتی ہو اور جب سب لوگ تمہاری طرف نظر بھر کے دیکھتے ہیں تو میں حسد محسوس کرتا ہوں مگر وہ ایسا کیوں کہتا؟ عورت ذات ہے۔ یہ سُن کر جانے اور کتنا دماغ خراب ہوتا اُسے تو گریہ کشتن والا ردِّ عمل اختیار کرنا تھا۔ جب اس نے دیکھا کہ فری کا غسل خانے سے نکلنے کا کوئی ارادہ نہیں تو وہ بھی اٹھ کر گھر سے باہر چلا گیا۔

باہر تو بے مقصد ہی نکل آیا تھا اُس کو خود معلوم نہ تھا اب کس طرف جانا ہے اور کیا کرنا ہے۔ پکچر دیکھنے کے بعد اس کا پروگرام تھا کہ وہ کسی ہوٹل میں کھانا کھائیں گے پھر رات گئے گھوم پھر کر واپس آجائیں گے۔ وہ سوچ رہا تھا اب کہاں جائے؟ پکچر پہ اکیلا جانا ٹھیک نہیں دوست یار کہاں ہوں گے؟ جب سے شادی ہوئی تھی ان سے علیک سلیک رہ گئی تھی یا ہنی مُون کے تقاضوں کو مدِنظر رکھ کر انہوں نے خود دُور دُور رہنا شروع کر دیا تھا۔ غرض وہ ایک گھنٹہ اِدھر اُدھر گھومتا پھرا اور سگریٹ پھونکتا رہا۔ ساتھ ہی اُسے خود پر بھی غصہ آتا رہا خواہ مخواہ اس نے آج کی شام برباد کی کیا حرج تھا اگر فری وہ لباس پہن کر ساتھ چلتی۔ فری ابھی نئی دلہن ہے اُس کا دِل چاہتا ہوگا روز نیا اور خوب صورت لباس پہنے۔ مَیں بھی تو لوگوں کی خوب صورت اور اسمارٹ بیویوں کو دیکھ کر سوچا کرتا تھا کاش! میری ایسی ہی بیوی ہو۔

تب مجھے کیا معلوم تھا اللہ تعالےٰ مجھے ان سب سے خوب صورت اور پیاری بیوی دے دے گا کہ لوگ میری بیوی کو رشک کے مارے دیکھا کریں گے۔ لوگوں کے دیکھنے سے کیا ہو جاتا ہے۔ دیکھنا تو کوئی جرم نہیں مَیں بھی دیکھتا ہوں، لوگ بھی دیکھتے ہیں۔۔۔ مَیں اپنے دیکھنے کو جرم نہیں کہتا اور لوگوں کے دیکھنے کی سزا بیوی کو دیتا ہوں۔ اگر میری بیوی کو یہی شکایت مجھ سے ہو۔ تو مَیں اسے وہ بے نقط کی سناؤں گا کہ یاد کرے گی۔ یعنی تم میری نیّت پر شک کرتی ہو۔ تم چاہتی ہو مَیں اندھا ہو جاؤں کیا میں انہیں کھا جاؤں گا یا کہیں اٹھا کر لے جاؤں گا۔ وغیرہ وغیرہ۔ میں تو ضد میں آکر اس کی موجودگی میں اور بھی عورتوں کو تاکتا تاڑتا۔

افوہ مرد کتنا سنگدل ہے۔ اور میں بھی۔ میں جو اپنے دوستوں کو ان کی تنگ دلی پر لعنت ملامت کیا کرتا تھا۔ لعنت ہے تمہارے اوپر جمال، بڑے وسیع القلب اور وسیع الذہن بنتے ہو اور دوستوں میں بیٹھ کر بڑی ہانکا کرتے تھے کہ میں اپنی بیوی پر ناجائز سختی نہیں کروں گا اور اپنی بیوی کو مناسب آزادی دوں گا۔ یہ کروں گا۔ وہ کروں گا۔

اور آج تین ماہ ہوئے تمہاری شادی کو اور تم اس کے ساتھ کیا برتاؤ کر رہے ہو۔ جب جمال جی ہی جی میں اپنے طرزِ عمل پر بہت شرمندہ ہو چکا، تو اس نے کہا تلافی کی یہی ایک صورت ہے، وہ ابھی جا کے اپنے رڈیے کی فری سے معافی مانگے اور وعدہ کرے کہ آئندہ وہ ایک نارمل آدمی کی طرح رہے گا۔ جلدی جلدی گھر پہنچا، موٹر گیراج میں بند کر کے وہ گھر میں داخل ہوا۔

فری نے رو دھو کر اپنا چہرہ صاف کر لیا تھا۔ شب خوابی کا لباس پہنے، وہ میز پر کھانا لگائے جیسے اسی کے انتظار میں بیٹھی تھی۔ بظاہر وہ ایک کتاب پڑھ رہی تھی شاید اس کو بے وقت ضد کرنے کا احساس ہو گیا تھا۔ ایک گھر میں صرف دو فرد ہوں۔ تو بدمزگی کی گنجائش نہیں رہتی۔ جمال نے جب دیکھا کہ فری خود ہی صلح پر آمادہ ہے۔ تو اس کے اندر کا روایتی مرد ہوش میں آگیا اب خواہ مخواہ جھکنے سے کیا فائدہ؟ کہیں رعب ہی نہ ختم ہو جائے دونوں نے خاموشی سے کھانا کھایا۔ مگر بیڈ روم میں جاتے ہی جانے کس طرح دونوں میں صلح ہو گئی۔ ہنی مُون کے دوران کچھ کہے بنا ہی صلح ہو جایا کرتی ہے اور صلح کے بعد وہ رات اتنی خوب صورت گزر گئی کہ کئی آنے والے دنوں میں لڑائی کے امکانات بالکل مٹ گئے۔

لیکن تا بہ کہ۔ پھر کچھ دنوں کے بعد چھوٹی چھوٹی باتیں جمال کو چبھنے لگیں۔ وہ اٹھتے بیٹھتے نشتر چبھونے لگا۔

"آج میرا سیفٹی ریزر صاف نہیں تھا۔"

"جُوتے پہ پالش ٹھیک نہ تھی۔"

"بٹن ٹیڑھا لگا ہے۔"

"گلدان میں پھُول موسم کے مطابق نہیں۔"

"تمہارے بالوں کا اسٹائل بے ہودہ ہے۔"

"سالن بدمزہ پکنے لگا ہے۔"

"گوشت کون وا ہیات آدمی لاتا ہے۔"

"تم میرے دوستوں کی تواضع نہیں کرتیں۔ اس لئے وہ مجھ سے کترانے لگے ہیں۔"

"کل رات تم میری طرف پیٹھ کر کے کتاب پڑھ رہی تھیں، اس کا مطلب ہے تم میری عزت نہیں کرتیں۔"

"جب میں گھر میں موجود تھا تو تم آدھا گھنٹہ ہمسائی سے کیوں گپ لگاتی رہیں۔"

"تمہاری بہن نے اپنے خط میں سلام کے علاوہ مجھے کوئی اہمیت نہیں دی، تم سب بہنیں مردوں کو کم تر سمجھتی ہو۔"

"تمہاری سہیلیاں مجھے بالکل پسند نہیں ان سے قطع تعلق کرو۔" وغیرہ وغیرہ ایسی اور بھی بیسیوں غیر اہم باتیں تھیں۔ جن پر صبح و شام بحث چھڑنے لگتی۔ فری حیران ہوتی کہ ان باتوں میں لڑائی کی کوئی وجہ نہ ہوتی۔ ان پر اظہار خیال بڑی نرمی سے اور دوستانہ ماحول میں بھی ہو سکتا ہے مگر اسے سمجھ نہ آتی کہ جمال ایسا کیوں کرتا ہے اسے بہت معمولی لڑکی ثابت کرنے کے لئے یا اپنے آپ کو بہت اعلیٰ و ارفع بتانے کیلئے۔

جہاں تک جمال کی ذات کا تعلق ہے اس میں بھی ایسی بہت سی بُری عادتیں تھیں جو فری جیسی نستعلیق لڑکی کے لئے تکلیف کا باعث تھیں۔ مگر چونکہ وہ اس کی نظر میں مجازی خُدا تھا۔ اس لئے وہ انہیں برداشت کئے ہوئے تھی۔ اگر وہ صرف اتنا ہی کہہ دیتی کہ کھانا کھاتے ہوئے تم یہ جو عجیب و غریب آوازیں نکالتے ہو تو مجھے اُبکائی آنے لگتی ہے تو جانے کتنا ہنگامہ کھڑا ہو جاتا۔ مگر وہ جانتی تھی کہ کوئی مرد اپنی بیوی کے مُنہ سے تنقید یا تنبیہ سننا پسند نہیں کرتا۔

ایک دن صبح ہی صبح فری ذرا جلدی میں انڈا فرائی کر رہی تھی۔ کہ اس کی زردی ٹوٹ گئی چونکہ وقت کم تھا۔ اس لئے اس نے اسی طرح میز پر رکھ دیا جمال نے انڈے کو دیکھتے ہی طنز سے کہا۔

"صرف اچھی صورت سے کیا ہوتا ہے فری جی۔ انڈا بنانا بھی ایک فن ہے۔"

فری کو جمال کے اس ریمارک پر اتنا دکھ پہنچا کہ وہ تلملا کر رہ گئی۔ صبح کے وقت وہ کوئی بدمزگی نہ پیدا کرنا چاہتی تھی خاموش ہو رہی۔ یہ ذرا سی غلطی جو مشتاق سے مشتاق ہاتھوں سے بھی ہو سکتی ہے نظر انداز بھی کی جا سکتی تھی اور اس کا اس کی شکل و صورت سے کیا تعلق؟ پھر تو یہ سلسلہ چل نکلا۔

وہ بات بات میں اسے حسین ہونے کا طعنہ دینے لگا۔ "کبھی تمہیں شیشہ دیکھنے سے فرصت ملی ہوتی تو تم نے گھرداری ضرور سیکھی ہوتی۔"

حالانکہ وہ بے چاری خود سے بڑی بے نیاز، شادی سے پیشتر اسے معلوم ہی نہ تھا کہ وہ اتنی خوبصورت ہے۔ یہ احساس جس کافر نے دلایا تھا وہی اب اس احساس پر ضربیں لگا رہا ہے۔ فری زیادہ تندہی سے گھر کا کام کرتی۔ بننا سنورنا اس نے چھوڑ دیا تھا۔ پھر بھی وہ جو نئی نویلی دلہن والی پھبن ہوتی ہے ہمہ وقت اس کے چہرے پر رہتی۔

کچھ دن ایسے بھی آتے جو پھولوں کے سائے میں ہنستے کھیلتے گزر جاتے ہیں پھر

جانے کیا ہوتا دونوں طرف تناؤ بڑھ جاتا بات بات پر جھگڑا ہونے لگتا اور فری کو سمجھ نہ آتی کہ ایسا کیوں ہوتا ہے؟ اور شادی کیا چیز ہے؟ شادی جسے لڑکیاں لازوال خوشیوں کا ایک جہاں کہتی ہیں اس دنیا میں آکر تو انسان اپنی مرضی سے سانس بھی نہیں لے سکتا۔ لڑکیاں کیوں سوچتی ہیں کہ ان کا اپنا ایک گھر ہوگا۔ جسے وہ اپنی مرضی کے مطابق سجائیں گی، کوئی دخل دینے والا نہ ہوگا۔ یہاں تو کوئی کام ایسا نہیں جس میں شوہر دخل نہیں دیتا یا اپنی حاکمیت نہیں منواتا۔ والدین کے گھر اس سے کہیں زیادہ آزادی ہوتی ہے اور وہ ایک ہلکی پھلکی خوبصورت آزادی' اور نہیں تو روٹی کپڑا بغیر طعنے کے ملتا ہے اور ہنسنے بولنے کی پوری آزادی ہوتی ہے۔ یہاں تمہارا رونے کو جی چاہ رہا ہے، لیکن شوہر صاحب دوستوں کی محفل لگائے خوش گپیوں پر آمادہ ہیں اور چاہتے ہیں تم بھی بڑھ چڑھ کر ان کا ساتھ دو اور جب بھی تم کسی انجانی خوشی سے مسرور ہو کر بات بات میں ہنسنا چاہو تو یہ صاحب جھٹ تیوری چڑھا لیں گے اور ایسی ایسی اذیت ناک باتیں کہیں گے کہ آخر رو کر ہی دم لو۔

واہ، کیا خدا کی شان ہے؟

یہاں شادی نہیں ہوتی عورت کی روح اور جسم کا سودا ہوتا ہے۔ چھ مہینے میں ہی فری ایسی تلخ باتیں سوچنے لگی تھی۔ دل میں بے حد غبار تھا جو تنہائی میں آنکھوں کی راہ سے خارج ہوتا رہتا تھا۔ پھر بھی ایک کڑوا کسیلا سا دھواں ساتھ تھا۔ جس نے اس کے قلب وجاں کو محیط کر رکھا تھا۔ وہ یہ بوجھ ہلکا کرنا چاہتی تھی پر جاتی کہاں؟

جمال کے اصرار پر سہیلیوں سے ملنا بند کر دیا تھا اور پھر ان سے کہتی بھی کیا؟ جو ہمیشہ یہی سمجھتی تھیں کہ اس کا دولہا اسے دیوانگی کی حد تک چاہتا ہے اور کبھی کوئی تکلیف نہیں دے سکتا۔ بڑی دونوں بہنیں دور تھیں اور اپنے اپنے بچوں میں مگن ایک رہ گئیں اماں تو انہیں اپنے اسپتال اور مریضوں سے کہاں فرصت تھی۔ انہوں نے تینوں بیٹیوں کو بیاہ کر اپنا فرض ادا کر دیا تھا۔ ان کا چھوٹا سا کلینک اب اس گنجان ترین علاقے کا سب سے بڑا میٹرنٹی ہوم تھا جس کو وسیع تر کرنے کے اماں دن رات

خواب دیکھا کرتیں۔ اپنی بچیوں کو بیاہ کر انہوں نے پلٹ کر نہ پوچھا کہ سکھ چین سے ہو، یا آزمائشوں کی بھٹی میں سلگ رہی ہو جس قسم کی زاہدانہ اور مجاہدانہ زندگی اماں نے بسر کی تھی۔ اس کے پیش نظر غالباً انہوں نے خود ہی اندازہ لگا لیا تھا کہ ان کی بیٹیاں جینے کا چلن سیکھ گئی ہوں گی۔

سسرال میں بھی کوئی قریبی عزیز نہ تھا۔ پھر فری کس کے پاس جا کر اس گھٹن کو کم کرتی اور یہ غبار دل میں رہتے تو جانے اس کا کیا ردِ عمل ہوتا ابھی وہ کشمکش اور اضطراب کے اس بھنور سے نکلنے نہ پائی تھی کہ ایک نئے انکشاف نے اس کی زندگی کے دھارے کا رخ موڑ دیا۔ نیا اور خوبصورت انکشاف جو ہر نو بیاہتا لڑکی کی زندگی میں قوسِ قزح کے رنگ اور بہاروں کی خوشبوئیں لیے داخل ہوتا ہے۔

ایک بچے کی ماں بننے کا احساس۔ اپنے وجود میں ایک ننھے منے ان دیکھے بچے کے ڈھل جانے کا احساس پہلے بچے کے آنے کی خبر پا کر لڑکی کس قدر مسرور اور کس قدر مغرور ہو جاتی ہے۔ جب وہ تخلیق کے عمل میں داخل ہوتی ہے اور خالق کہلاتی ہے۔ دوسرے لفظوں میں وہ اس بے درد انسان کی ذات کا کوئی سرا اپنے پیکر میں محفوظ کر لیتی ہے۔ پیر ہی بھاری نہیں ہوتا اس کی ذات بھی بھاری ہو جاتی ہے۔ بچہ ایک زنجیر ہی تو ہے۔ دونوں کے درمیان اور چھ مہینے تک وہ اس بندھن سے محروم رہی تھی اور شاید جمال کے اکھڑے اکھڑے رہنے کی یہی وجہ تھی۔ اس روز وہ اتنی خوش تھی کہ اس نے گھر کو نئے سرے سے سنوارا، مزیدار کھانے پکائے۔ جمال کے پسندیدہ کپڑے پہنے اور جب شام کو جمال نے اس ساری تبدیلی کی وجہ پوچھی تو سوچے ہوئے سارے فقرے اس کے ذہن سے سرک گئے۔ کوئی موزوں لفظ نہ ملا کہ وہ اپنی جیت کی کہانی بیان کر سکتی۔ اس کی اٹھتی جھکتی پلکوں اور چہرے کے بدلتے ہوئے رنگوں سے جمال نے خود ہی اندازہ لگا لیا۔

پھر واقعی اس کے لیل و نہار بدل گئے۔ اس نے سن رکھا تھا کہ ایسے عالم میں برے سے برا مرد بھی اپنی بیوی کو کچھ رعائتیں دیتا ہے۔ جمال تو اپنی تند خوئی کے باوجود اسے چاہتا تھا اس کا بھی طرزِ عمل بدل گیا۔ فری کو سارا وقت الٹیاں اور ابکائیاں آتی رہتیں۔ اور

تھوڑی دیر بعد تھک کر نڈھال ہو جاتی تو لیٹے بنا کوئی چارہ ہی نہ تھا۔ کھانا پکاتے ہوئے جب وہ پیاز بھونتی تو اسے سانس لینی دشوار ہو جاتی۔ غسل خانے کو بھاگتی تو جی الٹ جاتا تو بہ۔ زندگی میں یہ مرحلے بھی آتے ہیں۔ اسے پتہ نہ تھا کہ بچے کی خاطر عورت کو کتنے دکھ سہنے پڑتے ہیں۔ نہ کچھ کھانے کو جی چاہتا ہے، نہ کچھ پینے کو، خوشبو بھی بُری لگتی۔ بدبو بھی پھل بھی نہ بھاتا، پھول بھی بُرے لگتے، لیکن اس کے باوجود جی ہلکا پھلکا اور خوش رہتا۔ جہان نیا نیا لگتا۔ مضمحل اور گری گری طبیعت کے باوجود ہزاروں کام کرنے کو جی چاہتا۔ اور نہیں تو وہ میٹھی بچے کی ننھی منی چیزیں بنایا کرتی جنہیں دیکھ کر وہ دونوں گھنٹوں باتیں کرتے اور خوب خوش ہوتے۔ جمال نے کھانا پکانے کے لئے نوکر رکھ لیا تھا۔ دفتر سے بھی جلدی لوٹ آتا روزانہ شام کو وہ باہر تفریح کے لئے جاتے۔ جمال کی گفتگو میں تندی اور تلخی نہ رہی تھی۔

نو ماہ کا عرصہ پلک جھپکتے میں گزر گیا۔ ان نو مہینوں میں اس نے سو بار اپنے ہونے والے بچے کا تصور کیا تھا اور اسے بازوؤں میں لے کر بھینچ کر پیار کیا تھا۔ جس وقت سیج پچ کی گول مٹول اور سُرخ و سفید بچی اس کے بازوؤں میں آ گئی تو زمین پر اُس کا پاؤں نہیں پڑتا تھا۔ اس نے جمال کی طرف غور سے دیکھا۔ شاید وہ لڑکا چاہتا ہو۔ مگر جمال نے ایسا کوئی تاثر نہیں دیا تھا۔ لڑکا ہو یا لڑکی۔ پہلا بچہ تو میاں بیوی دونوں کے ارمانوں اور آرزوؤں کی آماجگاہ ہوتا ہے۔ پھر وہ بچی میں کھو گئی کہ اسے اپنی سُدھ بُدھ نہ رہی۔ زندگی کے تجربات میں یہ انوکھا اور نیا تجربہ تھا۔ نیا انوکھا اور نازک۔ اس نے چھوٹے بچے دیکھے نہ تھے۔ اس لئے چھوٹی سے چھوٹی بات اسے نئی لگتی۔ ذرا سی تکلیف پر گھبرا اٹھتی۔ فوراً ڈاکٹر کے پاس جاتی۔ گویا وہ بچی کے عشق میں مبتلا ہو گئی تھی۔ ایسے میں وہ جمال سے ذرا بے پرواہ ہو گئی۔ یہ ایک قدرتی امر تھا، لیکن جمال کی بدگمان فطرت نے اسے کسی اور ہی رنگ میں دیکھا۔ اس نے سمجھا عورت بچہ پیدا کرنے کے بعد اس لئے بے پروا ہو جاتی ہے کہ وہ اپنی دانست میں سمجھتی ہے اس نے مرد کو قابو کر لیا ہے اور پھر اس کی انا چیخنے لگی اور اس کا لہجہ اُکھڑا اُکھڑا رہنے لگا۔ اس روز بھی فری مونا کے ساتھ حد درجہ پیار کر رہی تھی اور جمال آئینے کے آگے بیٹھا شیو بنا رہا تھا۔ فری نے مونا کو اُدھر اچھال کر جمال کے آگے کر دیا اور بولی "دیکھو میری بچی کتنی پیاری ہے۔"

"لوگ کیا کہتے ہیں، تمہیں معلوم ہے"۔ جمال نے مڑکر اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"کیا"؟ فری سراپا سوال بن گئی۔

"لوگ کہتے ہیں۔ بچی مجھ پر ہے"۔

فری چونکتے چونکتے بچی اگر وہ حیرت کا اظہار کر دیتی تو پھر ہنگامہ کھڑا ہو جاتا، لیکن اب وہ کافی سنبھل گئی تھی مسکرا کر بولی "میں بھی تو یہی کہتی ہوں"۔ اور خود وہاں سے ٹل گئی۔ حالانکہ بچی ماں سے اس قدر مشابہ تھی کہ اس کی مثال ملنی مشکل ہے۔

اور اس کے بعد تو پھر تُو تُو میں میں کا ایک چکر نا بیتنے لگا۔

فری پہلے بچے کی پیدائش کے بعد بہت خوبصورت نکل آئی تھی۔ اب وہ ایک بھرپور اور باوقار عورت لگتی تھی۔ اس کا چہرہ اور نکھر آیا تھا۔ اس کے معصوم حسن کو ماں کی ممتا نے نیا نکھار بخش دیا تھا۔ جو بھی دیکھتا یہی کہتا۔ مگر جمال لوگوں کے اس کھلم کھلا اظہار کو پسند نہیں کرتا تھا اور بالآخر وہ اوچھے ہتھیاروں پر اُتر آیا۔ وہ الزام جو ہر خوب صورت عورت پر لگتے ہیں۔ اس پر بھی آزمائے جانے لگے۔

"تم میرے فلاں دوست پر بہت مہربان نظر آرہی ہو۔ آجکل یوں لگتا ہے۔ مجھ سے اکتا گئی ہو۔ شاید مجھ سے بہتر کوئی آدمی تمہاری نظر میں ہے"۔ وغیرہ وغیرہ۔

فری کو اور سب گوارا تھا۔ مگر اس کے اُجلے دامن پر چھینٹے پھینکے جائیں۔ ہر غیرت مند عورت کی طرح وہ یہ گوارا نہ کر سکتی تھی۔ نرمی سے سمجھا سمجھا کر جب وہ تھک گئی تو وہ بھی تند خوئی پر اُتر آئی۔ اس کی تند خوئی نے جمال کو اور بھڑکا دیا۔ وہ گھر سے باہر رہنے لگا۔ رات کو دیر سے آنے لگا۔ اس بات پر بھی ہر وقت دونوں میں تکرار رہتی۔ وہ اسے جلانے کے لئے اور دیر سے آنے لگا۔ راتوں کو اگر مرد زیادہ دیر گھر سے باہر رہے تو بہت سی بلائیں خوبصورت روپ دھار کر اسے بہکانے لگتی ہیں۔ بہکنے پر مرد آمادہ ہو تو راہ دکھانے والے کئی مل جاتے ہیں۔ بدی کے راستے کے بے شمار ساتھی ہیں۔ نیکی کی راہ کا کوئی ساتھی نہیں۔ سو اس کا اٹھنا بیٹھنا بھی آوارہ دوستوں کے ساتھ ہونے لگا۔ آوارگی کے آثار دیکھ کر فری چیخ اُٹھی، لیکن جب مرد عورت کو جلانے پر کمربستہ ہو تو کوئی چیخ، یا کوئی پکار

اس کے چلن کو بدل نہیں سکتی فری کو اس کی بے حسی نے اتنا نہیں تڑپایا تھا، کئی کئی دن وہ بات نہ کرتا۔ وہ بھی اکڑی رہتی۔ آنسو پی کر چپ ہو رہتی۔ بچی کو نہ بُلاتا تو صبر کر لیتی مگر اس روز اس کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا۔ جب اسے معلوم ہوا کہ جمال بُرے دوستوں کی صحبت میں پینے لگا ہے۔ وہ جی بھر کر روئی چیخی، چلّائی ہر طرح سے اُسے منایا سمجھایا مگر اس راہ پر چلنے والے جلدی واپس نہیں آتے۔ جمال جب نشے میں ہوتا تو اسے صاف لفظوں میں کہتا "میں تم سے نفرت کرتا ہوں۔ تم بہت مغرور عورت ہو۔ تم اپنے کو دنیا کی حسین عورت سمجھتی ہو، میں تم سے اتنی نفرت کروں گا کہ تمہیں اپنے چہرے سے نفرت ہو جائے گی"۔

یہ زندگی کا کون سا مرحلہ ہے۔ فری کی سمجھ میں نہ آتا وہ کیا کرے، کیا کرے؟ ان الجھنوں سے الجھتی الجھتی وہ بھی زندگی کا قرینہ بھول گئی۔ ہمہ وقت غصہ چڑھا رہتا تیوری پر بل، کاٹ کھانے کو دوڑتی، جب بھی جمال گھر آتا، طعنے دینے لگتی۔ اسی کی طرح اس پر گھٹیا الزام لگانے لگ گئی تھی اور وہ انتقام کی آگ کو کس طرح ٹھنڈا کرتی۔ اس بدمزگی کا انجام کیا ہوتا بھلا؟

وہی جو ہوا کرتا ہے۔۔۔۔ طلاق ہو گئی۔

جب میاں بیوی دونوں پر غصے کا راج ہوا اور انتقام ان کا مشیر خاص ہو تو پھر کسی کا سمجھانا بجھانا فضول ہوتا ہے۔ یہ آندھی جس طرح چڑھتی ہے اسی طرح اترتی ہے۔ مگر آندھی کے اترنے تک وقت اپنی آنکھیں پھیر لیتا ہے۔

فری اپنی امی کے گھر کیا آئی، اس پہ تو دیوانگی طاری رہنے لگی۔ زندگی کی اس تلخ حقیقت کا سامنا کرنے کا اس میں حوصلہ نہیں تھا۔ جب اس پہ جنون طاری ہوتا تو وہ چیختی چلاتی، اپنا مُنہ نوچ لیتی، ناخن مار مار کر اپنا چہرہ لہولہان کر لیتی اپنے چہرے کو اچھی طرح مسخ کر لیتی، کبھی کبھی جب اپنی بیٹی کو نہلا کر سنوار دیتی تو ایک دم بے تحاشا پیٹنے لگتی اور خوب مار چکنے کے بعد سینے سے لگا کر بلک بلک کر روتی، بیگم شفیق اس کی حالتِ زار پہ بہت پریشان تھیں مگر ان کے پاس اتنا وقت نہیں تھا کہ وہ فری کے زخموں پہ پھاہے رکھتیں اور اسے جینے کے قابل بناتیں۔ وہ جانتی تھیں کہ فری جیسی لڑکی کے لئے یہ صدمہ زندگی کا سب سے بڑا دُکھ ہے اور اس سے سمجھوتہ کرنے میں بھی وقت لگے گا۔

انہیں دنوں شہر میں ایک ماہرِ نفسیات کی دُھوم تھی۔ جسے وہ بھی کبھی کبھی اپنے اسپتال کے مریضوں کو دکھانے کے لئے یا ان کے مسائل حل کرنے کے لئے بُلاتی تھیں۔ نام تو اس کا محمد جاوداں تھا مگر وہ ڈاکٹر جادو کے نام سے مشہور ہو گیا۔ غالباً اس کے طریقِ علاج کو لوگوں نے کوئی جادُو کا کرشمہ جانا تھا۔ زبان بہت شیریں، چہرہ بہت پُرکشش، گفتگو با اثر، عمر اس کی چالیس بیالیس کے لگ بھگ تھی۔

بیگم شفیق نے اپنی بیٹی کا کیس بھی ڈاکٹر جادو کے سپرد کر دیا اور اسے ساری تفصیلات بتا دیں۔ جس دن شام کو ڈاکٹر کو لے کر گھر آئیں فری پر دیوانگی کا زبردست دورہ پڑا تھا۔ وہ صبح سے اپنے کمرے سے نہیں نکلی تھی۔ اس نے نوچ نوچ کر اپنا چہرہ بگاڑا ہوا تھا۔ صبح سے کچھ کھایا پیا نہیں تھا اور نہ ہی کسی سے بات کی تھی۔ بیگم شفیق نے اس کے کمرے میں جا کر اس کا حال پوچھا۔ جب اس نے آنکھیں کھول کر ماں کو دیکھا تو اس کے ساتھ ایک اور اجنبی کو کھڑے پایا، حیرت سے کبھی ماں کو کبھی اجنبی کو آنکھیں پھاڑ کر تکنے لگی۔

"فری میں ڈاکٹر صاحب کو لائی ہوں یہ تمہارا علاج کریں گے۔" یہ کہہ کر ماں باہر چلی گئی اور ڈاکٹر صاحب کرسی گھسیٹ کر ٹیبل کے قریب بیٹھ گئے اور اپنی گمبھیر اور شفیق آواز میں بولے۔

"میں آپ کا علاج کرنے آیا ہوں۔"

مجھے کوئی بیماری نہیں ہے ڈاکٹر صاحب" فری نے کرخت لہجے میں کہا۔

"مجھے صرف طلاق ہو گئی ہے اور طلاق ایسی بیماری ہے۔ جس کا دنیا میں کوئی علاج نہیں۔"

"اس دنیا میں ہر بیماری کا علاج ہے۔" ڈاکٹر نے اسی طرح مسکراتے ہوئے کہا۔

"ڈاکٹر صاحب آپ یہاں سے تشریف لے جائیں۔" فری غصّے سے بپھر کر اٹھ بیٹھی "ایک مرد زخم لگاتا ہے تو دوسرا مرہم لگانے آ جاتا ہے۔ تمام مرد بڑے ذلیل ہوتے ہیں۔ مجھے مردوں سے نفرت ہے۔ شدید نفرت۔ میں آپ کی صورت بھی دیکھنا پسند نہیں کرتی آپ مجھ پہ احسان کریں اور یہاں سے چلے جائیں۔"

"میں آپ کو صورت تو نہیں دکھانے آیا محترمہ، آپ میری صورت نہ دیکھیں مجھ سے نفرت کرتی رہیئے میں تو اپنا فرض ادا کرنے آیا ہوں۔"

"امی! امی!" اس نے چیخ کر اپنی امی کو بُلا لیا اور اس کے آگے ہاتھ جوڑ کر کھڑی ہو گئی کہ اس آدمی کو یہاں سے بھیج دو۔ ورنہ میں اپنا سر پھوڑ کر مر جاؤں گی۔

اس شام ڈاکٹر جاوید اسے دیکھے بغیر چلا گیا، مگر بیگم شفیق سے کہہ گیا کہ پریس ہونے کی ضرورت نہیں۔ کیس سیریس ضرور ہے مگر لاعلاج نہیں۔ میں ہر روز شام کو انہیں دیکھنے کے لئے آیا کروں گا اور خود انہیں جینے کی راہ پر لاؤں گا۔

اگلی شام کو ڈاکٹر پھر مقررہ وقت پر اس کے سرہانے کھڑا تھا۔ اس مرتبہ بھی اسے دیکھ کر فری نے ناگواری سے آنکھیں موند لیں۔ ڈاکٹر مسکرا کر پاس رکھی ہوئی کرسی پر بیٹھ گیا اور محبت سے بولا۔

"کیسی طبیعت ہے آپ کی؟"

"جی میری طبیعت جیسی بھی ہو۔ یہ میرا ذاتی معاملہ ہے۔ مہربانی فرما کر دخل اندازی سے باز آئیں۔" فری نے نہایت درست لہجے میں جواب دیا۔

"کیا کہا آپ نے؟" ڈاکٹر کے چہرے پر شگفتگی ابھر آئی۔ "آپ کی طبیعت کی خرابی آپ کا ذاتی معاملہ بالکل نہیں ہے۔ یہ تو ڈاکٹر کا ذاتی معاملہ ہے۔ بلکہ آپ دخل در معقولات کر کے ڈاکٹر کے حق کو تسلیم نہیں کر رہیں۔"

بس ڈاکٹر کا اتنا کہنا تھا کہ فری کا پارہ چڑھ گیا وہ ہذیان بکنے لگی۔ اس کے منہ سے جھاگ نکلنے لگا۔ "ڈاکٹر تم انتہائی کمینے ہو۔ مرد سب کمینے ہوتے ہیں۔ کسی نہ کسی صورت میں اپنی برتری ضرور منواتے ہیں۔ قاتل کے روپ میں بھی اور ڈاکٹر کے روپ میں بھی عورت کو ذلیل کیڑا سمجھتے ہیں۔ جب چاہتے ہیں بیمار کر دیتے ہیں۔ جب چاہتے ہیں مسیحا بن کر آ جاتے ہیں۔ یہ شیطان ہوتے ہیں۔ خونی ہوتے ہیں، یہ حاسد ہوتے ہیں۔ سبھی مرد ایک سے ہوتے ہیں۔ ان کے لئے کسی کی زندگی کوئی اہمیت نہیں رکھتی ان کے پیش نظر صرف اپنی ذات ہوتی ہے۔ یہ زمین پر خدا کا نائب نہیں بلکہ خدا بن کر رہنا چاہتے ہیں۔ ان کے خیال میں عورتیں حقیر تنکے ہیں۔ جنہیں آگ میں جلا دینا چاہیئے۔ تم ڈاکٹر نہیں ہو تم بھی ایک کمینے آدمی ہو اور میں تمہاری منحوس صورت نہیں دیکھنا چاہتی چلے جاؤ۔ یہاں سے فوراً چلے جاؤ۔ چلے جاؤ۔ وہ گلا پھاڑ پھاڑ کر چیخنے چلانے لگی۔ جب ڈاکٹر ٹس سے مس نہ ہوا تو اس نے اپنے کلتے پیٹنے شروع کر دیئے اور پھر

اپنے لمبے ناخنوں سے اپنا چہرہ نوچنے لگی اب ڈاکٹر کرسی سے اٹھا اس نے دونوں ہاتھ چہرے سے الگ کئے اور انہیں مضبوطی سے اپنے ہاتھوں میں جکڑے رکھا۔ جب فری رو رو کر نڈھال ہو گئی اور اس کا چہرہ خون اور آنسوؤں سے تر ہو گیا تو وہ بے ہوش ہو گئی۔

ڈاکٹر نے اطمینان سے اس کی ڈریسنگ کی اس کو سکون سے سونے کے لئے ایک ٹیکہ لگایا اور مسز شفیق کو رات کے لئے ضروری ہدایات دے کر چلا گیا۔

اگلے روز رات کے وقت ڈاکٹر پھر آگیا۔ آج فری بالکل خاموش لیٹی رہی روٹھے ہوئے بچے کی مانند۔ شاید اب اس میں قوتِ مدافعت نہیں رہی تھی یا وہ بے بس کر دی گئی تھی۔ ایک ہفتے تک ڈاکٹر جاوید اس کی تیمارداری اور علاج کرتا رہا۔ فری کا چہرہ بھی ٹھیک ہو گیا اور ذہن بھی قدرے سکون میں تھا۔ اس شام جب ڈاکٹر جاوید کمرے میں داخل ہوا تو فری صاف ستھرے کپڑے پہن کر ایک آرام کرسی پہ آنکھیں موندے بیٹھی تھی۔

"کیسی ہو فری؟" ڈاکٹر نے جان بوجھ کر بے تکلفی سے کہا۔ شاید وہ یہ چاہتا تھا کہ فری ایک ہی بار سارا کینہ، بغض اور غصہ نکال لے تو وہ اپنا طریقۂ کار استعمال میں لائے فری کو اس کا اندازِ تخاطب واقعی بہت بُرا لگا۔ تیوری پر بل ڈال کر بولی۔

"دیکھ لیجئے۔"

"دیکھ تو رہا ہوں۔" وہ مسکرا کر بولا۔ "تم پہلے سے بہتر لگ رہی ہو۔"

فری نے ایک لمبی سانس لی اور بڑے کربناک لہجے میں بولی۔ "ڈاکٹر صاحب کیا میں پوچھ سکتی ہوں کہ آپ مجھے تنگ کیوں کرتے ہیں؟"

"کیا میں تمہیں تنگ کرتا ہوں میرا تو خیال ہے میں تمہارا علاج کر رہا ہوں۔"

"میرا مرض لاعلاج ہے، میں واقعی ذہنی مریضہ ہوں۔ مگر ٹھیک ہونے کی حد سے گزر چکی ہوں۔ اس لئے مجھ پہ محنت کرنا فضول ہے۔"

"ٹھیک ہونے کی حد کہاں ہے یہ تو صرف ڈاکٹر ہی جانتا ہے۔"

"ویسے آپ کی مہربانی ہوگی جو آپ مجھے میرے حال پہ چھوڑ دیں۔ مجھے نارمل ہونے کی تمنا نہیں۔"

"یہ تمنا تو جناب ہمیں ہے۔"

"ہمیں سے کیا مُراد ہے آپ کی؟"

"میں، مسز شفیق، مونا اور یہ دنیا جس میں تم رہتی ہو۔ دنیا کی طرف سے کچھ حقوق تم پہ عاید ہوتے ہیں، معاشرے میں ایک لاش یا عضوِ معطل بن کر رہنے کا حق تمہیں کس نے دیا؟ کیا یہاں عضوِ معطل قسم کے لوگوں کی کمی ہے؟"

"ایک ان میں سے میں بھی سہی۔"

"یہ کہنے کی اگر ہر فرد کو اجازت دے دی جائے تو پھر یہ معاشرہ اپاہج ہو جائے گا۔"

"میں کسی معاشرے کی باسی نہیں ہوں۔ میرا کسی سوسائٹی سے کوئی تعلق نہیں ہے میں کسی کی کچھ نہیں لگتی۔ میرا کوئی رشتہ دار نہیں ہے۔ اس لئے مجھے میرے حال پہ چھوڑ دیں۔"

"تم جھوٹ بول رہی ہو مسز شفیق تمہاری امّی ہیں۔ اگر خدانخواستہ انہیں کچھ ہو جائے تو تم بلک بلک کر روؤ گی اور کہو گی 'ماں اس حال میں تو بُجی ساتھ چھوڑ گئی ہو۔ مونا تمہاری بیٹی ہے۔ اگر اسے کوئی تم سے چھین لے۔ فرض کرو اس کا باپ ہی تم۔۔۔۔"

"ڈاکٹر۔" فری زور سے چیخی۔ "خدا کے لئے خاموش ہو جائیے۔ مجھ پہ رحم کیجئے۔ میں قابلِ رحم ہوں۔" آج فری چُپ چاپ آنسو بہاتی رہی اور اس نے کچھ نہیں کہا۔

ایک ماہ میں فری کافی تندرست ہوگئی تھی یا تندرستی کی طرف مائل تھی یا پھر اس میں سکت نہیں رہی تھی کہ ڈاکٹر کو اپنے راستے سے ہٹاتی یا علاج سے منع کرتی نہ جانے ڈاکٹر جادو اور مسز شفیق کے مابین کیا ساز باز ہوتی تھی کہ ڈاکٹر جادو باقاعدگی سے سرِ شام دو گھنٹے کے لئے آتا۔ اس وقت مسز شفیق کلینک کا چکر لگانے چلی جاتیں اور آیا بچی کو لے کر ایسی غائب ہوتی کہ اس وقت نظر آتی جب ڈاکٹر جادو کی کار سڑک پار کر جاتی۔ گھر میں بالکل سناٹا تھا۔ ایسا سناٹا کہ اگر فری اکیلی ہوتی تو خوف سے چلّانے لگتی۔

عجیب بات ہے کوئی ملنے والا بھی نہ آتا اور ایسے میں ڈاکٹر جادو کو اپنا جادو چلانے کا موقع مل گیا۔ وہ کہاں تک بھاگتی، چیختی، چلاتی ڈاکٹر جادو نے اسے چیخنے، چلّانے کپڑے پھاڑنے اور چہرہ بگاڑنے کے اس قدر مواقع فراہم کئے تھے کہ وہ خود ہی اس حربے سے عاجز آگئی تھی۔ اب اس کا دل چاہتا وہ اپنا غم زبان سے بیان کرے۔ آنسوؤں سے خارج کرے۔ مگر بہت آہستہ آہستہ۔ یہ نہیں کہ اس کا بغض اور کینہ دُور ہوگیا تھا۔ مردوں سے نفرت کا وہی عالم تھا اور جمال کا تو وہ نام بھی نہ سننا چاہتی تھی۔ بہرحال ڈاکٹر جادو کی بات پر وہ کان دھرنے لگی تھی۔

اس روز ڈاکٹر نے اس سے ڈائریکٹ سوال کر ڈالا کہ آخر وہ اپنے چہرے کو کیوں نوچ نوچ کر خراب کر لیتی ہے۔

"ڈاکٹر صاحب!" فری نے آہستگی سے کہا مجھے اپنے چہرے سے نفرت ہوگئی ہے۔ میں اپنے لئے کوئی دوسرا چہرہ لانا چاہتی ہوں۔ اس خوب صورت چہرے کی وجہ سے وہ مجھ سے نفرت کرتا تھا۔ شادی کے بعد اس نے مجھے اتنی مرتبہ خوبصورتی کا طعنہ دیا کہ حسن میری نظر میں ایک عیب بن گیا۔ اگر کبھی انڈا خراب ہوگیا تو طعنہ شکل وصورت کا ملا۔ کھانے میں دیر ہوتی تو حسن موردِ الزام ٹھہرا، لباس پر اعتراض کرنا ہوا تو صورت کو نشانہ بنایا۔ گفتگو پسند نہ آئی تو شکل میں خامی نکلی۔ بچی کی تربیت ٹھیک نہیں تو چہرے کا قصور ہے، گھر ٹھیک نہیں حسن آڑے آیا۔ غرض وہ اٹھتے بیٹھتے اس قدر طعنے دیتا کہ میرا دل چاہتا اپنے چہرے پر کالک مل لوں!"

فری نے ایک طویل سانس لے کر اپنی مٹھیاں کھولیں اور پھر بند کرلیں۔ "اور ڈاکٹر صاحب آپ کو تعجب ہوگا کہ کبھی کبھی میرا دل چاہتا ہے کہ اپنی بچی کا گلا گھونٹ دوں میری بچی جس کو میں جان سے زیادہ عزیز رکھتی ہوں۔ آنکھوں سے اوجھل ہو تو بے چین ہو اٹھتی ہوں۔ جب مجھے اپنے ماضی کا خیال آتا ہے اور اس کی صورت میں اپنی جھلک نظر آتی ہے تو میں طمانچے مار مار کر اس کا مُنہ لال کر دیتی ہوں۔ بچی روتی ہے چلاتی ہے۔ مگر میں چاہتی ہوں اس کا خوبصورت اور معصوم چہرہ بگاڑ دوں۔ تاکہ بعد میں کوئی بھی جمال اس کی زندگی کو نہ بگاڑ سکے۔" یہ سب کہہ کر فری نے استفہامیہ نظروں سے ڈاکٹر کی جانب دیکھا۔ ڈاکٹر مزے سے بیٹھا سگریٹ پھونکتا رہا۔ جیسے اس نے کچھ سُنا ہی نہیں۔

"ڈاکٹر صاحب!" فری چیخی۔ "آپ نے میری بات نہیں سُنی؟"

"سُنی ہے۔" وہ اطمینان سے بولا۔

"پھر جواب کیوں نہیں دیا؟"

"کیا جواب دوں؟"

"کچھ تو کہیئے!"

"ہوسکتا ہے جو کچھ میں کہوں وہ تمہیں پسند نہ آئے!"

"ممکن ہے مجھے پسند نہ آتے مگر کچھ تو کہیئے۔"

"فری! درحقیقت تمہارا شوہر تم سے بے پناہ عشق کرتا تھا۔ اپنے عشق میں وہ اس قدر حاسد ہو چکا تھا کہ یہ بھی پسند نہیں کرتا تھا کہ کوئی تمہاری طرف نظر بھر کے دیکھے اور پھر وہ اپنی رقابت میں خود ہی گرفتار ہو گیا تھا۔ وہ چاہتا تھا تم تمام عمر اسی کو چاہتی رہو۔ اس کے سوا کسی کی جانب نہ دیکھو۔ وہ ایک مبہم سے خوف میں مبتلا رہتا تھا اس لئے ہر وقت تمہیں تمہارے حسن کے طعنے دیتا رہتا تھا کہ تم بار بار یقین دہانی کرتی رہو کہ تم۔۔۔۔"

"ڈاکٹر۔۔۔ ڈاکٹر۔۔۔ ڈاکٹر۔۔۔" فری پاگلوں کی طرح چیخنے لگی۔ "تم بہت گھٹیا آدمی ہو ڈاکٹر۔ مجھے معلوم تھا تم اس کی طرفداری کرو گے۔۔۔ اس کی۔۔۔ کیونکہ تم مرد ہو۔ تمہیں میری تکلیف کا احساس نہیں کہ مجھ پر کیا قیامت گزر گئی اور کتنی قیامتیں روز گزرتی ہیں اور تم بھی۔۔۔ مہربانی کر کے مجھے تنہا چھوڑ دو۔"

اس کو پھر بہت دن بعد پاگل پن کا دورا پڑنے لگا وہ روتی رہی، چیختی رہی، چلاتی رہی اور ڈاکٹر اٹھ کر چلا گیا کئی بار وہ اسے نہ یانی کیفیت میں چھوڑ کر چلا جایا کرتا تھا۔ یہی وجہ ہے وہ جب اگلے روز آیا تو فری بالکل نارمل تھی۔ اس نے ڈاکٹر سے اپنے رویّے کی معافی مانگی اور بولی "مجھے خود سمجھ نہیں آتی میں اس طرح کیوں ہو جاتی ہوں۔ ظاہر ہے میں۔۔۔ آپ کو تو برا بھلا بالکل نہیں کہتی، جبکہ آپ نے میرا کچھ بگاڑا ہی نہیں۔ آپ چلے جاتے ہیں تو اپنے آپ پر جھنجلاتی رہتی ہوں۔ مگر پھر۔۔۔۔ نہ جانے کیوں۔"

ڈاکٹر نرمی سے مسکرایا اور بولا۔

"مجھے معلوم ہے تم کس کو گالیاں دیتی ہو اس لئے تم جب روئے سخن میری طرف کرلیتی ہو تو میں برا نہیں مانتا بلکہ چاہتا ہوں تم دل کا سارا غبار اس طرح نکال لو۔"

"بھلا کسے گالیاں دیتی ہوں میں؟" پھر خود ہی بوکھلا گئی بولی۔ "مت بتایئے گا مت بتایئے گا۔ مجھے معلوم ہے آپ جمال کا نام لیں گے، لیکن ڈاکٹر صاحب آپ مجھ سے ایک وعدہ کریں۔"

"کیسا وعدہ؟"

"وعدہ کریں جب تک آپ میرے معالج ہیں، علاج اور بحث کے دوران کبھی جمال کا نام تک نہیں لیں گے نہ اس کی وکالت کریں گے۔ اگر آپ نے وعدہ نہ کیا تو آج کے بعد میں آپ سے ملنا بند کر دوں گی۔"

ڈاکٹر پھر مسکرایا اور تھوڑی دیر خاموش رہ کر بولا۔

"وعدہ رہا۔۔۔ میں اب کبھی جمال کا نام نہیں لوں گا۔ صرف تمہارے متعلق باتیں کروں گا اور کسی کے متعلق نہیں۔"

اس دوستانہ معاہدے کے بعد ڈاکٹر گرمجوشی سے آتا رہا اور فری آہستہ آہستہ انسانوں کی دنیا میں آنے لگی۔ بحثیں تلخ بھی ہو جاتیں۔ راتیں بے خواب بھی گزرتیں، ماضی پریشان بھی کرتا۔ مگر جلد ہی وہ سمجھوتہ کرنے پہ آمادہ ہو جاتی۔ اب وہ اپنا چہرہ نہیں بگاڑتی تھی۔ مونا کے گلے بھی نہیں پیٹتی تھی۔ بلکہ اب ڈاکٹر کی موجودگی میں بھی مونا سے کھیلتی رہتی۔

اسی طرح تین ماہ بیت گئے۔ کبھی کبھی اسے غصہ بھی آتا کہ ڈاکٹر کیا گوند کی مانند چپک گیا ہے۔ اس نے اپنی ماں سے بھی کہا کہ وہ اب ذہنی طور پر بالکل ٹھیک ہے اس لئے ڈاکٹر کا آنا بند کر دیا جائے۔ مگر مسز شفیق نے اسے بتایا کہ ڈاکٹر کو چھ ماہ کی فیسیں ایڈوانس دی جا چکی ہیں۔ اس لئے خواہ وہ پسند کرے یا نہ کرے ڈاکٹر ضرور آئے گا۔

اس روز ایک عرصے کے بعد فری کا موڈ بہت اچھا تھا اس نے نہا دھو کر ہلکے زرد رنگ اور سیاہ پھولوں والی شفون کی ساڑھی پہنی اور اپنے الجھے ہوئے لمبے بالوں کو سنوار کر ان کی دو چوٹیاں گوندھیں اور ایک فیشن میگزین لے کر باہر لان میں چلی گئی ساون کی پہلی بارش ہو چکی تھی اور موسم کچھ خنک کچھ سرد ہو رہا تھا۔ ابھی اسے وہاں بیٹھے تھوڑی دیر ہی ہوئی تھی کہ ڈاکٹر بھی وہاں آ گیا۔ اب ڈاکٹر کی آمد اس کے لئے اچنبھے کا باعث نہ بنتی وہ اسے بھی روزمرہ کے کاموں کی طرح لیتی تھی۔ ڈاکٹر گھاس پر ہی اس کے پاس بیٹھ گیا۔ تھوڑی دیر وہ ادھر ادھر کی باتیں کرتے رہے۔ پھر فری میگزین دیکھنے میں مگن ہو گئی۔ ڈاکٹر کو نہ جانے کیا سوجھی اس کی طرف غور سے دیکھتا ہوا بولا۔

"فری تم سمجھتی ہو کہ تم انتہائی خوب صورت لڑکی ہو مگر میری نظر میں تم ایک عام سی لڑکی ہو۔"

"جی ——؟" فری حیرت سے ڈاکٹر کا منہ تکنے لگی۔

"ہاں ہاں سچ کہہ رہا ہوں تم میں واقعی کوئی ایسی بات نہیں ہے کہ تمہیں چاند کا ٹکڑا یا حسنِ عالم کہا جائے۔"

"جی —— جی —— میں آپ کا مطلب نہیں سمجھی۔" فری سٹ پٹا گئی۔ "جی اب میں آپ کو کیسے سمجھاؤں؟ اور سمجھاؤں بھی کیوں جبکہ حسن کا معیار سب کی نگاہ میں الگ

الگ ہوتا ہے۔"

"ہوں ——" فری نے ایک طویل سانس لی اور پہلی بار ڈاکٹر کے سراپے کو غور سے دیکھا اور پھر یہ دیکھ کر وہ حیران رہ گئی کہ آج سے پہلے اس نے ڈاکٹر کو اس انداز سے نہ دیکھا تھا۔ وہ خوبصورتی کا ایک مکمل نمونہ تھا۔ چھ فٹ سے نکلتا ہوا قد۔ سرخ اور سنہری رنگت، سیاہ گہری اور چمکدار آنکھیں۔ خوبصورت گھنے بال۔ چوڑی پیشانی۔ بڑا ہی اسمارٹ، بڑا ہی ہینڈسم —— فری نے اس کا جائزہ لے کر آنکھیں جھکا لیں، اتنے خوبرو آدمی فی زمانہ دیکھنے میں کم آتے ہیں۔

"کیوں لے چکیں میرا جائزہ؟" اب کے ڈاکٹر نے فری کو پھر چونکا دیا۔ مگر اس نے جھوٹ بولنا مناسب نہ سمجھا بولی۔

"جی ——"

"پھر کیسا پایا ہے؟"

"آپ خوب صورت مردوں میں شمار ہوتے ہیں۔"

"لفظ خوب صورت عورتوں کے لئے مختص ہے۔" ڈاکٹر زور سے ہنسا، مگر..."

"مگر آپ نہیں جانتے ڈاکٹر صاحب مجھے خوش شکل مردوں سے ہمیشہ نفرت رہی ہے۔"

"کیوں؟"

"نہ معلوم کیوں؟ جب میں کنواری تھی اور کسی خوبصورت سے لڑکے کا رشتہ میرے لئے آتا تھا تو میں انکار کر دیتی تھی۔"

"اس لئے کہ آپ کے خیال میں آپ خود انتہائی خوبصورت تھیں۔ آپ یہ چاہتی تھیں کہ آپ کو پوجا جائے، چاہا جائے اور آپ کے خیال میں خوبصورت مرد خود پرست ہوتے ہیں۔ اس لئے انہیں چاہنے اور پوجنے کی فرصت نہیں ہوتی۔ پھر یہ کہ لڑکی کو اُن کی طرف سے دھڑکا ہی لگا رہتا ہے۔ جانے کب کوئی پری وش اُن کو لے اُڑے۔"

"جی —— جی —— جی۔" فری نے پلکیں جھپکائیں۔

"اور تم چاہتی تھیں ایک نارمل سا آدمی ہو اور..."

"جی ـــ جی ـــ" فری جلدی سے بولی۔

"لیکن فری تمہیں شاید معلوم نہیں مرد سارے خود پرست ہی ہوتے ہیں۔ شادی سے پہلے وہ ہر دم جان فدا کرنے کو تیار رہتے ہیں.... مگر شادی کے بعد وہ صرف اپنی پرستش کروانا چاہتے ہیں۔ خواہ لڑکی بدصورت ہو یا خوب صورت۔"

"شاید آپ ٹھیک کہتے ہیں۔" فری اداس ہوگئی۔

"اور تمہیں معلوم ہے اکثر خوبصورت مرد، بدصورت لڑکیوں سے شادی کر لیتے ہیں۔"

"کیوں؟"

"بالکل وہی وجہ جو تم نے بیان کی ہے۔"

"اچھا ـــ" فری نہ جانے کیوں غمگین ہوگئی۔ پشیمان بھی پھر سوچتے سوچتے وہ گہری خاموشیوں میں ڈوب گئی۔ ایسی خاموشی جس میں ماضی قریب کے کانٹے اور ماضی بعید کے پھول مہک رہے تھے۔ اس کا تن من خاموشی میں ڈوبتا چلا گیا پھر وہ کھو گئی دنیا و مافیہا سے بے خبر ہوگئی اور ڈاکٹر اُسے دریائے سکوت میں غوطہ زن چھوڑ کر چل دیا۔

کبھی خاموش طوفانوں میں اور کبھی ہذیانی جھگڑوں میں ڈاکٹر نے اُس کے ذہن و دل کو از سرِ نو کام کرنے پر مجبور کر دیا تھا۔ اب اسے صبر سا آ گیا تھا کہ جو کچھ اس کے ساتھ ہوا ہے۔ کچھ انوکھا نہیں۔ دنیا تجربات کا گھر ہے۔ زندگی کا سفر ایسا ہے۔ جس میں شروع سے لے کر آخر تک غیر متوقع اور حیرت انگیز واقعات ہوتے ہیں۔ ان حادثات سے دل برداشتہ ہو کر زندگی کو ناکارہ بنا لینا کہاں کا انصاف ہے۔ یہ تو نہیں کہ اس کے دکھ میں کمی آ گئی تھی، مگر وہ جو ناسور ہر دم رِستا رہتا تھا، وہ ٹھہر گیا تھا اور اس طرح دن گزرتے رہے۔ اس کی عدّت کی مدّت بھی ختم ہوگئی ـــ تو یہ وقت کا چکر تو ٹھہرتا ہی نہیں ـــ تھمتا ہی نہیں ـــ زخم نہیں دیکھتا، لہو نہیں دیکھتا۔ بس اپنی دُھن میں رواں دواں رہتا ہے اور انسان کتنا مجبور ہے۔ رو دھو کر، چیخ، چلّا کر، اپنی بے بسی کا اچھی طرح ماتم کر کے، پھر اس چکر کے ساتھ بھاگنا شروع کر دیتا ہے۔

اس راہرو کی طرح جس کی زندگی کی تمام تر پونجی پہلے پڑاؤ پر راہزن نے لوٹ لی ہو اور وہ تہی دامن اور دل گرفتہ ہونے کے باوجود منزل کی جانب رواں ہو گیا ہو۔ فری بھی زندگی کو لے کر چل پڑی ـــ اب ڈاکٹر اُسے آؤٹنگ کے لئے بھی لے جاتا اُسے بڑا تعجب ہوتا کہ اس کی ماں، جو ایک زمانے میں سخت گیر عورت تھی اَب اُس کی کسی بات میں دخل نہ دیتی اور نہ کسی بات پر اعتراض کرتی۔ تنہائی میں اس کو ڈاکٹر جاوید پر بڑا غصہ آتا۔ آخر وہ اس کے

سامنے اس قدر بے بس کیوں ہو جاتی ہے ؟ یا واقعی وہ کوئی جادو جانتا ہے کہ اس کے سامنے اس کی حالت تابعدار شاگرد کی سی ہو جاتی ہے۔ ویسے ڈاکٹر جاوید نے کبھی اس میں کسی قسم کی غیر ضروری دلچسپی کا اظہار نہیں کیا تھا۔ تو وہ ذہنی طور پر اس قابل تھی کہ اتنی جلدی کسی دوسرے مرد کو قبول کر لیتی یا قریب آنے کا موقعہ دیتی۔ بس اسے کبھی کبھی الجھن ہونے لگتی۔ جب ڈاکٹر جاوید شام کو اپنی گاڑی میں بٹھا کر اسے گھمانے لے جاتا۔ وہ جہاں بھی لے جاتا، وہ خاموشی سے چل دیتی۔ کبھی کبھی وہ ریستوران میں بیٹھ کر چائے پیتے اس وقت فری کی حالت دیدنی ہوتی، وہ دیوانہ وار چاروں طرف دیکھتی رہتی اور سوچتی اگر اس وقت جمال اسے ڈاکٹر کے ساتھ دیکھ لے تو کیا سمجھے ؟ یہی کہ واقعی وہ آوارہ لڑکی ہے۔ ابھی سے دوسرے آدمیوں کے ساتھ پھرنا شروع کر دیا ہے۔ پھر اس کے اندر انتقام کے شعلے بلند ہونے لگتے اور وہ سوچتی کاش ! جمال کہیں سے آجائے اور اسے دیکھ کے جل جائے پھر کس قدر مزا آئے۔ وہ اسے مزید جلانے کی خاطر ڈاکٹر سے ہنس ہنس کر باتیں کرنے لگے گی، لیکن یہ بھی تو ممکن ہے کہ جمال کے ساتھ بھی کوئی خوبرو لڑکی ہو اور وہ بھی ہنس ہنس کر اس کا دل لبھا رہی ہو۔ اف وہ جھنجلا جاتی۔ میں کیا ہر وقت اسی کے متعلق سوچتی رہتی ہوں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ جمال کے ساتھ کسی دوسری لڑکی کا تصور ہی نہیں کر سکتی تھی۔ اب اس کا جمال کے ساتھ کیا رشتہ تھا ؟ جو بھی رشتہ تھا ہمیشہ کے لئے ٹوٹ چکا تھا اور اس کی کوئی بھی شکل باقی نہیں رہی تھی لیکن اس کے باوجود اس نے کئی بار اپنے ذہن کی چوری پکڑی تھی کہ جمال کے متعلق وہ عجیب و غریب باتیں سوچتا ہے۔ اب اس گھر میں وہ کیسے رہتا ہوگا۔ ؟ اس بیڈ روم میں کیوں کر سوتا ہوگا ؟ یادوں کے ناگ اسے بھی پل پل آکر ڈستے ہوں گے .... کیا خبر یہ سب اس کی خام خیالی ہو ـــــ وہ خود بھی یہی کہتی، مگر نہ جانے کیوں ـــــ کوئی وقت ایسا نہ جاتا جب لاشعوری طور پر اس نے جمال کے بارے میں نہ سوچا ہو اور بڑی دیانت سے اپنا یہ پرابلم بھی اس نے ڈاکٹر جاوید کو بتا دیا تھا .... اور ڈاکٹر نے اسے اجازت دے دی تھی کہ وہ جی بھر کے جمال کے بارے میں سوچ لے اور پھر اپنی سوچ کے دروازوں پر پہرے دار بٹھا دے۔

تبھی جب کبھی ـــــ ریستوران کے خوبصورت ماحول میں وہ پیالی میں چمچ ہلاتے ہوئے اچانک کھو جاتی، تو ڈاکٹر مسکرا کر اس کے ہاتھ کو تھپتھپا دیتا۔

"پھر گھوڑے دوڑانے شروع کر دیئے"۔

"عجیب بات ہے، میں تو تمہاری موجودگی میں کبھی گم سم نہیں ہوتا۔ پھر تم میرے ہوتے ہوئے کیوں کھو جاتی ہو ؟"

"شاید اس لئے کہ میں نے آپ کو کبھی مرد نہیں سمجھا ـــــ" وہ سچائی سے بولی۔

"سبحان اللہ، یہ تو بالکل نیا انکشاف ہے، پھر تم مجھے کیا سمجھتی ہو ؟" فری نے بالکل محسوس نہیں کیا کہ اس نے کتنی بڑی بات کہہ دی ہے۔ اسی سادگی سے بولی۔

"آپ کی موجودگی مجھے کبھی محسوس نہیں ہوئی۔ آپ کے ساتھ تنہائی میں بیٹھنے سے کبھی خوف بھی نہیں آتا ـــــ آپ مجھے کچھ بھی نہیں لگتے۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ ایک بولنے اور سمجھنے والی مشین میرے ساتھ رہتی ہے"۔

"فری، اس بولنے اور سمجھنے والی مشین کا دل اور دماغ بھی ہے، اگر اس نے جذبات رکھنے کا ثبوت بھی دینا شروع کر دیا تو کیا کرو گی ؟ اتنا بڑا چیلنج نہ دو مجھے"۔

"کیسا چیلنج ڈاکٹر صاحب، میں آپ کی بات نہیں سمجھی اور میں جو محسوس کرتی ہوں صاف صاف کہہ دیا ہے"۔

اگلے دن ڈاکٹر آیا اور ادھر اُدھر کی چند باتوں کے بعد بڑے پُر اعتماد لہجے میں بولا۔

"میں کئی دن سے سوچ رہا ہوں کہ تمہارے ساتھ شادی کر لوں"۔

"کیوں ـــــ ؟" حیرت سے فری چونک اٹھی۔

ایسے ہی ـــــ تم پہلی لڑکی ہو جو مجھے اچھی لگنے لگی ہو، یا شاید میں تم سے محبت کرنے لگا ہوں"۔

"محبت ـــــ" فری نے نفرت سے منہ سکوڑا۔ محبت تو کوئی جذبہ ہی نہیں ہے مرد کے نزدیک، باقی رہی شادی تو میرے لئے اس جہان میں کوئی مرد نہیں

"ترس کھانے کی مجھے ضرورت نہیں، ترس کھانے کو دنیا میں اور لوگ کیا کم ہیں۔ میرا خیال ہے میرے جیسے انسان کی۔ تم بہت اچھی بیوی ثابت ہو سکتی ہو، ایک چوٹ کھائی ہوئی لڑکی قیمتی موتی بن جاتی ہے۔ ـــــ تم نہیں جانتیں میرے لئے تم کیا ہو؟"

"خبر نہیں آپ کیا کہہ رہے ہیں، مَیں سوچنے سمجھنے کی ہر منزل سے گزر چکی ہوں۔ شادی کا لفظ میری لغت سے کہیں کھو گیا ہے ـــــ مَیں آپ کے ساتھ ہرگز شادی نہیں کروں گی کبھی بھی نہیں۔"

"کوئی بات نہیں، مَیں تمہیں اور موقع دوں گا اور جگاؤں گا اور مناؤں گا انتظار سے مَیں نہیں گھبراتا۔"

ڈاکٹر چلا گیا ـــــ فری سارا دن اُداس رہی، یہ اداسی اگلے دن بھی اس کے گلے کا ہار تھی۔۔۔۔ نہ جانے یہ زندگی کیوں کر بسر ہو گی۔ انجانے دکھ ٹوٹ ٹوٹ کر اُس کے دامن میں گر رہے تھے۔ اس قدر ویران زندگی لگ رہی تھی آج اُسے پھر محسوس ہو رہا تھا کہ بھلاوؤں سے زندگی نہ بیت سکے گی وہ اس کھلاڑی کی مانند ہے جسے پہلی مات دوبارہ میدان میں جانے کے قابل نہیں چھوڑتی، اس کی پہلی مات جو آخری مات بن جاتی ہے۔ نہ اس نے کپڑے بدلے تھے نہ کنگھی ہی کی تھی۔ کچھ دن ہوئے ڈاکٹر جادُو نے اسے مشورہ دیا تھا کہ وہ ایم اے کے امتحان کی تیاری شروع کر دے اور ایم اے بھی نفسیات میں ـــــ ڈاکٹر نے بے شمار نفسیات کی کتابیں لا کر ڈھیر کر دی تھیں۔ اور کہا تھا۔ ناقابلِ فہم حصّوں پر نشان لگا کر چھوڑ دیا کرے۔ ڈاکٹر سمجھا دیا کرے گا۔

ہے۔"

"کمال کرتی ہو تم، مردوں کی اس قدر توہین؟"

"آپ اس کو توہین کہہ لیجئے میرے پاس وہ جذبات نہیں ہیں، مَیں تو سرد تو وہ ہوں کہ جب تک زندگی ہے جینا ہو گا۔ مگر زندگی کی حرارت اور جذبات کی گرمی میرے پاس نہیں ہے اور ایک لاش سے کوئی بیاہ کرنا پسند نہیں کرتا۔"

"بھئی تم اپنے متعلق خود ہی فیصلے کرتی رہتی ہو۔ ہم تمہارے اندر زندگی، حرارت حدّت اور شدّت پیدا کر دیں گے۔"

"ناممکن ڈاکٹر صاحب، یہ تو ذہنی طور پر ہوتا ہے۔ جب میرا ذہن ہی آپ کو قبول نہیں کرتا تو کوشش بے سُود ہے۔"

"کیوں بھئی، تمہارا ذہن مجھے کیوں قبول نہیں کرتا، کیا مَیں ایسا گیا گزرا ہوں ـــــ میری طرف دیکھ کر بتاؤ۔"

فری ہنسی ـــــ "آپ کو بہت ناز ہو گا اپنے اوپر ـــــ مگر۔"

"مگر کیا؟"

"مجھے خوبصورت مَردوں سے ہمیشہ نفرت رہی ہے۔ مَیں نے شاید پہلے بھی بتایا تھا"

"نہیں فری، تم شدید قسم کی غلط فہمی میں مبتلا ہو، مرد خوب صورت ہو یا بدصورت کوئی فرق نہیں پڑتا۔ اگر اس کا ذہن اور اندازِ فکر متوازن ہو۔ کئی مثالیں اس دنیا میں ایسی موجود ہیں کہ خوبصورت مَردوں نے اپنی بدصورت بیویوں کے ساتھ بے مثال محبت کی ـــــ اور کئی بدصورت مرد اپنی اچھی خاصی بیویوں کو جلا جلا کر مارتے رہے۔ یہ سب اپنی تربیت اور ذہنی اپج کا نتیجہ ہوتا ہے۔ کیا مَیں سطحی انداز کا دلدادہ ہوں یا مجھے اچھی سے اچھی لڑکی نہیں مل سکتی؟"

"جناب آپ اس شہر کی حسین ترین اور معروف ترین لڑکی سے شادی کر سکتے ہیں۔ پھر مجھ غریب پر نظرِ کرم کیوں ـــــ؟ مَیں جذبۂ ترحم سے بھی نفرت کرتی ہوں۔ کوئی مجھ پر ترس کھا کر مجھ سے شادی کرے مجھے منظور نہیں۔"

اس وقت وہ ڈرائنگ روم کے قالین پر بیٹھی کتابوں کو الٹ پلٹ کر دیکھ رہی تھی اور سوچ رہی تھی، دِل رنجیدہ ہو تو کوئی تحریر، کوئی کتاب، کوئی شے آسودگی نہیں بخش سکتی مگر سکون ہے کہاں؟ اتنے میں باہر گھنٹی بجی اور بچی کی آیا نے آکر بتایا کہ باہر ایک صاحب اس سے ملنے آئے ہیں۔ وہ اسی طرح قالین پر دو زانو بیٹھی رہی اور آیا سے کہا۔ ان صاحب کو اندر بھیج دو، جیسے وہ دنیا کی ہر ریت سے اور ہر رسم سے بے نیاز ہو چکی ہو، پھر وہ ایک موٹی کتاب کی ورق گردانی میں محو ہو گئی، محویت اس کی تب ٹوٹی۔ جب اسے دروازے میں ایک سائے کا شائبہ ہوا۔ نظر اٹھا کر دیکھا اور پھر ــــ اس کا اُوپر کا سانس اوپر اور تلے کا تلے رہ گیا۔

"جمال"

"جمال"

"جمال"

اُس کے اندر جھکڑ چلنے لگے، آندھیاں اٹھنے لگیں، بگولے دوڑنے لگے، سانسوں کا زیر و بم اُس کے اختیار میں نہ رہا۔ رنگت اڑ گئی اور حیرت سے آنکھیں پھاڑے وہ نووارد کو دیکھنے لگی، جیسے اس نے اُسے پہچانا نہیں، یا جانا نہیں یا پہلے کبھی دیکھا نہیں۔ دیکھا تھا تو کہاں، کب؟

"یہ کون ہے؟ جو ایک ہالے ہوتے جواری کی مانند کھڑا ہے۔ کون ہے ــــ کون ہے ــــ کون ہے؟

اس کے تن من کی ساری کھڑکیاں، سارے دروازے بجنے لگے، کون ہو تم ــــ کون ہو تم ــــ کون ہو تم ــــ؟

اس کی پلک پلک پہ استفسار اور اجنبیت کے دیپ جلے۔ وہ کون تھا۔ جو کبھی اپنا تھا، اب کچھ بھی نہیں تھا۔

وہ سایہ تھا ــــ ہیولا تھا ــــ کہ خواب۔

وہ کوئی پچھلا جنم تھا ــــ پچھلی رات کا سندر سپنا تھا یا ڈوبتے سورج کا سایا۔

چُپ چاپ دروازے میں کھڑا تھا۔ اور اسی طرح فری کو دیکھ رہا تھا، جس طرح فری اسے دیکھ رہی تھی اور پھر دونوں کو اچانک آیا کی موجودگی کا احساس ہو گیا۔ جو جمال کو تیسری بار بیٹھنے کے لئے کہہ رہی تھی ــــ جمال ایک شکست خوردہ چال چلتا ہوا آیا اور جہاں فری دو زانو مجسمہ بنی بیٹھی تھی وہیں صوفے پہ بیٹھ گیا اور مری ہوئی آواز میں بولا

"مَیں مونا سے ملنے آیا ہوں"

تب فری کو یاد آیا، طلاق کے وقت طے ہوا تھا کہ مونا اپنی ماں کے پاس ہی رہے گی، جمال اس کے اخراجات ادا کرے گا اور جس وقت چاہے گا آکر اس سے مل لیا کرے گا۔

"تو یہ ... یہ اس لئے آیا ہے" فری کے حواس واپس آنا شروع ہو گئے۔

"مونا کو لاڈ آیا" فری نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

"بی بی مونا کو مَیں ابھی سُلا کر آئی ہوں" پیشتر اس کے کہ فری کچھ کہتی، آیا جلدی سے بولی۔

ساری رات بے بی کے پیٹ میں درد رہا۔ اس وجہ سے وہ رات بھر سو نہیں سکی۔ اب ڈاکٹر کی دوا کھلا کر سُلا آئی ہوں۔ اگر آپ اس وقت نہ جگائیں تو آپ کی مہربانی ہو گی" ابھی فری کوئی فیصلہ نہ کر پائی تھی کہ جمال کھڑا ہو گیا۔

کوئی بات نہیں، بچی کو سونے دو، میں کل اس وقت پھر آجاؤں گا۔" اس نے جانے سے پہلے ایک اداس نظر فری پر ڈالی۔ وہ روٹھی رانی بنی بیٹھی تھی۔ اس نے نظریں جھکالیں۔ یا شاید کوئی انتقامی جذبہ اس کے دل میں امنڈ آیا کہ اس نے اپنے چہرے کو بالکل کھردرا اور اجنبی بنا لیا۔ جمال کو کچھ کہنے کا حوصلہ نہ ہوا۔ مرے مرے قدموں سے باہر چلا گیا۔ ان جاتے ہوئے مایوس قدموں کو اور اس دل برداشتہ شخص کو فری دُور تک جاتے ہوئے دیکھتی رہی۔ یہ وہ جمال تو نہیں تھا۔ سجیلا۔ نرالا اکڑوں۔ میلا سا کرتہ پاجامہ، داڑھی بڑھی ہوئی۔ رنگت سنولائی ہوئی۔ چہرہ بے رونق ـــــ اس کو کیا ہوا ہے، کیا بیمار رہا ہے۔ یا ـــ یا ـــ فری کو خوشی محسوس ہونے لگی کہ اسے برباد کرکے وہ خود بھی پامال ہوگیا ہے، تباہ ہوگیا ہے۔ اچھا ہوا ہے۔ ایسے خود پسند مردوں کا یہی حشر ہونا چاہیئے، لیکن یہ خوشی بھی دیر پا ثابت نہ ہوئی۔ تھوڑی دیر بعد وہ بے کل ہوگئی۔ اسے ایسا لگا جیسے ایک کانٹا سا دل میں چبھ گیا ہے۔ ایک پھانس سی گلے میں اٹک گئی ہے۔ تو وہ بھی میری طرح ناشاد ہے، بے سکون ہے۔ پریشان ہے، پشیمان ہے ـــ کتنا ہارا ہوا لگ رہا تھا اور یہ اخلاق کا کونسا پہلو تھا کہ اس نے اسے پانی تک کو نہیں پوچھا چلو وہ اس کا دشمن تھا مگر آج ہار مان کر اس کے دوارے چلا آیا تھا، خواہ بچی کی محبت سے مجبور ہوکر۔ گھر آئے ہوئے انسان کے ساتھ اس طرح بداخلاقی سے نہیں پیش آتے۔ پھر وہ تو ایک عمر کا رفیق بھی رہ چکا ہے۔ کیا ہوا جو راہیں منزل سے پہلے ہی جدا ہوگئیں۔ اس پچھتاوے کے ساتھ ہی اس کا مزاج برہم ہونے لگا۔ وہ حیران اور ساکت پر برس پڑی۔ جو ابھی تک اس اجنبی کی پراسرار آمد و رفت کے متعلق سوچ رہی تھی۔ یہ آیا اس نے ماں کے گھر آکر رکھی تھی۔ اس لئے اس نے مونا کے ابّو کو نہیں دیکھا تھا۔ جب فری نے اسے ڈانٹ پلائی کہ وہ اتنی غیر مہذب ہے کہ گھر آئے مہمان کو چائے تک کے لئے نہ کہا اور سر پر تن کر کھڑی رہی تو اسے کچھ کچھ سمجھ آگئی۔

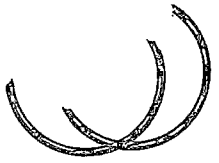

دوسرے دن اگرچہ اسے جمال کا انتظار نہیں تھا۔ ہوتا بھی کیوں؟ اب انتظار فضول تھا۔ پھر بھی ایک بے چینی نے سارا وقت اسے گھیرے رکھا۔ بارہ بجے کے قریب اس پر انقلابی کیفیت طاری ہونے لگی۔ کبھی وہ سوچتی صاف ستھرے کپڑے پہن لے پھر کہتی میرا کیا مطلب ـــ ایسی بے ہودہ شکل بنا کر بیٹھی رہنے سے کہیں وہ یہ نہ سمجھ لے کہ میں بھی پچھتا رہی ہوں اور کہیں تیار ہوجانے سے وہ یہ نہ سمجھ لے کہ میں بڑی خوش ہوں۔ مگر مجھے سامنے جانے کی ضرورت کیا ہے۔ بہرحال اس نے وقت سے پہلے بچی کو اچھی طرح بنا سنوار دیا اور ذہنی طور پر اُسے باپ سے ملنے کے لئے آمادہ بھی کردیا اور خود ـــ نہ چاہتے ہوئے بھی ڈرائنگ روم میں اسی جگہ جاکر بیٹھ گئی۔ بیل ہوئی تو آیا ہدایت کے مطابق بچی کو باہر لے گئی لیکن تھوڑی دیر بعد جمال بچی کو گود میں اٹھائے ڈرائنگ روم میں چلا آیا۔

آج جمال کا حلیہ قدرے بہتر تھا۔ شیو کی ہوئی تھی۔ کپڑے بھی صاف ستھرے تھے۔ البتہ بہت کمزور اور زرد لگ رہا تھا۔ آیا باورچی خانے سے چائے لینے دوڑ گئی اور وہ دونوں کمرے میں اکیلے رہ گئے۔ خدا معلوم جمال اس کو دیکھ رہا تھا یا نہیں فری نے تو نگاہ ہی نہیں اٹھائی تھی۔ ایک کتاب پر نظریں جمائے بیٹھی رہی۔ باپ بیٹی خوب باتیں کرتے رہے۔ پھر مونا ڈھیر سارے کھلونے اٹھا اٹھا کر فری کو دکھانے لگی۔

"دیکھیں امّی! ابّو میرے لئے کتنی چیزیں لائے ہیں۔" بچّی کی خوشنودی کی خاطر اس نے سب چیزیں دیکھیں مگر اُس کا دل چاہا وہ کہے۔ بے وقوف! تم بھی کھلونے لے کر بہل گئی ہو پھر نہ جانے ساڑھے تین سال کی مونا کو کیا ہوا کہ ایک دم بولی۔

"ابّو آپ امّی کے لئے کیا لائے ہیں؟" جمال چُپ ہو گیا

"لائے ہیں ـــــ نہیں؟" جمال نے صرف سر ہلایا۔

"کیوں نہیں لائے آپ گندے ابّو ہیں"۔ یہ کہہ کر مونا چیخ چیخ کر رونے لگی۔ "جائیں میں آپ کی بیٹی نہیں ہوں۔ میں امّی کی بیٹی ہوں" اور وہ مچلنے لگی۔

"بھئی آج ہمیں معاف کر دو کل ضرور آپ کی امّی کے لئے ڈھیر ساری چیزیں لاؤں گا۔"

لیکن مونا ضد میں آ گئی اور اپنے تمام کھلونے اٹھا اٹھا کر دُور پھینک دیئے پھر زور زور سے رونے لگی۔ فری اور جمال باری باری بچّی کو چمکارنے اور چُپ کرانے لگے۔ مگر وہ جس طرح اس روز مچل رہی تھی۔ کبھی پہلے اس طرح نہیں مچلی وہ دونوں کے قابو نہیں آ رہی تھی ـــــ جانے اس کے ننھے سے ذہن میں کیا تھا جس کو وہ اس طرح ظاہر کر رہی تھی۔ وہ دونوں اگر چہ اسے پچکار رہے تھے مگر ایک دوسرے سے بات نہیں کر رہے تھے تھوڑی دیر بعد اگر بچّی نے یہی سوال کر ڈالا تو کیا ہو گا؟

نہ جانے کس وقت کی دکھی ہوئی فری کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اتنے میں آیا چائے لے کر نمودار ہوئی اس کی جان میں جان آئی وہ آیا کو بچّی کے سنبھالنے کا کہہ کر اپنے کمرے میں آ گئی تاکہ جی بھر کر روئے اور اپنے جی کی بھڑاس نکال لے لیکن ایک بات کا اس نے بالکل خیال نہ کیا اس کی آنکھوں کے بہتے آنسو جمال نے بھی دیکھ لئے تھے پھر جمال کب گیا ـــــ اور بچّی کیوں کر چپ ہوئی۔ فری تو شام کے چھ بجے ہی کمرے سے باہر نکلی۔

ڈاکٹر جاوید بھی تین روز کے دورے پر کسی دوسرے شہر گیا ہوا تھا۔ وہ اپنا دل ہلکا کرتی بھی تو کس کے پاس جا کر ـــــ چنانچہ رات بھر اُس نے آنسوؤں پر اکتفا کیا ـــــ کبھی یادوں کے پھُول سمیٹے ـــــ کبھی اُن دفینوں کو آگ دکھائی۔

رات جو طوفان آیا تھا وہ اچھی طرح کھل کر برسا، صبح مطلع بالکل صاف تھا۔ فری نے جیسے پھر وقت کے ساتھ سمجھوتا کر لیا تھا۔ یہ سوچ کر کہ ایسے تکلیف دہ اور کربناک موڑ زندگی میں بار بار آئیں گے ان کے لئے تیار رہنا چاہیئے۔ اگلے دن بڑے اطمینان سے اس نے اپنا کمرہ سنوارا، جو ڈریسنگ روم سے ملحقہ تھا۔ ساری کتابیں قرینے سے لگائیں اپنے روزمرّہ کے کپڑے درست کر کے ہینگروں میں لٹکائے۔ یہ کام کرتے اسے گیارہ بج گئے۔ اس کے بعد نہا دھو کر ـــــ بال سنوار کر ـــــ اپنی دانست میں وہ اچھی بچّی بن کر کتابوں والی میز کے سامنے ایک کرسی پر آ کر بیٹھ گئی۔ کچھ دیر پہلے اس نے مونا کو تیار کر کے آیا کے ساتھ باہر بھیج دیا۔ اب چاہ رہی تھی، خدا کا نام لے کر باقاعدہ پڑھائی شروع کر دے۔ کیونکہ کل ڈاکٹر جاوید آنے والا تھا اور اسے ان تین دنوں کی رپورٹ دینا تھی سب کتابوں کا باری باری جائزہ لے کر اس نے اپنی مرضی کی ایک کتاب اٹھائی۔ مشکل جگہوں پر نشان لگانے کے لئے سرخ پنسل ہاتھ میں لی اور سطور میں گم ہو گئی۔ نہ جانے اس کو اب کیا ہو گیا تھا کہ وہ جو کام شروع کرتی اس میں اس طرح ڈوب جاتی کہ اسے اِرد گرد کا ہوش نہ رہتا یا وہ خود اپنا وجود بھلا دینے کے لئے اپنے اوپر ایک محویت طاری کر لیتی تھی اسے یکایک کمرے میں کسی بھوت کی موجودگی کا ایک انجانا سا احساس ہوا، خوف زدہ ہو کر

اس نے جو نگاہ اٹھائی تو واقعی اس کی وہی حالت ہوئی جو اچانک بھوت دیکھ کر ہوتی ہے۔

دروازے میں جمال کھڑا تھا۔

سرتاپا التجا بن کے۔

جب اس نے اپنے اچنبھے پہ قابو پالیا تو اسے ایک دم طیش آگیا۔ یہ بھی کوئی آنے کا انداز ہے۔ نہ گھنٹی نہ چاپ ـــــ چاہے ڈر کے مارے دوسرے کی جان نکل جائے اور پھر اب صاحب بہادر کس برتے پر یوں بے تکلفی سے میرے کمرے میں دندناتے چلے آئے ہیں۔ شاید جمال نے فری کے چہرے کی بنتی مٹتی ساری تحریریں پڑھ لی تھیں۔ اس لئے بڑی حلیمی سے بولا۔

"میں کافی دیر تک کال بیل بجاتا رہا کوئی باہر نہ آیا۔ البتہ باہر کا دروازہ کھلا تھا اندر آگیا، اندر آکر بھی آیا کو پکارا جب کوئی جواب نہ ملا تو مجبوراً آپ کے کمرے میں آنا پڑا۔"

آپ کا کمرہ ـــــ ؟ اللہ رے تفاوت ـــــ فری اندر ہی اندر تڑپ کر رہ گئی۔ کہاں وہ تو تڑاخ اور کہاں یہ اجنبیت ـــــ بہرحال وہ اس کی نرم گفتاری سے پسیج گئی، مگر وہیں بیٹھے بیٹھے بولی۔

"آیا بچی کو لے کر شاید ساتھ والی کوٹھی میں گئی ہے۔ آپ ڈرائنگ روم میں بیٹھیں میں بلوا دیتی ہوں۔" جمال ایک تابعدار بچے کی مانند جانے کو مڑا۔ لیکن پھر کچھ سوچ کر ٹھہر گیا اس نے غور سے فری کے چہرے کو دیکھا۔ پھر وہیں کھڑے کھڑے بولا۔ "آج مونا سے ملنے نہیں آیا۔

"تو . . . . ؟" فری نے بیگانگی سے ماتھے پہ بل ڈالے۔

جمال نے کہا: "آج تو میں ـــــ آپ سے ملنے آیا ہوں۔"

"جی ـــــ مجھ سے"؟ حیرت کے مارے فری کھڑی ہو گئی۔

مگر پھر اس نے صرف اتنا دیکھا کہ جمال بجلی کی سی تیزی سے آیا اور کھڑی ہوئی فری کی ٹانگوں سے لپٹ گیا اور بچوں کی طرح بلک بلک کر رونے لگا۔ فری کی سمجھ میں کچھ

نہیں آیا کہ یہ کیا ہو رہا ہے۔ اس کو یوں محسوس ہوا۔ اس کا سارا جسم لرز رہا ہے۔ اگر وہ بیٹھ نہ گئی تو گر جائے گی۔ وہ کرسی پہ بیٹھ گئی۔

جمال نے ننھے بچوں کی طرح اس کی ٹانگوں کے گرد اپنی بانہوں کا ہالہ بنائے رکھا اور رو دیئے گیا۔ اس کے بازوؤں کی گرفت اتنی مضبوط تھی کہ اگر فری کوشش بھی کرتی تو نہ چھڑا سکتی۔ بالآخر اسی نے اپنا آنسوؤں سے تر چہرہ اوپر اٹھایا اور بولا۔

"فری! اتنی بے درد بننے کی کوشش نہ کرو۔ خدا کے لئے اتنی بیگانہ بن کر نہ دکھاؤ۔ یہ ضرور ہے کہ اب ہمارا کوئی رشتہ نہیں۔ لیکن کیا ہم اچھے دوستوں کی طرح نہیں مل سکتے؟"

"جمال۔" فری گلوگیر آواز میں بولی۔ "اب دبی ہوئی راکھ کو نہ کریدو۔ تم نے جو چاہا وہ ہو گیا۔ اس میں میرا کتنا قصور تھا اور تمہارا کتنا۔ اب یہ باتیں کرنے کا وقت نہیں ہے اور باقی سب کچھ فریبِ نظر ہے۔ اگر ہم اچھے ساتھی بن کر نہ رہ سکے تو اچھے دوست بھی نہیں بن سکتے۔ تم بھی سب کچھ بھول جاؤ اور نئے سرے سے اپنی زندگی شروع کر لو۔"

"کیسے کر لوں فری، اتنے بہت سارے دن ہو گئے خود کو فریب دیتے ہوئے مجھے تو اب محسوس ہوا ہے جیسے میں ایک خواب سے جاگا ہوں۔ خدا کی قسم میں نے کبھی سوچا بھی نہ تھا کہ میں تمہارے بغیر نہ رہ سکوں گا۔"

"سوچا تو میں نے بھی ایسا نہیں تھا مگر حالات انسان کو جینا سکھا دیتے ہیں۔"

"نہیں! فری نہیں ـــــ میں اس تلخ حقیقت کو قبول نہیں کر سکتا اور نہ کسی مذہب اور ملت کا قائل ہوں، بس تم مجھے بخش دو، فری میرے گناہ بخش دو۔" اس نے فری کے دونوں پاؤں پکڑ لئے۔ "واپس اپنے گھر چلو۔"

"میرا گھر؟" فری طنز سے مسکرائی۔ "میرا کوئی گھر نہیں ہے جمال، مجھے پچھلے چند مہینوں سے احساس ہوا ہے کہ میں ایک تن تنہا وجود ہوں۔ میرا کوئی گھر کوئی ٹھکانہ نہیں ہے۔"

"فری او فری۔" جمال اس کو جھنجوڑنے لگا، "خدا کے لئے مجھے معاف کر دو۔ میں دیکھ رہا ہوں اس حالت میں تم بھی خوش نہیں ہو۔ میں بھی دکھی ہوں، تو پھر کیوں نہ ہم ایک

ہو جائیں۔"

جمال! تم ہمیشہ سے خود غرض رہے ہو، لیکن یہ تمہاری بنائی ہوئی دنیا اور اپنی بنائی ہوئی دنیا کے جال میں اس مرتبہ تم خود پھنس چکے ہو۔ اب میرا تمہارا ساتھ ناممکن ہے، اور پھر ابھی تو میں اس نفرت کو نہیں بھولی جو تم میرے ساتھ کرتے تھے۔"

"وہ نفرت نہیں تھی فری وہ نفرت نہیں تھی۔ وہ تو اتنی شدید محبت تھی جس کا اندازہ مجھے بھی اب ہوا ہے۔"

"لیکن مجھے اب اس کا احساس نہ دلاؤ جمال۔ میں تمہیں ایک ظالم انسان سمجھ کر بھول جانا چاہتی ہوں۔"

"فری۔" جمال اس کے پاؤں چھوڑ کر سامنے فرش پر بیٹھ گیا۔ "میں مانتا ہوں میں نے تم پر بہت ظلم کئے ہیں۔ میں جانتا ہوں میں مجرم ہوں مجھے اپنی سب کوتاہیوں کا احساس ہے۔ میں خود پسند تھا، حاسد تھا، مغرور تھا۔ کیوں کہ میں صرف شوہر تھا، صرف مرد تھا مگر جدائی کے اس عرصے نے میرے ذہن کو دنیاوی الائشوں سے پاک کر دیا ہے، اپنے ہاتھوں سے اپنی خوشیوں کا گلا گھونٹ کر مجھے سچائی کو پرکھنا آ گیا ہے۔ اب میں صرف ایک انسان ہوں، محبت کرنے والا انسان۔ ہاں! میں نے تمہارے معصوم ذہن کو زہر آلود کیا ہے۔ تم ایک وفا شعار اور مخلص بیوی تھیں مگر میں ہمیشہ تمہارے خلوص کو شک کی نگاہ سے دیکھتا رہا۔ تمہارے بھی کچھ خواب تھے۔ آرزوئیں تھیں، تمنائیں تھیں۔ مگر حسد کی آگ میں جل کر میں انہیں پامال کرتا رہا۔ مجھے تمہیں رُلا رُلا کر تڑپا کر مزہ آتا تھا۔ پھر تم بھی بدل گئیں بلی سے شیرنی گئیں، بات بات پر الجھنے لگیں۔ مقابلے پر اتر آئیں۔ اپنی اَنا کی توہین تم نے گوارا نہ کی۔ تمہارا پاکیزہ حسن تمہارا سرمایا تھا۔ میں نے تمہارے سرمائے پر کیچڑ اچھال کر تمہیں تہی دست بنانے کی کوشش کی، تمہاری نسائیت کو جی بھر کر روندا۔ پھر تم کہاں تک صبر کرتیں۔ تم نے جو کچھ کیا بہت اچھا کیا۔ میں تم سے فرشتوں کے سے سلوک کا متمنی کیوں ہوتا جس بات کی ابتدا میں نے کی تھی اس کو انتہا تک پہنچانے میں اگر تمہارا بھی ہاتھ تھا تو میں تمہیں قصوروار کیوں کہوں۔ میں نے تمہارا ہر قصور معاف کر دیا ہے۔ فری خدا کے

لئے تم بھی مجھے معاف کر دو۔" اس نے دونوں ہاتھ جوڑ دیئے۔

روتے روتے فری کی ہچکی بندھ گئی۔ یا اللہ۔ یہ کیسا اندھیر تھا۔ وہ ظالم اسکے قدموں میں بیٹھا اپنے ظلم کا اعتراف کر رہا تھا۔ ایک ہو جانے کی التجا کر رہا تھا۔ جب کہ ان کے درمیان میلوں کے فاصلے پیدا ہو گئے تھے۔ جن کو صدیاں بھی نہیں پاٹ سکتیں۔ کیا وہ اس قدر پاگل ہو چکا ہے کہ اس فرق کو نہیں سمجھ سکتا۔

"جمال! میرا تمہارا اب کوئی ناتا نہیں، کوئی واسطہ نہیں۔ وہ یہی کہے گئی۔ اب ناممکن ہے۔۔۔۔ ان باتوں کو تلخ اور ناخوشگوار باتیں سمجھ کر سرے سے بھلا دو۔"

"میں جانتا ہوں۔ سب جانتا ہوں۔" جمال دیوانوں کی طرح بڑبڑانے لگ گیا۔ "مجھے ایک ایک پل اور ایک ایک گھڑی یاد ہے۔ وہ لمحے یاد ہیں۔ جب میں نے تم کو اذیت دی مجھے وہ شام یاد ہے جب مونا ہونے والی تھی۔ تم پر بے پناہ روپ تھا۔ ایک شام تم نے کاسنی رنگ کا بڑا خوب صورت سوٹ پہنا تھا۔ بالوں کو سنوار کر ایک زرد گلاب دائیں جانب لگایا ہوا تھا۔ میں جب دفتر سے لوٹا اور تم جس قدر والہانہ انداز میں میری طرف بڑھیں میرا جی باغ باغ ہو گیا۔ وقت کا تقاضا تو یہ تھا کہ میں تمہیں دوڑ کر سینے سے لگا لیتا۔ مگر اُف جس قدر تم حسین لگ رہی تھیں وہ میری برداشت سے باہر تھا۔ میں نے سُن رکھا تھا کہ عورت حاملہ ہوتی ہے تو اس پر آسمانی روپ آ جاتا ہے، تو خدا کی قسم تم زمین کی مخلوق نہیں لگ رہی تھیں۔ تم کتنی حسین ہو گئی تھیں، یہ احساس تمہیں مجھ سے باغی نہ کر دے۔"

اس سوچ کے آتے ہی میں نے ماتھے پر بل ڈال لیئے اور تمہیں نظر انداز کر کے اندر چلا گیا۔ میں نے اچھی طرح محسوس کیا تھا کہ تم کٹ کر رہ گئیں تھیں، مرجھا گئی تھیں۔ تھوڑی دیر کھڑی اپنے ٹوٹے دل کو جوڑتی رہیں، پھر میرے پیچھے چلی آئیں۔ مجھے بے وقت بستر میں گھستے دیکھ کر بے تاب ہو گئیں اور محبت سے میرے قریب بیٹھ کر میرا حال پوچھنے لگیں۔ تمہاری وہ ادا بھی ایسی تھی کہ کلیجے میں اتار لینا چاہیئے تھا مگر میں نے کس بُری طرح تمہیں دھتکار دیا، یہ کہہ کر کہ تمہیں تو بننے سنورنے سے ہی فرصت نہیں تم کسی کے مسائل کیا جانو — جاؤ ڈریسنگ ٹیبل کو رونق بخشو۔ اس کے بعد رات تک تم خاموش رہیں۔ تم نے کپڑے بدل

ڈالے۔ شاید رات کو تم روئی بھی تھیں۔ میں تمہاری سسکیوں کی آواز سنتا رہا۔ تمہیں رُلا کر مجھے کس قدر مزا آرہا تھا۔ کیا بتاؤں؟ پھر کئی روز تک تم نے اچھے کپڑے نہیں پہنے تھے اور نہ ہی خود کو بنایا سنوارا تھا۔

"ہاں! مجھے وہ دن بھی یاد ہے۔ جب تم نے میرے کہنے پہ میرے دوستوں کی شاندار دعوت کی تھی اور سارا دن باورچی خانے میں گھسی رہی تھیں۔ کھانے بڑے مزیدار تھے اور ایک ایک دوست تمہارے حُسنِ سلیقہ اور لذتِ طعام کی تعریف کر رہا تھا اور مجھے یوں محسوس ہونے لگا در پردہ یہ لوگ تمہارے حسن کی تعریف کر رہے ہیں۔ میں اندر ہی اندر پیچ و تاب کھا رہا تھا۔ مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے تم میں کوئی بھی خوبی نہیں ہے۔ سوائے اس کے کہ تم جوان ہو، خوب صورت ہو اور لوگ کسی نہ کسی بہانے تمہاری تعریف کرنا چاہتے ہیں اور تمہارا دماغ آسمان پر چڑھ جاتا ہے اور میں تمہیں حقیر ذرہ نظر آتا ہوں۔ تم اگر ہنستیں تو مجھے یوں معلوم ہوتا ان کے ساتھ مل کر مجھ پر ہنس رہی ہو۔ سبھی دوستوں کے جانے کے بعد میں نے تم سے کہا تھا کہ اتنا واہیات کھانا پکاتی ہو۔ مجھے معلوم ہوتا تو کبھی انہیں نہ بلاتا اور تم کتنے بیہودہ انداز میں ہنس رہی تھیں۔ تمہیں تو محفلوں میں اُٹھنا بیٹھنا بھی نہیں آتا۔ تم نے میرے ساتھ بحث نہیں کی بلکہ اُداس سی ہو کر چپ ہو گئیں۔ مجھے تمہارے چپ ہو جانے پہ اور غصہ آیا۔ جیسے تمہیں میری پروا ہی نہیں۔ اگلے روز میں دفتر گیا تو میرے دوست نے فون پہ مجھے مبارک باد دی کہ مجھے اتنی اچھی بیوی نصیب ہوئی ہے۔ اس کی اس تعریف پہ مجھے اور بھی غصہ آیا۔ تبھی میں نے گھر آتے ہی تمہارے ساتھ لڑائی شروع کر دی اور کہا ہر وقت میرے اعصاب پہ سوار رہتی ہو۔ اگر تمہارا کوئی میکہ ہے تو وہاں چلی جایا کرو۔ میں سال کے بارہ مہینے تمہاری صورت دیکھ دیکھ کر اوب جاتا ہوں۔

"مجھے معلوم تھا یہ فقرے تمہیں بہت تکلیف پہنچائیں گے۔ مگر میں بھی تو تمہیں جلانا چاہتا تھا۔ حالانکہ تم جتنی بار میکے گئیں شام کو لوٹ آئیں۔ مجھے تمہاری یہ عادت بہت پسند تھی۔ تمہارے بغیر اس گھر میں، میں ایک رات بھی نہ رہ سکتا تھا۔ مگر اگلے دن

مجھے دھڑکا لگا ہوا تھا کہ کہیں تم سچ مچ غصے میں آکر چلی نہ جاؤ۔"

"مجھے یاد ہے۔" فری بڑی اداس آواز میں بولی۔ "میں نے بھی اگلے روز میکے جانے کا پورا منصوبہ کر لیا تھا۔ جب امی کو فون پہ اطلاع دی تو وہ بولیں آج کل میں دو تین آپریشن کر رہی ہوں اور اسپتال میں ہی رہتی ہوں۔ ابھی نہ آؤ اور مجھے اپنی قسمت پہ اتنا رونا آیا کہ بتا نہیں سکتی۔ جی چاہا زمین پھٹ جائے اور میں اس میں سما جاؤں مگر تمہیں اپنی شکل نہ دکھاؤں۔"

"اور جانتی ہو سارا دن دفتر میں میرا دل نہ لگا۔ بس جی چاہا اٹھ کر بھاگ جاؤں اور تمہیں گلے لگا کر اپنے الفاظ واپس لے لوں۔ جوں توں کر کے شام کو گھر آیا تو دیکھا تم بچی کو سُلا کر اطمینان سے بیٹھی ایک کتاب پڑھ رہی ہو۔ دل خوش ہو گیا۔ مگر پھر نہ جانے وہ بیمار آدمی کہاں سے نکل آیا۔ میں نے طنزاً کہا۔ اوہو۔ آپ تو یہیں تشریف رکھتی ہیں۔ میرا تو خیال تھا والدہ صاحبہ کے ہاں تشریف لے گئی ہوں گی۔ مجھے یاد ہے۔ اس رات تم مجھ سے الجھ پڑی تھیں شاید اب تمہاری برداشت سے باہر تھا اور اف وہ جھگڑا کس قدر بھیانک بن گیا تھا۔"

"اور فری اب تم آنسو نہ بہاؤ۔ میں تمہیں تکلیف پہنچانے کے لئے یہ باتیں نہیں دُہرا رہا، بلکہ اپنی کمینگی کا ذکر کر کے تم سے معافی کا طلب گار ہوں اور ہاں مجھے اس رات کا بھی ذکر کرنا چاہیئے۔ جب ہمیں روٹھے ہوئے ایک مہینہ ہو گیا تھا۔ بات چیت بالکل بند تھی۔ مجھے معلوم ہے وہ وقت میرا بھی مشکل سے گزرتا تھا اور تمہارا بھی۔ کیونکہ اس سے پیشتر ہم کبھی اتنے عرصے کے لئے نہیں روٹھے تھے۔ ہم دونوں صلح کرنا چاہتے تھے مگر پہل کون کرے؟ یہی ضد تھی۔ میں تو خیر مرد تھا۔ اس لئے جھکنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ بالآخر تم آمادہ نظر آئیں۔ مجھے یاد ہے تم نے اس رات بیڈ روم کو خوب سجایا تھا۔ بڑے خوشنما پھول لگائے تھے۔ خوشبوؤں سے کمرہ معطر ہو رہا تھا اور سوتے وقت تم نے سفید جھالروں والی خوبصورت نائٹی پہنی تھی۔ جس میں تمہارا سڈول جسم قیامت ڈھا رہا تھا اور تمہارا چہرہ چاند کی مانند چمک رہا تھا۔ میری جگہ کوئی بھی

مرد ہوتا، اس وقت اس کا سارا غرور اور تکبر خاک میں مل جاتا، تم نے یہ روپ اس لئے دھارا تھا کہ تم صلح پر آمادہ تھیں، جب تم نے ترچھی نظروں سے مسکرا کر مجھے دیکھا مجھے یوں لگا جیسے تم کہہ رہی ہو۔ میرے حسن میں اتنی طاقت ہے کہ آج رات تمہیں جھکنا پڑے گا۔" میں ایک دم پریشان ہو گیا اور برا سا منہ بنا کر بولا۔

"یہ ایکٹرسوں والے کپڑے پہن کر آ گئی ہو۔ اتنا ہی جوبن دکھانا مقصود ہے۔ تو فلموں میں چلی جاؤ۔"

"اُف، میں نے تمہارے پندار کو کس قدر ٹھیس پہنچائی تھی، مجھے معلوم ہے تم نے رو رو کر اپنی نائٹی جو میں نے خود تمہیں لا کر دی تھی تار تار کر دی تھی اور تم خفا ہو کر ڈرائنگ روم میں ہی سو گئی تھیں۔ مگر میں رات کو کئی بار اٹھا، تمہیں سوتے میں دیکھا کئی بار جگانے کو دل چاہا۔۔۔ مگر۔۔۔ مگر، تب جگا دیتا تو زندگی میں یہ نوبت کیوں آتی۔۔۔۔"

"بس کرو جمال، بس کرو، مجھے کچھ اور یاد مت کراؤ، کچھ بھی یاد مت دلاؤ۔" فری رو رو کر بے حال ہو گئی۔ "مجھے سب کچھ بھول جانے دو، بھول جانے دو اور تلخ حقائق کو تلخ ہی رہنے دو تاکہ ہم اپنے آپ کو خوش بخت سمجھ کر زندگی گزار لیں۔"

"نہیں فری، تم ایک ہی بار ان باتوں کو یاد کر کے رو لو اور میں ایک ہی بار اپنے گناہوں کا اعتراف کر لوں، پھر ہم سب کچھ نئے سرے سے شروع کریں گے۔ تم مجھے موقع دو۔ صرف ایک موقع۔ میں ان سب کی تلافی کروں گا اور تمہارے ساتھ اتنی محبت کروں گا اتنی محبت کروں گا کہ دنیا میں مثال بن جائے گی۔"

"اب یہ کسی طرح ممکن نہیں ہے جمال، مجھے زندہ مت کرو۔ مجھے خوابوں کی دنیا میں مت لاؤ، وہ بڑی تلخ دنیا ہے۔ اور میں اس دنیا کو بار بار نہیں دیکھنا چاہتی۔"

"فری، ہماری مونا کو ہماری ضرورت ہے، آؤ اس کے لئے ایک بار پھر ایک دوسرے کے ہاتھ تھام لیں۔"

"مگر کس طرح؟ تم مذہب اور شریعت کے بھی منکر ہو گئے ہو۔"

"مذہب نے بھی۔۔۔۔ ایک صورت تو رکھی ہے فری۔"

"مجھے وہ صورت کسی قیمت پر بھی قبول نہیں ہے۔"

"نہیں فری، پرانے وقتوں کی تلافیاں کرنے کے لئے ہم کو یہ ایک بڑی قربانی دینی پڑے گی اور پھر اس کو بھول جانا پڑے گا۔"

کئی روز تک جمال متواتر آتا رہا اور فری کو مناتا رہا۔ کئی دنوں تک فری بالکل نہیں مانی۔ پھر جیسے اس نے اپنے ہی۔۔۔ آگے ہار مان لی۔ اس کو جمال سے محبت تھی، جمال کے سوا کسی اور سے شادی کا وہ تصور بھی نہ کر سکتی تھی اور اب جب کہ جمال نے اپنی ذرا ذرا سی زیادتی بیان کر کے اس سے معافی مانگ لی تھی اور اسے بے حد محبت کا یقین دلایا تھا تو پھر وہ اپنے زخمی دل کو کیوں تڑپاتی۔ مگر راستے میں جو بڑی کھائی تھی اس کو کیسے عبور کرتی؟

کسی اور سے شادی کر کے طلاق لینا بہت بڑا مسئلہ تھا۔ بھلا کون ایسا ہوگا؟ پھر ایک دم اسے ڈاکٹر جادو کا خیال آیا، ڈاکٹر جادو اس کا بہترین دوست تھا۔ اسے بھی اس نے جمال کے ساتھ ملاقاتوں کا سب حال من وعن بتا دیا تھا۔ وہ صبح کی ساری رُوداد شام کو ڈاکٹر جادو کو بتا دیتی۔ ڈاکٹر ایک گہری سوچ میں گھر گیا تھا۔ مگر اُس نے اسے صاف لفظوں میں بتا دیا تھا کہ اب جمال سے ملنا۔ یا تعلقات بحال کرنا ناممکن ہے۔ وہ اس سراب کے پیچھے نہ بھاگے۔ وہ جانتا تھا۔ فری جیسی لڑکی کو سمجھانا بے کار ہے۔ اس صورت میں جب کہ وہ بھی شادی کی پیش کش کر چکا ہے۔

اس روز جب فری نے ڈاکٹر جادو سے کہا "کہ میں آپ سے شادی کرنے کو تیار ہوں" تو ڈاکٹر حیرت زدہ سا اس کو دیکھتا رہ گیا۔ ایک طرف جمال سے التفات، دوسری طرف ڈاکٹر سے شادی؟

"مگر ایک شرط پر" فری نے نظریں جھکاتے ہوئے کہا۔

"کون سی شرط پر؟"

"آپ ایک ہفتے میں مجھے طلاق دے دیں گے"

"یہ شادی ہوئی یا طلاق؟"

فری کا مافی الضمیر کیا ہے، ڈاکٹر سمجھ گیا۔

"جو بھی آپ سمجھ لیں"

ڈاکٹر ایک اور سوچ میں پڑ گیا۔ جو راستہ فری نے اختیار کیا تھا، وہ بڑا کٹھن تھا، وہ فری کو کیسے بتائے۔ فری پھر طنز سے بولی۔

"آپ تو ڈاکٹر ہیں، اور ہر قیمت پر مریض کا علاج کرنا چاہتے ہیں۔ اس شادی اور طلاق کو بھی علاج کا ایک حصہ جانیئے، اگر آپ کے کسی مفاد کو نقصان نہیں پہنچتا تو کسی کا بھلا کر ڈالیئے"

"میں سوچ کر بتاؤں گا" ڈاکٹر بولا۔

اس میں سوچنے کی کوئی بات نہیں ہے ڈاکٹر صاحب، میں آپ کو بہت مخلص اور عظیم انسان سمجھتی ہوں۔ آپ نے پچھلے سارے عرصے میں جس جس طرح میری دستگیری کی ہے۔ اس کے لئے زبان سے تو میں کبھی شکریہ نہ ادا کر سکوں گی، ہاں مرتے دم تک شکر گزار رہوں گی۔ ایک اور آخری احسان اگر آپ مجھ پر کر دیں تو میں سمجھوں گی میری زندگی آپ کو میرے لئے عزیز ہے اپنے لئے نہیں"

"فری، اگر اس وقت میں صرف تمہارا معالج ہوتا تو تمہیں بہت سی نصیحتیں کرتا کہ جس راہ پر تم اب چل نکلی ہو۔ وہ پہلے سے بھی پُر پیچ اور کٹھن ہے۔ یہ نظام قدرت انسان کے اپنے اختیار میں نہیں ہے اور قسمت کو بار بار چیلنج بھی نہیں کرتے۔ مگر تم سے کچھ نہیں کہہ سکتا۔ تم پھر ایک غلط راہ منتخب کر رہی ہو، تم خود اپنی اس جلد بازی پر پچھتاؤ گی۔ پھر خدا جانے وہ پچھتاوے کیا رنگ اختیار کریں۔ شادی اور طلاق بچوں کا کھیل نہیں ہے۔ زندگی کے ساتھ یہ مذاق نہ کرو۔

"بس مجھے تو یہ بتایئے، آپ میری خاطر یہ قربانی دے سکتے ہیں یا نہیں" فری نے عزم سے کہا۔

"میں تمہاری آزمائش میں پورا اتروں گا۔ تمہارے ساتھ شادی کروں گا۔ اور ایک ہفتے بعد تمہیں طلاق دے دوں گا لیکن فری یہ کہنے سے باز نہیں آؤں گا کہ یہ تمہارے لئے بھی ایک بہت بڑا امتحان ہوگا۔ میں تو اس پر پورا اتروں گا۔ مگر تم جو زیادتی کر رہی ہو، خود اس کو برداشت نہ کر پاؤ گی۔ تم بہت حساس لڑکی ہو اور تمہیں تم سے زیادہ میں جانتا ہوں"

"آپ کوئی قدغن نہ لگایئے اور میری بات سنئے" فری پر تو ایک ہی دُھن سوار تھی۔

"چلو مان گئے۔"

"ایک شرط اور ہے۔" فری نے شرماتے ہوئے کہا۔

"وہ بھی کہو۔"

"پورا ایک ہفتہ آپ میرے جسم کو ہاتھ نہیں لگائیں گے۔"

"شریعت کی رُو سے یہ شادی غلط ہوگی۔" ڈاکٹر نے کہا۔

"ڈاکٹر صاحب! میں تو آپ کی انسانیت سے التجا کر رہی ہوں۔"

ڈاکٹر تھوڑی دیر چپ کھڑا رہا اور پھر ہنس کر بولا۔

"مان گئے یہ بھی۔"

"وعدہ کریں۔"

"وعدہ!"

فری نے ہاتھ آگے بڑھایا تو ڈاکٹر نے خوش دلی سے اس کا ہاتھ تھام کر دبا دیا۔ "یہ ایک مرد کا وعدہ ہے فرو! یاد رکھنا۔"

بیگم شفیق نے ڈاکٹر جاوید پر ہر طرح کا دباؤ ڈالا کہ شادی کے بعد فری کو طلاق نہ دے۔ فری خود ہی کچھ دنوں بعد ٹھیک ہو جائے گی۔ اب جمال کے پاس جانا اس کے لئے اچھا نہ ہوگا۔ مگر ڈاکٹر جاوید فری کی ضد کے آگے کوئی فیصلہ نہ کر سکا۔ بیگم شفیق کا دباؤ بھی کسی کام نہ آیا۔

شادی بڑی سادگی سے ہوگئی۔ فری ایک سادہ سی دلہن بن کر ڈاکٹر کے ہاں چلی گئی۔ نہ ڈھول بجا نہ شہنائی۔ وہاں کوئی حجلۂ عروسی بھی نہ تھا۔ نہ ڈاکٹر تحفۂ محبت لئے شبِ عروسی کا منتظر تھا۔ فری اور ڈاکٹر نے ساتھ کھانا کھایا۔ پھر تھوڑی دیر تک گپ شپ لگاتے رہے، پھر ڈاکٹر خدا حافظ کہنے کے لئے اٹھا۔ جانے سے پہلے اس نے فری کی میز پر دو نیند کی گولیاں رکھیں اور بولا اگر نیند نہ آئے تو انہیں کھا لینا۔

ڈاکٹر خدا حافظ کہہ کر چلا گیا اور فری بستر پر لیٹ کر خیالوں میں کھو گئی۔ کبھی ڈاکٹر اسے شیطان نظر آتا کبھی فرشتہ۔ کبھی وہ سوچتی نیند کی گولیاں اس کے پاس اس لئے رکھ گیا تاکہ وہ گہری نیند سو جائے اور اسے لوٹنے میں آسانی ہو۔ اس نے بار بار کھڑکیوں اور دروازوں کی کنڈیاں چڑھائیں۔ واقعی یہ کتنی عجیب رات تھی۔ وہ بہت خوفزدہ ہو رہی تھی۔ اسے نئے اور پرانے خیالات ستانے لگے۔ نیند کوسوں دور بھاگ گئی تھی۔ ڈاکٹر نے عقلمندی کی جو گولیاں چھوڑ گیا مگر وہ وہم کے مارے نہیں کھا رہی تھی۔ سوڈرتے وہم کرتے، خیالات سے لڑتے رات گزر گئی۔ مؤذن کی آذان کے ساتھ ہی وہ سو گئی اور دس بجے تک سوتی رہی۔

ایک ہفتہ تو پلک جھپکتے میں گزر گیا۔ اگلا دن طلاق کے لئے مقرر ہوا۔ فری نے جمال کو فون

کر دیا تھا کہ آکر اسے لے جائے۔

ڈاکٹر جادو رات سے خاصا پریشان تھا، یوں جیتی ہوئی بازی ہارنے کو کس کا دل چاہتا ہے پورا ایک ہفتہ وہ دونوں ایک گھر میں میاں بیوی ہونے کے باوجود اجنبیوں کی مانند رہے تھے مگر آج اس گھر میں ان کی یہ آخری رات تھی۔ اگلی صبح ان کو ہمیشہ کے لئے جدا کرنے والی تھی۔ وہ دو چار بار یونہی فری کے بیڈ روم میں گیا۔ جی چاہتا اس ضدی لڑکی کو پکڑ کر دو چار طمانچے لگائے۔ اور اس کے بعد اپنے کلیجے میں چھپا لے۔ فری نے بھی پوچھا کہ "کیا کوئی خاص بات ہے"۔ مگر اس نے کوئی تسلی بخش جواب نہیں دیا۔

تڑپتے، مچلتے، وسوسوں کے جال بنتے وہ آخری رات بھی گزر گئی۔ آج ڈاکٹر جادو بھی دیر سے اٹھا ناشتے کی میز پر پہنچا۔ فری ابھی تک نہیں آئی تھی اور صبح کے نو بج رہے تھے۔ اس نے بے دلی سے ناشتہ کیا۔ جب وہ میز سے اٹھا تو کال بیل بج اٹھی۔ باہر گیا تو دیکھا جمال کھڑا تھا۔ ڈاکٹر جادو کی طبیعت اور بد مزا ہو گئی۔ اسے یکایک اپنی شکست کا احساس ہونے لگا۔ اس کا دل چاہا وہ دھکے دے کر اس چالباز انسان کو گھر سے نکال دے۔ مگر پھر ایک شکست خوردہ شہنشاہ کو بھی ایک فاتح شہنشاہ کے ساتھ اچھا سلوک کرنا چاہیئے۔ ڈاکٹر نے مسکرا کر اس سے مصافحہ کیا اور اُسے لاکر ڈرائنگ رُوم میں بٹھایا۔ کاغذات پر دستخط ہونا باقی تھے۔ وہ فری کو جگانے اس کے بیڈ روم کی طرف گیا۔

"فری"۔ اس نے باہر سے دو تین آوازیں دیں۔ وہ نہیں بولی تو اس نے دروازے کو تھوڑا سا دھکا دیا۔ دروازہ کھل گیا۔ کھنکار کر وہ اندر داخل ہوا۔ فری ابھی تک بستر میں سوئی پڑی تھی اور یوں سوئی پڑی تھی جیسے ایک مُدت کی نیند پوری کر رہی ہو۔ ڈاکٹر نے اُسے دو تین آوازیں دیں پھر ایک انجانے سے خطرے کا احساس ہوا۔ دوڑ کر آگے گیا۔ اس کو ہلایا جلایا، اس کی نبض پر ہاتھ رکھا اس کے پہلو سے نیند کی گولیوں کی خالی شیشی لڑھک کر ڈاکٹر کے ہاتھ میں آ گئی۔

تکیے کے پاس ایک نیلا پرچہ پڑا تھا۔ ڈاکٹر نے گھبرا کر اسے اٹھایا، لکھا تھا۔

"ڈاکٹر جادو ایک مخلص اور عظیم انسان ہے۔ میں نے اُس سے بہت بڑی قربانی طلب کی، واقعی میں اس کی متحمل نہ ہو سکتی تھی۔ ہر رات میں اپنی یہ شکست تسلیم

کرتی اور ہر صبح ایک نیا عزم کرتی رہی۔ میرا ذہن ڈاکٹر کے خلوص اور محبت کا اسیر ہو چکا تھا۔ وہ باہر سے جتنا خوبصورت ہے۔ اندر سے بھی اتنا ہی پیارا ہے کیا ایسے انسان کو بہت قریب سے دیکھ کر اس سے دور رہا جائے گا۔ جمال میں نے تم سے والہانہ محبت کی اور اب بھی کرتی ہوں۔

میرا جسم تمہارے سوا کسی کو قبول نہیں کر سکتا مگر میرے ذہن پر کسی اور عظیم انسان کی حکمرانی ہو! میں تمہیں یہ دھوکا نہیں دے سکتی۔

اور پھر میں خود غرض بھی ہوں، چاہتی ہوں تم دونوں ہمیشہ مجھے چاہتے رہو۔ مجھے یاد رکھو۔ تم دونوں کون ہو اور مجھ پر مسلط کیوں ہو، جب سمجھ نہ آئی تو میں نے یہ راہ نکالی۔ تم دونوں مجھے معاف کر دینا۔

ڈاکٹر جادو، تم میری تصویر اپنے دفتر کی میز پر ہمیشہ رکھنا اور جمال، تم اپنی تمام تر چاہت میری مونا کو دینا۔

"فری"